جدوجہد پاکستان

صادق حسین طارق

جدوجہد پاکستان

صادق حسین طارق

بک سینٹر 32 حیدر روڈ راولپنڈی، پاکستان

نام کتاب: جدوجہد پاکستان
نام مصنف: صادق حسین طارق
نام پبلشر: سجاد الحق قریشی

انتساب!

عزیزان وطن کے نام......

...... جن کا نصب العین خدمت وطن ہے

...... جو مخلص اور جدوجہد کے پیکر ہیں

...... جو توقیر وطن کے لئے ہر وقت کوشاں ہیں

...... جو ذاتی مفادات کو ملکی مفادات پر قربان کرنے کا جذبہ رکھتے ہیں

صادق حسین طارق

فہرست مضامین

ابتدائیہ

ہم لائے ہیں طوفان سے کشتی نکال کے

پاکستان کا قیام دنیا کی تاریخ کا حیرت انگیز واقعہ ہے جو انسانی جدوجہد' ہمت واستقلال اور قربانیوں کا عظیم شاہکار ہے۔ قوموں کی زندگی میں بعض اوقات ایسے موقع بھی آتے ہیں کہ جب انہیں زندگی یا موت میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا پڑتا ہے اور جو قومیں زندگی کا انتخاب کرتی ہیں تو انہیں بہت بڑی قربانیاں پیش کرنی پڑتی ہیں اور جس قدر کوئی قوم قربانی پیش کرتی ہے اتنی وہ زیادہ سرخرو اور کامران ہوتی ہے۔

کٹیں جو چند ٹہنیاں تو نمو ہو نخلِ تاک کی
کٹیں جو چند گردنیں تو قوم کی ہو زندگی

یہ نازک وقت ان کے جذبہ عمل اور سیاسی بیداری کا بڑا سخت امتحان ہوتا ہے یا تو وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مٹ جاتی ہے یا ارفع واعلیٰ زندگی پالیتی ہے۔ ہم پہ ایک بڑا نازک وقت آیا۔ انگریز اور ہندو اپنے دیگر گماشتوں جمیعتہ العلمائے ہند' احرار' یونینسٹوں اور دیگر لوگوں کو ساتھ ملا کر ہمارے جسد قومی یعنی مسلم قومیت کو مٹا دینا چاہتے تھے۔ اسی نازک وقت میں قائد اعظمؒ نے قوم کو للکار کر کہا تھا "پاکستان حاصل کرو یا تباہ ہو جاؤ" پھر قوم نے ایک بہت بڑا فیصلہ کیا۔ یعنی اپنے جسد قومی کو بچانے کا فیصلہ۔ اور اس مقصد کے حصول کے لئے اپنا تن من دھن سب کچھ قربان کرنے کی ٹھانی۔ پھر کیا تھا طلباء نے تعلیم کو خیرباد کہا' ملازمین نے ملازمتوں کو چھوڑا' تاجروں نے دکانیں بڑھائیں' صوفیاء نے خانقاہوں کو چھوڑا' علمائے حق نے مسجدوں کو سیاست

کا گڑھ بنا دیا۔ سب مل گئے متحد ہو گئے ظلم کے خلاف' جبرو استبداد کے خلاف' اپنے خلاف پھیلائے ہوئے جال کے خلاف' انگریزوں' ہندوؤں اور ان کے حواریوں کے خلاف۔ انہوں نے مخالفتوں کا سر کچلا' ہواؤں کا رخ بدلا' طوفانوں کے بھنور چاک کئے آندھی بن کر چلے۔ اہل بصیرت نے اپنی کشتیاں جلا دیں اور فدایان ملت نے اپنے آشیانوں پر تجلیاں گرا دیں۔ ان عظیم انسانوں کا حال شاعر کی زبانی کچھ ایسا تھا

متاع ہوش وخرد' کائنات قلب ونظر
دیار شوق میں سب کچھ لٹا کے بیٹھے ہیں

یہ ملت اسلامیہ بڑی مخلص' وفادار' دین کی شیدائی اور دین کے لئے ہر قسم کی قربانی دینے کو تیار رہتی ہے۔ اگر اس ملت کو کوئی مخلص قائد مل جائے تو سب دنیا کو تسخیر کر سکتی ہے۔ آج مسلمانان ہند کو ایک مخلص قائد مل گیا تھا جس نے قوم کو قربانی کے لئے للکارا تھا۔ قوم نے اس کی پکار پہ لبیک کہا اور سر پر کفن باندھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ یہ مقام کیوں اور کس طرح آیا؟ ہم جانتے ہیں کہ مسلمان دیار ہند میں فاتح کی حیثیت سے آئے اپنی رواداری اور حسن سلوک سے انہوں نے تقریباً" ایک ہزار سال تک ہندوستان پر حکومت کی۔ انہوں نے عیسائیوں' یہودیوں یا ہندوؤں کی طرح کسی پر دین ومذہب بدلنے کی سختی نہ کی۔ لیکن اس کے باوجود لوگ مسلمان ہوتے گئے اور قائداعظمؒ کے الفاظ میں پاکستان کی بنیاد رکھتے گئے۔ آب وہوا کی گرمی' دولت وثروت کی فراوانی' مذہبی سستی و کاہلی اور عیش وعشرت کی بنا پر ان پر زوال آنے لگا۔ انگریز جو تاجر کی حیثیت سے ہندوستان آیا تھا اس نے ہندو کو اپنے ساتھ ملالیا اور مسلمانوں کے زوال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے رفتہ رفتہ ہندوستان پر قابض ہونے لگا۔ کبھی تجارتی کوٹھیوں کی صورت میں تو کبھی سب سڈی ایری سسٹم کے ذریعے۔ کبھی اصلاحات کے نام پر کبھی دھوکہ اور فریب کے ذریعے۔ یہاں تک کہ 1857ء میں بہادر شاہ ظفر کے قتل کے بعد وہ تخت دلی پر قابض ہو گیا۔ اس نے مسلمانوں پر وہ ظلم وستم ڈھائے کہ ان کے سامنے چنگیز خان کی چنگیزیت' فرعون کی فرعونیت' زار روس کی قہرمانی' کرامویل کی جبریت' اور میری کی خون آشامی سب ماند پڑ گئیں۔ لیکن مسلمان اس جبرو استبداد کو برداشت کرتے رہے۔ وہ اس سبق سے آگاہ ہیں کہ

ظلم ایک نہ ایک دن ضرور مٹ جائے گا۔ اور وہ جہاد زندگانی میں اپنی تقدیر بناتے رہے۔ اس زمانہ میں مسلمانوں کو ایک قائد سر سید کی صورت میں ملا اس نے انگریزوں کے مقابلے کے لئے مسلمانوں کو انہی کے ہتھیاروں سے لیس کرنا شروع کر دیا۔ وہ یہ بات جان گئے کہ انگریز اب ہندوستان سے جلدی نکلنے والے نہیں ضروری ہے کہ مسلمان تعلیمی' معاشی اور معاشرتی طور پر بہتر مقام حاصل کریں۔ یہ صرف انگریزی تعلیم کے حصول کے بعد ہی ممکن ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اس نے مسلمانان ہند کو علی گڑھ یونیورسٹی کا تحفہ دیا اور اسی یونیورسٹی کے طلباء بعد میں تحریک پاکستان کے ہراول دستہ بنے۔ سر سید نے پاکستان کی خشت اول 1883ء میں یہ کہہ کر رکھ دی کہ ہندوستان میں برطانیہ کی طرح کا طریق انتخاب کامیاب نہیں ہو سکتا۔ بلکہ یہاں پر مسلمانوں اور ہندوؤں کو یہ حق دیا جائے کہ وہ اپنی اپنی قوم کے لئے اپنے نمائندے چنیں۔ یوں جداگانہ انتخابات کا نظریہ ہماری سیاسی جدوجہد کا مستقل باب بن گیا۔

1885ء میں ایک انگریز لارڈ ہیوم نے ایک سیاسی جماعت آل انڈیا نیشنل کانگریس کی بنیاد رکھی۔ ہندو' مسلم' سکھ' عیسائی اور دیگر سب اس کے ممبر بن گئے اور مسلم قائدین بھی اس میں شریک ہو گئے تاکہ مسلمانوں کے حقوق کی نگہداشت کر سکیں۔ 1905ء میں لارڈ کرزن نے انتظامی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے بنگال کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ اس وقت اس کی آبادی ساڑھے سات کروڑ تھی۔ اس ایک صوبے میں آسام' بنگال' اڑیسہ' پٹنہ اور بہار کے علاقے شامل تھے۔ لیکن یہ تقسیم کچھ ایسے وجود میں آئی کہ مسلمانوں کی اکثریت کا صوبہ وجود میں آ گیا۔ ہندو قائدین اور ہندو پریس نے اس کے خلاف بہت بڑا طوفان سر پہ اٹھایا تو انگریز نے ہندوؤں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے تقسیم بنگال کو منسوخ کر دیا۔ تقسیم تو منسوخ ہو گئی لیکن ہندوؤں نے اپنے عمل سے واضح کر دیا کہ ہندوستان میں ایک قوم نہیں ہے اور کانگریس تمام ہندوستانیوں کی نمائندہ جماعت نہیں ہے۔ اس لئے مسلم قائدین نے 1906ء میں ڈھاکہ میں آل انڈیا مسلم لیگ کی بنیاد رکھی۔ مسلمان کو مسلمان کر دیا ہندو چیرہ دستی نے۔ یہ مسلمانوں کا الگ پلیٹ فارم تھا جس میں رفتہ رفتہ مسلمان قائدین شامل ہونے لگے۔

یہ امر مسلمہ تھا کہ انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنے کے لئے ہندو مسلم مشترکہ جدوجہد کی ضرورت تھی۔ لیکن ہندو اپنی اکثریت کے نشے میں مسلمانوں کو ان کے حقوق دینے کو تیار

نہ تھا۔ جب تک کانگرس پر اعتدال پسند راہنما چھائے رہے تو انہوں نے نہ صرف مسلم رہنماؤں کے ساتھ معقول رویہ اختیار کئے رکھا بلکہ قائداعظمؒ کی خواہش پر دونوں کے اجلاس بھی ایک جگہ ہونے لگے اور دونوں جماعتوں کے رہنما باہمی صلاح مشورے میں شریک ہونے لگے۔ یہ اعتدال پسندی کا نتیجہ تھا کہ معاہدہ لکھنؤ وجود میں آیا۔ جس میں ہندوؤں نے مسلمانوں کو مرکز میں 1/3 حصہ نمائندگی دینے اور مسلم لیگ کو مسلمانوں کی نمائندہ جماعت تسلیم کر لیا۔ مسلمانوں نے اس اتحاد کو قائم رکھنے کے لئے بڑی محنت و کاوش کی۔ یہاں تک کہ ہندوؤں کو اپنی مسجدوں میں بھی آنے کی اجازت دے دی اور گاندھی جیسے کٹر ہندو کو علی برادران کندھوں پہ اٹھا کے مسجد میں لے آئے۔ خلافت تحریک کے دوران جب گاندھی جی کی سیاسی دکان چمک اٹھی تو اس متعصب ہندو نے مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں کی فوجی تنظیم شروع کر دی۔ شدھی اور سنگھٹن کی تحریکیں بنیادی طور پر مسلمانوں کا برصغیر سے صفایا کرنے کے لئے بنائی گئی تھیں۔ ان تنظیموں کے تربیت یافتہ لوگوں نے مسلمانوں کا بے دریغ قتل عام کیا۔ ہندو لیڈر خاموش رہے لیکن جب موپلوں نے ہندوؤں کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اور ان کو چھٹی کا دودھ یاد کرایا تو مہاتما جی کو تکلیف ہوئی اور انہوں نے تحریک کے خاتمے کا اعلان کر دیا۔ یہاں یہ چیز واضح کر دی جائے کہ وقتاً فوقتاً مسلمانوں کی قتل و غارت گری ہوتی رہی لیکن کسی مولوی نے، کسی احراری نے، کسی انگریزی گماشتے نے کبھی آواز بلند نہ کی۔ یہاں تک کہ 1937ء میں جب کانگریسی وزارتیں قائم ہوئیں اور جو مسلمان ان میں شامل تھے وہ بھی مسلمانوں کے قتل عام کو نہ رکوا سکے۔ بلکہ بھیگی بلی بنے دفتروں میں بیٹھے رہے۔ یاد رہے یہ دور مولانا ابوالکلام آزاد کی کانگریس صدارت کا دور تھا۔ مسلمانوں کے اس قتل پر اگر کوئی آواز بلند کرتی رہی تو وہ مسلم لیگ تھی۔

بہرحال جب تحریک خلافت کا خاتمہ ہوا۔ اور گاندھی مسلمانوں کو ہجرت کے ذریعے وطن سے نکالنے میں کامیاب نہ ہوا۔ تو اس نے ہندو تعصب کو ہوا دینا شروع کی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان حائل خلیج اور وسیع ہونے لگی۔ یہاں تک کہ 1929ء میں جو نہرو رپورٹ پیش کی گئی وہ ہندو تعصب کی منہ بولتی تصویر تھی۔ یہی رپورٹ ہے جس نے مسلمانوں اور ہندوؤں کو دو راہوں پر ڈال دیا۔ مولانا محمد علی جوہر نے اس رپورٹ پہ تبصرہ

کرتے ہوئے کہا تھا کہ "اب ہندوؤں کے ساتھ ہمارا مل کر چلنا محال ہے۔" اس کے جواب میں قائد اعظمؒ نے ہندو مسلم اتحاد کی آخری کوشش کے طور پر اپنے چودہ نکات پیش کئے لیکن ہندوؤں نے اپنی اکثریت کی بنا پر ان کو نہ مانا۔ جب ہندوؤں نے ان نکات کو تسلیم نہ کیا تو قدرتی طور پر مسلمانوں کے لئے علیحدگی کے سوا اور کوئی راستہ نہ رہا۔ یہی وہ دور ہے کہ جب مسلمانوں نے حقیقی طور پر علیحدگی کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ اس علیحدگی کی سوچ کا سب سے پہلا باقاعدہ اظہار حضرت علامہ اقبالؒ نے مسلم لیگ کے سالانہ الہ آباد کے اجلاس میں 1930ء میں کیا۔ انہوں نے اپنے خطبہ صدارت میں مسلمانوں کے لئے ایک الگ وطن کا مطالبہ کیا۔ اسی خطبہ کی روشنی میں اس علیحدہ وطن کے لئے برطانیہ میں زیر تعلیم ایک طالب علم رحمت علی نے پاکستان کا نام تجویز کیا جس پر بڑی لے دے ہوئی۔ ہندو پریس نے اسے طعنہ کے طور پر استعمال کیا۔ قدرت کا کام بھی بڑا عجیب ہوتا ہے کہ یہی طعنہ مسلمانان ہند کا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سیاسی مقدر بن گیا۔ مسلمانوں کے انتشار وافتراق' باہمی چپقلش اور غلط رویوں سے مایوس ہو کر قائد اعظمؒ لندن چلے گئے۔ اور وہاں پریکٹس کرنے کی ٹھانی۔ لیکن اقبالؒ کی دور رس نگاہوں نے آپ کو بھانپ لیا اور آپ کو لکھا:۔

"آج ہندوستان میں آپ واحد مسلمان ہیں جو آنے والے سیاسی طوفان میں قوم کی صحیح راہنمائی کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔"

پھر اپنی قوم کے جذبہ ایثار و قربانی پر یقین رکھتے ہوئے انہوں نے آپ کا یوں حوصلہ بڑھایا:۔

مایوس نہ ہو ان سے اے رہبر فرزانہ
کم کوش تو ہیں لیکن بے ذوق نہیں راہی

اقبالؒ اور قائد اعظمؒ کے درمیان خط وکتابت ان دونوں راہنماؤں کی ذہنی ہم آہنگی اور ان کے قلب کے سوز وگداز کی آئینہ دار ہے۔ اقبالؒ چونکہ فلسفی ہیں اس لئے ان کا ہر لفظ دل کی بے تابی کا مظہر ہے۔ اس لئے وہ بار بار قائد اعظمؒ سے پوچھتے ہیں "کیا ابھی تک وہ وقت نہیں آیا کہ ہم مسلمانوں کے لئے ایک الگ مملکت کا مطالبہ کریں؟" جب کہ قائد اعظمؒ جو

اعلیٰ پائے کے مدبر اور سیاس تھے وہ ہندوستان کے ممتاز ترین وکیل، عظیم قائد اور عملی انسان تھے اس لئے وہ کوئی کام مکمل منصوبہ بندی کے بغیر کرنا نہیں چاہتے تھے وہ ہندوؤں، مسلمانوں اور انگریزوں کی مکمل تاریخ، ان کی روایات واقدار، جرات و حوصلہ، ان کی خوبیوں اور کمزوریوں بلکہ ان کی صحیح نشست و برخاست، ان کے دلی نظریات وافکار سے پوری طرح آگاہ تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ کانگریس کی سیاسی چالوں اور مکاریوں اور برطانوی میکیاولین حکمت عملی کو ان سے بہتر کوئی نہیں جانتا تھا۔ ان کی آنکھوں میں ملکوتی چمک تھی جو مد مقابل کو پہلی ہی نظر میں گھائل کر لیتی تھیں۔ ماؤنٹ بیٹن، نہرو، پٹیل، گاندھی، ابوالکلام آزاد، خضر حیات اور بہت سے ہندو، انگریز اور مسلم راہنما مل کر منصوبہ بناتے لیکن جب وہ آپ کے پاس دلائل لاتے تو وہ سب آپ کی استقامت فکر سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتے۔ ماؤنٹ بیٹن کے مطابق "وہ ہمارے دلائل بڑے تحمل اور صبرواستقلال کے ساتھ سنتے ہم یہ سمجھنے لگتے کہ ہمارے دلائل نے ان پر گہرا اثر کیا ہے لیکن جب وہ اپنے مخصوص انداز سے ہم سے سوال کرتے تو ہم سب چوکڑی بھول جاتے۔" ان کی اسی عظمت کو وجے لکشمی سلام پیش کرتے ہوئے کہتی ہے کہ "اگر مسلم لیگ کے پاس دو سو ابوالکلام آزاد اور ایک سو گاندھی ہوتے اور کانگریس کے پاس صرف ایک قائد اعظمؒ ہوتا تو پاکستان کبھی نہ بنتا۔" یہی وجہ ہے کہ یہ قائدین آپ سے بات چیت کرتے ہوئے گھبراتے تھے۔ اسی لئے ہندوؤں اور انگریزوں نے آپ کو ہر وقت دکھ پہنچانے کے لئے مسلمانوں میں آزاد اور خضر جیسے لوگ پال رکھے تھے۔ اس دوران کا ایک واقعہ سن لیجیے جو ہندو ذہنیت کا بہترین آئینہ دار ہے۔

"ایک مرتبہ نہرو نے اقبال سے ملاقات کے دوران شکایت کی کہ مسٹر جناح بہت سخت آدمی ہیں ان سے مذاکرات کرنا سر پھوڑنے کے برابر ہے۔ کیوں نہ ہم دونوں ہندو مسلم مسائل حل کرنے کے لئے آپس میں مذاکرات کریں اور پھر کوئی معاہدہ کر لیں؟ اقبالؒ نے یہ کہہ کر پنڈت نہرو کی امیدوں پر پانی پھیر دیا کہ "مسٹر جناح پوری قوم کے جرنیل ہیں اور میں ان کا ایک سپاہی ہوں۔"

قائد اعظمؒ وہ واحد لیڈر ہیں جنہیں ہندو مسلم اتحاد کا سفیر کہا گیا۔ یہ وہ واحد شخصیت ہے جسے دنیا کی کوئی طاقت ڈرا سکی نہ خرید سکی۔ آپ کی عظمت و کردار کو سب لوگوں نے سلام

پیش کیا۔ اس میں اپنے اور پرائے سبھی شامل ہیں۔

قائداعظمؒ ایک عظیم مدبر، سیاستدان اور دور اندیش انسان تھے انہیں مسلم کاز کے لئے ہر وقت ہر شخص اور ہر موقع سے کام لینا آتا تھا۔ 1937ء میں کانگریسی وزارتوں کے دوران جو مسلمانان ہند پر ظلم توڑے گئے اور مسلمانوں کا خون بہایا گیا آپ نے اس سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ ہندوؤں کے مظالم کی تشہیر کی ان کو عدالتوں میں، اسمبلیوں میں غرضیکہ ہر جگہ ہر مقام پر لوگوں کے سامنے لایا۔ ستمبر 1939ء کو عالمی جنگ میں عدم شمولیت کی بنا پر جب کانگرسیوں نے استعفے دیئے تو آپ نے یوم تشکر منایا۔ یہاں پر قائداعظمؒ نے بہت بڑے سیاسی تدبر کا مظاہرہ کیا۔ اور انگریزوں کو بتایا کہ ہم اس کڑے وقت میں انگریزوں سے بے وفائی نہ کریں گے بلکہ مسلمان جنگ میں حصہ لیں گے۔ اس طرح قائداعظمؒ کو مسلمانوں کو منظم کرنے کا موقع مل گیا۔ نیز انگریزوں کو مجبوراً ہندی مسلمانوں کا احسان مند ہونا پڑا اور بعض مواقع پر انگریز مسلمانوں کو نظرانداز نہ کر سکے۔

تاریخ شاہد ہے کہ جب بھی مسلمانوں پر کڑا وقت آیا تو اس میں غیروں کے ساتھ علمائے سو مل گئے اور ان ملت فروشوں نے مختلف فتوے داغنے شروع کر دیئے۔ یہاں بھی ان ذات شریفوں کانگرسی ملاؤں نے یہی کردار ادا کیا۔ وہ آئے دن قائداعظمؒ، مسلم لیگ اور پاکستان کے خلاف فتوے داغنے لگے۔ تو ان تمام نام نہاد مولویوں کے فتووں کی حقیقت کسی شاعر نے بڑی خوبصورتی سے بیان کی ہے:

دلی کے مولوی کا فتویٰ نہ پوچھ کیا ہے؟
گاندھی کی پالیسی کا عربی ترجمہ ہے

قائداعظمؒ میدان سیاست کے عظیم جرنیل تھے۔ انہیں عوام اور اس کی تنظیم کا بہت بڑا احساس تھا وہ اپنے ساتھ کے چھوٹے قائدین اور ان کی صلاحیتوں سے پوری طرح آگاہ تھے اور ان سے کام لینا جانتے تھے۔ آپ نے 1937ء میں مسلم لیگ کو عوامی جماعت بنا دیا۔ رکنیت فیس صرف دو آنے کر دی تاکہ غریب عوام جن کی بہت بڑی اکثریت تھی وہ بھی اس جدوجہد آزادی میں حصہ لے سکیں۔ آپ نے راجہ صاحب محمود آباد جیسے شخص کے زیر قیادت آل

انڈیا مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن قائم کی اور حاجی عبداللہ ہارون کے زیر قیادت مسلم لیگ نیشنل گارڈ قائم کی جس کا کام جلسے جلوس میں نظم وضبط قائم کرنا تھا۔ اور مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کی قیادت میں جمیعت علمائے اسلام کا قیام عمل میں آیا۔ جن کا کام کانگریسی مولویوں کے فتاویٰ اور غلط بیانیوں کا مذہبی نقطہ نظر سے جواب دینا اور لوگوں کو مذہبی لحاظ سے تحریک پاکستان میں شریک کرنا تھا۔ اس طرح آپ کے پاس پچاس ہزار طلباء کی فوج ظفر موج ہراول دستہ کا کام کر رہی تھی۔ یہ وہ مخلص ترین طلباء تھے جو ہر لمحہ تحریک پاکستان پر مرمٹنے کے لئے تیار تھے۔ نیز لاکھوں نہیں کروڑوں لیگی کارکن تھے۔ جن کی زندگی کا مقصد ہی حصول پاکستان تھا۔ آپ نے اپنی پرجوش اور ولولہ انگیز قیادت سے مسلمانان ہند کے ہر فرد کو حصول مقصد کی خاطر مرمٹنے کو تیار کر لیا تھا۔ جو ہر محاذ پر انگریزوں' ہندوؤں اور ان کے حواریوں کا مقابلہ کرنے کے لئے نظری وفکری ہتھیاروں سے لیس تھے۔

آپ اتحاد کی قوت سے پوری طرح آگاہ تھے۔ آپ نے فرقہ واریت' ذات پات اور صوبائیت کے جذبات وافکار کے بتان یورپی کو پاش پاش کر دیا۔ آپ نے تمام مسلمانوں کو جسد واحد کی طرح ایک قوم بنایا۔ سب قوم آپ کی پشت پر سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن گئی وہ قائد اعظمؒ کے اشارے پر مرمٹنے کو تیار تھی۔ اسی بنا پر نواب بہادر یار جنگ نے ایک مرتبہ اپنی تقریر میں کہا تھا "قائد اعظمؒ اسلامیان ہند کے لیے اللہ کی رحمت کا پیغام ہیں۔" ہر عظیم تحریک اور ہر عظیم قائد کی طرح آپ کی اور تحریک پاکستان کی زبردست مخالفت کی گئی۔ کانگریس نے مکر و فریب اور جھوٹے پروپیگنڈے پر کروڑوں روپے پانی کی طرح بہائے لیکن قائد اعظمؒ کی سچی سیاست' مخلصانہ کاوش نے ہر پروپیگنڈے کا خاتمہ کر دیا۔ انگریزوں اور ہندوؤں کا یہ پروپیگنڈہ تھا کہ قائد اعظمؒ مسلمانوں کے قائد نہیں اور نہ مسلم لیگ مسلمانوں کی نمائندگی کرتی ہے۔ مسلمان پاکستان نہیں چاہتے بلکہ یہ ان کی ذاتی اختراع ہے۔ آپ نے انگریزوں اور کانگرس دونوں کو چیلنج کیا کہ وہ اس سوال پر عوام کی رائے معلوم کر لیں۔ ان کو یہ مطالبہ ماننا پڑا۔ اور 1946ء کے انتخابات ہوئے۔ یہ انتخابات مسلمانوں کے لئے زندگی اور موت کا سوال بن گئے یہ ایسے انتخابات تھے کہ جن میں مسلمانوں کا جوش وخروش انتہا درجہ کا تھا۔ ہمالیہ کی بلند چوٹیوں سے لے کر راس کماری تک اور لنڈی کوتل سے لے کر چٹاگانگ تک ہر مسلمان کی زبان پر یہ نعرہ

گونج رہا تھا:

لے کے رہیں گے پاکستان ۔ بٹ کے رہے گا ہندوستان

یہ انتخابات کیا تھے قدرت کا ایک معجزہ تھے مسلمانوں کی عظمت اور جوش و خروش کا شاہکار تھے دیکھنے والوں نے دیکھا کہ اندھے دیکھ رہے ہیں' لنگڑے چل رہے ہیں' گونگے بول رہے ہیں' برقع پوش خواتین' ضعیف و نزار بوڑھے جوانوں کے ساتھ جوق در جوق پاکستان کے حق میں ووٹ ڈالنے جا رہے ہیں۔ ایک گھر میں ایک بوڑھا باپ عالم نزع میں تھا اس نے اپنے بیٹوں سے کہا "مجھے اسی چارپائی پر ہی پولنگ سٹیشن لے چلو میں مرنے سے پہلے پاکستان کے حق میں ووٹ دینا چاہتا ہوں اگر وہاں مر گیا تو اسی چارپائی پر مجھے قبرستان لے جانا۔" چنانچہ اس شخص کو پولنگ سٹیشن لے جایا گیا اس نے پوری قوتیں جمع کر کے مہر لگائی اور پاکستان کے حق میں ووٹ دینے کے بعد اپنی جان جان آفرین کے سپرد کر دی۔ ان انتخابات نے کانگریس اور مولانا ابو الکلام آزاد کے مکر و فریب کا پردہ چاک کر دیا حق آگیا اور باطل چھپ گیا۔ یوں ثابت ہو گیا کہ مسلمانوں کی نمائندہ جماعت مسلم لیگ ہے جو پاکستان چاہتی ہے۔ کانگرس اتنی بڑی شکست کو اتنے بڑے مکر و فریب کے چاک ہونے کو کس طرح خوش دلی سے برداشت کرتی۔ اس نے ہندوستان کے طول و عرض میں ہندو مسلم فسادات پھیلا دیئے گاندھی کے چیلوں نے جو اپنے آپ کو عدم تشدد اور آہنسا کا پجاری کہتا تھا مسلمانوں پر وہ ظلم توڑے اور بزدل دشمن نے اتنی بہیمیت کا مظاہرہ کیا کہ لارڈ ویول جیسا شقی دل انسان کانپ اٹھا اور مسلمانوں کی علیحدگی کے منصوبے کو دل سے تسلیم کرنے لگا۔ لیکن انگریزوں کی کانگرس نوازی سے وہ مجبور تھا۔ نیز جلد ہی اس کو واپس بلا لیا گیا۔ اور اس کی جگہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو وائسرائے بنا کر بھیج دیا گیا۔ اس نے مسلم لیگ کو عبوری حکومت میں شامل کیا۔ صحت' تجارت' مواصلات' تعلیم و خزانہ کی وزارتیں مسلم لیگ کے حصے میں آئیں وزیر خزانہ خان لیاقت علی خان بنے انہوں نے "غریب آدمی کا بجٹ" بنا کر کانگرس کو ننگی کا ناچ نچا دیا۔

3 جون 1947ء کو تقسیم ہند کے منصوبے کا اعلان ہوا۔ قائد اعظمؒ نے بساط سیاست پر چومکھی لڑائی لڑی۔ برطانیہ اور کانگرس کے بہترین دماغوں کو شکست فاش دی اور پاکستان حاصل کیا۔ 14 اگست 1947ء کو دنیا کے نقشے پر پاکستان نامی مملکت خداداد ظاہر ہوئی۔ ہماری امیدوں

اور قربانیوں کا پاکستان۔

آج ہم اللہ تعالیٰ کے رحم و کرم سے اس کی پچاسویں سالگرہ منا رہے ہیں لیکن جب میں اس نصف صدی کی تاریخ کا مطالعہ کرتا ہوں تو اس نتیجہ پر پہنچتا ہوں کہ پاکستان نے تو ہم کو سب کچھ دیا لیکن ہم نے پاکستان کو اس عرصہ میں کچھ نہ دیا؟۔ کاش کہ ہم اسی جذبہ تحریک کے تحت کام کرتے اور پاکستان کو اپنے مفادات کا محور و مصدر نہ بناتے۔ لیکن ہم ایسا کرنے میں کامیاب نہ ہوئے۔ ناامیدی گناہ ہے۔ اب بھی وقت ہے کہ ہم سنبھل جائیں اور ملک عزیز کو عظیم سے عظیم تر بنائیں۔

راولپنڈی
4 اپریل 1999ء

نیاز کیش
صادق حسین طارق
پوسٹ بکس نمبر 1553
جی پی او راولپنڈی

تحریک آزادی کا پس منظر

میں آزادی کی تحریک پر قلم اٹھا رہا ہوں جو نعمت بے بہا ہے۔ یہ قیصرو کسریٰ کے خزینوں میں میسر نہیں آتی ہے۔ یہ ایک دن میں حاصل نہیں ہوتی مدتیں اور زندگیاں صرف ہوتی ہیں۔ شہیدوں کے خون پر اس کی دیواریں کھڑی کی جاتی ہیں۔ مال و دولت ہاتھ سے جاتا ہے۔ عزت و ناموس پر بھی کہیں ہاتھ صاف ہوتے ہیں۔ قوموں کی تاریخ میں یہ خزینہ اپنی نظیر آپ ہے۔ تاریخ کی اصلیت اس تحریک سے روشن ہے جعفر و صادق جیسے لوگ ذقوم کو غلامی کی زنجیریں پہنادیتے ہیں۔ پھر قوم کا بچہ بچہ سر پر کفن باندھے' جاں ہتھیلی پر رکھے دشمن سے بر سر پیکار ہوتا ہے۔ خون کی ندیاں بہہ جاتی ہیں۔ تو پھر قوم عروس آزادی کو ہمکنار کرتی ہے:

ہم مسلمان ہندوستان میں 712ء میں آئے۔ ہم اپنے ساتھ ایک شاندار تہذیب رسم و رواج معاشرت و سیاست لائے۔ ہم یہاں حملہ کرنے آئے نہ کشور کشائی و مال غنیمت کے لالچ پر آئے بلکہ ایک مظلوم کی داد رسی کو یہاں آئے۔ چونکہ یہاں ایک مسلمان عورت نے اپنے ظلم و ستم کی داد رسی کے لئے حجاج بن یوسف حاکم بصرہ کو پکارا تھا تو اس نے اپنے سترہ سالہ داماد محمد بن قاسم کو اس مہم پر بھیجا جس نے یہاں کے راجہ داہر' والی سندھ کو جو کہ فاسق و فاجر تھا شکست دی۔ اور یہاں پر پہلی اسلامی سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ اس کے بعد مسلمانوں میں نظریاتی و سیاسی اختلافات پیدا ہو گئے۔ امیہ خاندان کا خاتمہ اور عباسی خاندان بام عروج پر آیا۔ لیکن اس خاندان نے ہندوستان کی طرف غور نہ کی یہاں پر دو چھوٹی چھوٹی ریاستیں منصورہ اور ملتان قائم ہو گئیں۔ عباسیہ خاندان کے زوال کا زمانہ تھا کہ ادھر مشرقی ریاستیں خود مختار ہو رہی تھیں۔ کہ سلجوقیوں اور ترکوں نے سر اٹھایا۔ ادھر الپتگین نے غزنی میں ایک ریاست قائم کرلی۔ جو کہ بعد

میں سبکتگین کے ہاتھ آئی۔ پنجاب کا راجہ جے پال اس کا زیر نگین تھا۔ اس نے 997ء میں وفات پائی تو اس کا بیٹا محمود غزنوی تخت غزنی پر جلوہ افروز ہوا۔ جے پال بوڑھا آزمودہ کار تھا۔ اس نے محمود کو بچہ جان کر اس پر حملہ کر دیا۔ لیکن منہ کی کھائی اور چتا میں جل کر مر گیا۔ اب اس کے بیٹے انند پال نے محمود پر حملہ کیا لیکن شکست کھائی اور راہ فرار لی۔ اب محمود نے پے در پے سترہ حملے کئے۔ ہر حملے میں ہندوؤں کو شکست فاش دی۔ ہندوؤں کے دلوں پر مسلمانوں کا رعب و دبدبہ بیٹھ گیا۔ لیکن افسوس کہ اس نے اسلامی حکومت قائم نہ کی۔ وہ آندھی کی طرح آتا اور بگولا کی طرح چلا جاتا۔

اس کے بعد شہاب الدین غوری نے ہندوستان پر حملہ کیا۔ پرتھوی راج اور راجہ جے چند' والئی قنوج کو شکست دی اور ہندوستان میں اسلامی ریاست کی بنیاد ڈالی۔ اس کی وفات کے بعد قطب الدین ایبک نے تخت سنبھالا۔ اور خاندان غلامان کی بنیاد ڈالی۔ اس کے یکے بعد دیگرے شمس الدین التمش' رضیہ سلطانہ' ناصر الدین محمود' بلبن تخت دہلی پر بیٹھے۔ اس کے بعد خلجیوں کا زمانہ آیا۔ علاؤ الدین خلجی نے گجرات۔ کاٹھیاواڑ۔ دیوگری کے ہندو راجا کو شکست دی۔ اور سب ہندوستان پر قابض ہو گیا۔ خلجیوں کے بعد تغلق خاندان کا دور دورہ ہوا۔ اسی زمانہ میں حسن گنگو بہمنی نے بہمنی سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ اس کے بعد سادات کے مختصر سے دور کے بعد لودھی خاندان بر سر اقتدار آیا۔ جس کا خاتمہ ظہیر الدین بابر نے 1526ء میں ابراہیم لودھی کو شکست دے کر دیا۔ 1527ء میں راناسانگا جو سنگرام سنگھ کے نام سے مشہور کنواہہ کے مقام پر جنگ ہوئی۔ یاد رہے کہ یہ ایک معمولی آدمی تھا۔ لیکن ہندوؤں نے متحد ہو کر اسکو بابر کے مقابلہ میں لا کھڑا کیا۔ اسے شکست فاش ہوئی اور مارا گیا۔ 1530ء میں بابر کی وفات کے بعد اس کا بیٹا ہمایوں تخت نشین ہوا۔ یہ ایک نااہل قسم کا انسان تھا۔ اس کا سارا زمانہ بھائیوں اور غیروں سے لڑائی میں صرف ہوا۔ یہ ایران کی طرف بھاگ گیا۔ 1540ء میں شیر شاہ سوری جو کہ ایک بہترین منتظم ہوا ہے۔ ہندوستان پر قابض ہوا اور سوری خاندان کی بنیاد ڈالی لیکن جلد ہی سوری خاندان کو زوال آگیا۔ اور شہنشاہ اکبر تخت دہلی پر متمکن ہوا۔ یہ بے چارہ ان پڑھ تھا۔ لیکن انتظامی قابلیت میں یکتا تھا۔ اس نے انتظامی کاروباز کو بہتر بنانے کے لئے ہندوؤں کو بہت سی مراعات دیں۔ یہاں تک کہ اس نے ہندوؤں کی خوشنودی کے لئے ہندو

عورتوں سے شادیاں کیں۔ دین الٰہی جاری کیا۔ ان کی رسومات کو اپنایا۔ تلک لگانا اور درشن دینا شروع کردیا۔ ہندوؤں کو اعلیٰ عہدوں پر مامور کیا۔ لیکن اس کی یہ سب کوششیں ریت کے محل ثابت ہوئیں۔ بعض مورخین نے اکبر کے ان اقدام کو بہت سراہا ہے۔ وہ اس بارے میں اس کی تعریفوں کے پل باندھتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔ اس کا زمانہ 1556ء تا 1605ء ہے۔ یہ ایک عروج کا زمانہ ہے۔ لیکن یہاں سے ہی ہندوستان میں مسلمانوں کو زوال ہونا شروع ہو گیا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ شادیاں سیاسیات کی زندگی میں ایک وقتی سہارا ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر مسلمانوں نے سپین پر آٹھ سو سال تک حکومت کی۔ ان کے حرم میں عیسائی عورتیں موجود تھیں۔ لیکن ان کا نام و نشان تک مٹا دیا گیا۔ یہی عالم ترکوں کا تھا۔ ان کے حرم کی بھی یہی حالت تھی۔ اور بہت سے شہزادے انہیں کے بطن سے تھے۔ لیکن یہ رشتے ان کی حکومت کو محفوظ نہ رکھ سکے۔ بلکہ خون کی پاکیزگی نہ رہنے کی وجہ سے غیرت و حمیت ختم ہو جاتی ہے۔ غداری عام ہونے لگتی ہے۔ یہی عالم اکبر کے بعد ظہور پذیر ہوا۔ لیکن اس غداری میں اکبر کے خوشامدی فیضی اور ابوالفضل بھی برابر کے شریک ہیں۔ جن کی غلط رہبری کی وجہ سے دین اسلام میں رخنہ اندازی ہوئی اور مغلیہ سلطنت کو زوال آنے لگا۔

انسانی فطرت ہے کہ وہ رعایات اور مراعات کو حقوق میں تبدیل کرنا چاہتا ہے۔ وہ لالچ کا پتلا ہے اسی لالچ کی بنا پر اکثر جنگیں ہوئیں۔ خون خرابہ ہوا خوش قسمتی سے اکبر کے زمانہ کی دی ہوئی مراعات نے جہانگیر اور شاہجہاں کے عہد میں کوئی خاص واقعہ پیدا نہ ہونے دیا۔ چونکہ یہ بھی اکبر کے بجائے ہوئے سازوں پر قدم بڑھاتے گئے۔ لیکن 1658ء میں اورنگ زیب تخت دہلی پر بیٹھا۔ جو کہ مغل بادشاہوں میں آخری بڑا بادشاہ تھا۔ یہ محنتی' خود منضبط اور مذہبی انسان تھا۔ وہ ہندوستان میں پھر نئے سرے سے ایک اسلامی سلطنت قائم کرنا چاہتا تھا۔ اب جہاں اکبر کی یہ حالت تھی کہ اس نے اسلام کو تباہ برباد کرنے میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ کیا تھا۔ اس نے مسجدوں کی بے حرمتی کرائی۔ ان کو اصطبل و گودام بنوایا۔ تو اس کی جگہ اب اورنگ زیب عالمگیر نے لی تھی۔ جو کہ متقی انسان تھا۔ اور اس نے سوسائٹی کی نئے سرے سے اصلاح کرنی تھی۔ اب ہندو انگریز اور شیعہ فرقہ کے مورخوں نے اس کو خوب برے رنگ میں پیش کیا۔ ہندو تو اس کی اسلام دوستی پر نالاں تھے۔ انگریز ہندوؤں کی حمایت حاصل کرنا اور اقتدار جمانا

چاہتے تھے۔ اور شیعہ فرقہ اس کی بیجاپور اور گول کنڈہ کی فتوحات کی وجہ سے ناراض تھے اس نے سب سے پہلے ہندوؤں پر جذیہ لگایا۔ اسلام کی حفاظت کے لئے اکبر کے اثرات کو ختم کرنے کی جدوجہد جاری رکھی۔ ہندو راجپوت اور مرہٹے جو کہ بڑے بڑے عہدوں پر تھے۔ آہستہ آہستہ غداری کرنے لگے۔ اب اورنگ زیب نے انہیں الگ کرنا شروع کیا۔ چنانچہ وہ خلاف ہو گئے اور ایک گوریلا جنگ کا آغاز ہو گیا۔ جس کی رہبری شیواجی کر رہے تھے۔ اس نے اپنا پچاس سالہ دور حکومت غیر مذہبوں اور چند غدار مسلمان راجاؤں کے خلاف جنگ میں صرف کیا۔ یہاں سے وہ لاوا جو کہ ہندوؤں میں اندر ہی اندر پرورش پا رہا تھا۔ ابل کر سامنے آگیا۔ ہندو مسلم دو علیحدہ قومیں ظاہر ہونے لگیں۔ جن میں سے اول الذکر محکوم اور موخر الذکر حاکم تھی۔ اب ہندو ہر کاروائی کو تحریک آزادی سے تعبیر کرتے تھے۔ اور تمام ہندو مسلمانوں کو تباہ و برباد کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتے تھے۔ 1707ء میں اورنگ زیب کا انتقال ہوا۔ شہزادے کمزور اور ناتجربہ کار تھے۔ اب دولت مغلیہ کا چراغ ٹمٹماتا ہوا نظر آتا ہے۔ سازشوں کا بازار گرم ہے۔ سلطنت عملی طور پر چھوٹی چھوٹی جاگیروں میں تقسیم ہو چکی ہے۔ اور جاگیردار ہوس و لالچ کے گھوڑے پر سوار ہیں۔ وہ ایک دوسرے کو زک پہنچانے کے درپے آزار ہیں۔ 1707ء سے 1857ء تک کا زمانہ ہندوستان میں اندرونی خلفشار۔ افراتفری۔ انگریز کی دھوکہ دہی۔ عیاری و مکاری۔ سازش و غداری کا زمانہ ہے۔ اسی زمانہ میں ایک طرف سراج الدولہ۔ حیدر علی اور سلطان ٹیپو جیسے بہادر۔ حریت پسند اور جانثار پیدا ہوئے۔ تو دوسری طرف جعفر و صادق جیسے غدار، ننگ دین، ننگ قوم اور ننگ وطن پیدا ہوئے۔ جنہوں نے اپنی وقتی خوشی کے لئے ملک و ملت کو تقریباً" دو سو سال کے لئے انگریز کا غلام بنا دیا۔

انگریز کی آمد

یہ یورپ کے شمال مغربی کونے پر برطانیہ کے چھوٹے سے جزیرے کے باشندے تھے۔ جو اپنی عیاری و مکاری میں میکاولی کی لومڑی سے بھی زیادہ تیز ہیں۔ ان کی اسی تیزی اور نافقانہ خصلت کا نتیجہ تھا کہ تاریخ میں وقت ایسا آیا کہ ان کی سلطنت پر سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔ انہوں نے ولندیزوں کی دیکھا دیکھی 1600ء میں جب کہ ہندوستان پر شہنشاہ اکبر حکمران تھا۔

تجارتی اغراض کے پیش نظر ایسٹ انڈیا کمپنی کی بنیاد ڈالی۔ 1608ء میں ملکہ الزبتھ اول کے عہد میں ایک انگریز کپتان ہاکنز جہانگیر کے دربار میں حاضر ہوا اور تجارتی مراعات لے کر واپس لوٹا۔ 1615ء میں جیمز اول کے عہد میں سر طامس رو جہانگیر کے دربار میں آیا۔ یہ بڑا زیرک، متین بردبار اور سنجیدہ مزاج تھا۔ اس نے سورت اور احمد آباد میں تجارتی کوٹھیاں کھولنے کی اجازت لے لی۔ 1637ء میں ڈاکٹر باٹن نے شاہجہان کی بیٹی جہاں آراء کا علاج کیا۔ جس کے بدلے میں وہ اپنی قوم کے لئے ہگلی اور بالاسور کے مقامات پر تجارتی مراعات لینے میں کامیاب ہو گیا۔ 1638ء میں پٹنہ اور قاسم بازار میں تجارتی کوٹھیاں قائم ہوئیں۔ اسی سال فورٹ سینٹ جارج تیار ہوا۔ 1688ء میں انگریز ڈاکوؤں نے حاجیوں کے چند جہاز لوٹ لئے جس پر شاہ عالمگیر نے اپنے صوبیداروں کو ان کے اخراج کا حکم دیا۔ مگر انگریزوں نے معافی مانگ لی اور ڈیڑھ لاکھ سالانہ اخراج پر 1690ء میں دوبارہ تجارتی حقوق حاصل کر لئے۔ 1697ء میں کلکتہ خرید کر فورٹ ولیم تیار کیا 1708ء میں اورنگ زیب کی وفات کے بعد ہندوستان میں حالات خراب ہونے لگے۔ انگریز جو تجارت کی غرض سے آئے تھے۔ ان کا نظریہ بدل گیا۔ انگریزی پارلیمنٹ نے کمپنی کو تسلیم کر لیا۔ اور اس کی پشت پناہی کرنے لگی۔ یہاں تک کہ کمپنی کو سیاسی حالات میں مداخلت کی اجازت دے دی۔ جس سے ظاہر تھا کہ انگریز تجارت کو بالائے طاق رکھ کر ہندوستان کی افراتفری سے فائدہ اٹھا کر ہندوستان پر حکومت کرنے کا سوچنے لگے۔ اسی زمانہ میں یعنی 1740ء میں آسٹریا کی جنگ تخت نشینی شروع ہو گئی۔ جس کی وجہ سے اس کا اثر ہندوستان پر بھی پڑا۔ اور یہاں انگریز اور فرانسیسی آپس میں لڑ گئے۔ کرناٹک کی جنگوں میں فرانسیسیوں کو شکست ہوئی اور انگریز لارڈ کلائیو کے سرکردگی میں کامیاب و کامران رہے۔ ان دنوں بنگال کا حاکم علی وردی خان تھا۔ وہ نہایت معاملہ فہم، قابل جنرل اور منتظم حکمران تھا۔ اس نے 10 اپریل 1756ء میں استسقاء کے بیماری سے وفات پائی تو اس کا نواسہ مرزا محمود اٹھارہ سال کی عمر میں سراج الدولہ کے نام سے جانشین ہوا۔ یہ ایک محب وطن اور قابل جنرل تھا۔ اس نے انگریزوں کو سزا دینے کی ٹھانی۔ چونکہ وہ اس کے مجرموں کو پناہ دے رہے تھے۔

جنگ پلاسی 1757ء

یہ وہ جنگ ہے جس نے ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ کر دیا۔ غداری و مکاری کا بول بالا ہو

گیا اور مسلمان سازشوں اور ذلتوں کا شکار ہونے لگے۔ مسلمانوں کی آزادی اور حکومت چھن گئی۔ وہ غلام و محکوم بن گئے۔ کرنل جی بی مالسن (Col G.B. Malleson) نے اپنی کتاب "ہندوستان کی فیصلہ کن جنگ" میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔ "کوئی ایسی جنگ نہیں جس کے نتائج اتنے وسیع، جلد اور مستقل ہوں۔ اس مختصر فتح سے انگریز بنگال، بہار اور اوڑیسہ کے مالک بن گئے۔ یہ ایک اڈا تھا۔ جو کہ خشکی و سمندر پر ناقابل شکست تھا اسی کی بدولت وہ سندھ تک اپنے اقتدار کو بڑھانے کے قابل ہوئے۔ جن کی قوت اس وقت یورپ بھی مانتا تھا۔ یہ پلاسی ہی تھا۔ جس نے انگلستان کو دنیا کی سب سے بڑی مسلمان قوت پر حکمرانی دی۔ پلاسی ہی تھا جس نے انگریز کو مشرق کے تنازعات کے تصفیہ میں اہم کردار دیا۔ پلاسی نے راس امید کو نو آبادیات اور مصر کو محفوظ علاقہ کا درجہ دیا۔" بعد میں جا کر پھر تحریر کرتا ہے کہ "یہ پلاسی ہی تھا جس کے نتائج میں اس چھوٹے سے جزیرے والوں کو امریکہ کے نقصان سے اطمینان ملا" یہ جنگ جس کا فیصلہ میدان جنگ میں نہ ہوا بلکہ محلوں و کوٹھیوں میں ہوا۔ جن پر بھروسہ تھا مار آستین نکلنے لگے۔ انگریز رشوت اور سازش سے میر جعفر کو (جو بنگال کی افواج کا کمانڈر انچیف تھا) دولاب رام (Dulah Ram) (وزیراعظم نواب) اومے چند (Omichand) کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ نواب اس سازش سے بیخبر دشمن کا مقابلہ کرنے کی تیاری میں مصروف ہے۔ وہ پچاس ہزار پیدل اور اٹھارہ ہزار سواروں کا لشکر جرار لے کر آگے بڑھا۔ پلاسی کے مقام پر دوپہر تک جنگ ہوتی رہی۔ لیکن افسوس اس کا مرد میدان میرمدن زخمی ہوا۔ اور وہیں مر گیا۔ اب میر جعفر انگریز کے ساتھ جاملا۔ جنگ کا پانسہ پلٹ گیا سازش کامیاب ہو گئی۔ رشوت کا لالچ کام کر گیا۔ غدار مرد میدان کے سینے میں خنجر گھونپ چکا تھا۔ نواب سراسیمہ ہو گیا۔ وہ فوج کو ترتیب دینے اور حالات پر قابو پانے کے لئے پیچھے ہٹا۔ کہ میر جعفر کے بیٹے میدن کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی ہندوستان کے سر غلامی کی پہلی مہر ثبت کردی گئی۔ اس کے بعد مسلمانوں نے بنگال میں ہر جتن کئے کہ انہیں انگریزوں سے گلو خلاصی ہو لیکن ہر بار ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔

دکن

اس وقت دکن میں انگریز مدراس اور بمبئی، حیدر آباد پر نظام، شمالی حصے میں مرہٹے،

میسور میں حیدر علی اور دیگر یورپین اقوام تھیں۔ انگریزوں کو بنگال میں استحکام حاصل ہو گیا تھا۔ وہ مختلف ذرائع اور حیلے بہانوں سے ہندوستان کی داخلی پالیسی پر اثر انداز ہو رہے تھے۔ ان کی اس حالت کو دیکھ کر دکن میں دو شیر باپ اور بیٹا اپنی کچھار سے نکل کھڑے ہوئے۔ انہوں نے ہندوستان کی آزادی کی خاطر تلوار ہاتھ میں لی اور اس وقت چھوڑی جب روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ انگریز نے یہاں بھی رشوت اور سازش کا چکر چلایا۔ نظام حیدر آباد اور مرہٹوں کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ میسور کی قوت کو کچلنے آگے بڑھا۔ لیکن دلیرو جفاکش حیدر علی انگریز کے سامنے تھے اس نے اپنی جوانمردی' بہادری اور شمشیر زنی سے انگریز کو تقریباً" پچاس سال تک بڑھنے نہ دیا۔ عہد نامہ مدراس 4 اپریل 1769ء اور عہد نامہ منگلور مارچ 1787ء اس کی بہادری کے زندہ ثبوت ہیں۔ جو کہ بہت حد تک انگریز کی شکست کے مظہر ہیں۔ لیکن اس نے اپنی چالاکی و عیاری کو بروئے کار لاتے ہوئے صلح کر لی۔ لارڈ ہیسٹنگز نے بڑی جفاکانہ سازش سے نظام' راجہ بیرن اور مہاراجہ سندھیہ کو اس سے جدا کیا۔ پھر اس مرد جفاکیش و مجاہد خصلت پر ٹوٹ پڑے لیکن اس کی حکمت عملی کے سامنے انگریز کی ایک نہ چل سکی۔ اس وقت حیدر علی کے پاس صرف 3 ہزار سپاہ تھی۔ اور انگریز کا لشکر جرار بمعہ نیوی اور اتحادی افواج کے جو کہ مرہٹوں اور نظام کی تھیں۔ پانچ ماہ تک جنگ و جدل کا سماں رہا۔ بدقسمتی سے میر صاحب جو کہ بائیں حصے کے کمانڈر تھے مارے گئے۔ جس کی وجہ سے حیدر علی کی افواج کو صدمہ ہوا اور حیدر علی چند گز پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو گیا۔ جس کا مالسن اس طرح ذکر کرتا ہے۔ "البتہ انگریزوں کے 306 آدمی ہلاک ہوئے اور انہوں نے صرف وہ جگہیں حاصل کیں جہاں پر کہ وہ لڑ رہے تھے"۔ اب حالات نے پلٹا کھایا۔ حیدر علی کو سرطان ہو گیا۔ وہ اس مہلک مرض سے 7 دسمبر 1782ء کو ستر سال کی عمر میں راہی ملک عدم ہوا۔

ٹیپو سلطان

شیر باپ کا شیر دل شہزادہ' اپنے باپ کی طرح شجاع و بہادر' جنگجو و مرد میدان' نڈر سپاہی' ہنرمند و منظم جنرل' صاف گو و صاف بیان سفیر' قابل و محنتی حکمران' جس کی زندگی کا ماٹو "شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سال زندگی سے بہتر ہے" تھا باپ کی وفات کے بعد تخت میسور پر

بیٹھا۔ باپ سے ورثہ میں کھلی تلوار میسر آئی اور اسے مرتے دم تک دشمن نابکار کے خلاف استعمال کیا اور نیام میں نہ ڈالی۔ وہ باپ کی حیات میں ہی کرنل ویٹ کو شکست فاش دے چکا تھا۔ اب اس نے بریگیڈیر میتھیوز (Brig Mathews) کو قبضے میں کرلیا۔ یہ انگریزوں کے خلاف پندرہ ماہ تک لڑتا رہا اور 11 مارچ 1784ء کو عہد نامہ منگلور کے ساتھ اس جنگ کا خاتمہ ہوگیا۔ یہ عہد نامہ انگریزوں کے لئے بہت بڑی بے عزتی کا باعث ہوا۔ اس کے تحت قیدیوں کو رہا کردیا گیا۔ جن جگہوں پر غاصبانہ قبضہ تھا انہیں چھوڑنا پڑا۔

اب ہندوستان میں صرف والئی میسور ہی تھا جو کہ انگریزوں کے راستے میں رکاوٹ تھی۔ جب انگریز اپنی پوری قوت سے میدان جنگ میں اس رکاوٹ کو دور نہ کرسکے۔ تو انہوں نے اس کو قتل کرنے کی سازش کی لیکن ناکام رہے۔ اب ولزلی نے ایک نئی چال چلی کہ نظام اور مرہٹوں کو اپنے ساتھ ملایا۔ اب اس نڈر حکمران پر تین اطراف سے حملہ کردیا۔ لیکن اب بھی انہوں نے قوت سے بڑھ کر ایک اور ہتھیار رشوت کو کام میں لاکر غدار میر صادق کو جو کہ ٹیپو سلطان کا وزیر خزانہ تھا اپنے ساتھ ملالیا۔ اب اس آزادی کی شمع کی حالت چراغ سحری کی سی ہونے لگی۔ اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے۔ قلعوں پر قلعے اور شہروں پر شہر قبضے میں جانے لگے۔ یہ آزادی کا متوالا دشمنوں اور اپنوں سے نبرد آزما ہوتا ہوا اپنے ہی دارالخلافہ میں محصور ہوکر رہ گیا۔ وہ سرنگاپٹم کی دیواروں تلے اپنے ملک کی آزادی و دفاع کے لئے ایک بہادر جنگجو اور مخلص محب وطن کی طرح دلیرانہ لڑتا ہوا وطن کی تاریخ کو اپنے خون سے تحریر کرگیا۔ جب کہ اس کے ساتھی خون کے آنسو رو رہے تھے اور دشمن ڈر رہے تھے۔

میسور اپنے سنہری باب کے ساتھ ختم ہوگیا۔ اب ہندوستان کی کمر ٹوٹ چکی تھی۔ انگریز اپنی نافقانہ خصلتوں کی بدولت شیر کی قوت حاصل کرچکا تھا۔ اب چھوٹے چھوٹے راجہ و مہاراجہ رہ گئے تھے۔ ان کے پاس قوت تو تھی لیکن ٹیپو کا جذبہ اور دل نہ تھا۔ یہ گیدڑ خصلت لوگ یکے بعد دیگرے شیر کے ہتھے چڑھنے لگے۔ وہ ان کے خون سے قوت پکڑتا گیا۔ اور اگلی نصف صدی میں تمام ہندوستان پر قابض ہوگیا۔ ہندوستانیوں نے لالچ اور غداری کی بدولت غلامی کا جوا پہن لیا۔

جنگ آزادی 1857ء

انگریز کی بڑھتی ہوئی قوت کو شجاع الدولہ' حیدر علی اور ٹیپو سلطان کی فردا" فردا" قوت جب نہ روک سکی۔ تو انگریز اپنی من مانی کرنے لگے۔ اب ہندوستان پر مغلیہ خاندان کا چراغ ٹمٹما رہا تھا۔ اور عملی طور پر تمام کاروبار انگریز اپنے ہاتھ میں لے چکے تھے۔ انہوں نے اپنی حکومت کو استحکام دینے کے لئے عیسائیت' انگریزی رسم و رواج اور دیگر ذرائع کو عام کرنا شروع کیا۔ اب جو ہندوستانیوں نے اپنے مذہب' رسم و رواج' زبان اور لباس پر اثر پڑھتا ہوا دیکھا تو ان کے خفتہ ضمیر جاگنے لگے۔ ان میں ایک تحریک نے جنم لیا۔ کہ وہ غیر ملکی اقتدار سے گلو خلاصی پالیں۔ تمام ہندوستان پشاور سے کلکتہ تک اٹھ کھڑا ہوا۔ گو انہیں آزادی نصیب نہ ہوئی لیکن پھر بھی یہ تاریخ میں اہم خصوصیت کا واقعہ ہے۔ اس کے مختلف اسباب تھے۔

I- سیاسی اسباب:

1- اب تک ہندوستان کا تقریبا" ایک تہائی حصہ تقریبا" چھ سو با جگزار مسلمان یا ہندو حکمرانوں کے زیر تصرف تھا۔ جنہیں مختلف درجوں کے اختیارات حاصل تھے۔ لارڈ ڈلہوزی نے الحاق کی پالیسی جاری کی۔ جس کی وجہ سے اس نے کئی علاقوں کو اپنے قبضے میں کرلیا۔ جس کی وجہ سے عوام و حکمران انگریز سے بدظن ہوگئے اور انتقام کا لاوا ابلنے لگا۔ انہیں اپنی ریاستوں پر انگریز کی ہوس ملک گیری کے سائے پڑتے ہوئے دکھائی دینے لگے۔ چنانچہ وہ اس بڑھتے پنجے کو کاٹ دینا چاہتے تھے۔

2- جن ریاستوں کو الحاق کی حکمت عملی کے ساتھ انگریزی عملداری میں شامل کرلیا گیا تھا۔ وہ اس غلط رویہ کا انتقام لینے کے منتظر تھے۔

3- پیشوا کے متبنٰی نانا صاحب کی پنشن لارڈ ڈلہوزی نے ضبط کرلی تھی۔ وہ سیخ پا ہو گئے تھے۔

4- جھانسی کی بیوہ رانی لکشمی بائی اپنا متبنٰی بنانا چاہتی تھیں۔ لیکن لارڈ ڈلہوزی کسی طرح اجازت نہ دے رہا تھا۔ اور اس کی ریاست چھین لی۔ چنانچہ وہ انگریزوں سے سخت نالاں تھی اور انتقام لینے کی منتظر تھی۔

5- اودھ کے الحاق کے بعد انگریزوں نے وہاں کے تعلق داروں سے سختی کا سلوک شروع کر دیا چنانچہ اس الحاق اور بدسلوکی کی وجہ سے سخت مضطرب تھے۔

6- یہی عالم تخت دہلی کا بہادر شاہ ظفر کے بعد ہونے والا تھا۔ اسی طرح مرہٹوں کی ریاستیں ستارہ اور ناگپور رہ انگریزی عملداری میں جا چکیں تھیں۔

ان سب حالات کے تحت بغاوت اور افراتفری کا سماں پیدا ہو جانا قرین قیاس تھا کسی وقت بھی آگ بھڑک سکتی تھی۔

2 معاشرتی اسباب:

انگریزوں نے اپنی حکومت کی پائیداری کے لئے اصلاحات شروع کر رکھی تھیں۔ جو کہ انگریز کے لئے زیادہ فائدہ مند تھیں۔ ان کا زیادہ تر اثر ہندوستانیوں کی طرز معاشرت پر پڑتا تھا۔ انگریزی تعلیم مدراس، بمبئی اور کلکتہ میں عام تھی۔ اس کی وجہ سے نوجوان طبقہ انگریزی تہذیب وتمدن کا دلدادہ بنتا جا رہا تھا۔ ان کے عقائد اور بودوباش میں فرق آ رہا تھا۔ رسم ستی اور دختر کشی قانوناً" بند ہو گئی تھیں۔ بیواؤں کو شادی کا حق مل گیا تھا۔ یہ اقدامات ہندوؤں کے رسم ورواج کے بالکل خلاف تھے۔

3 مذہبی اسباب:

حکومت لوگوں کو عیسائی بنانے میں ضرورت سے زیادہ سرگرم عمل تھی۔ بورڈ آف ڈائریکٹرز کے چیرمین مسٹر مینگلز نے دارالعوام میں کہا کہ "قدرت نے انگلستان کو ہندوستان کی حکومت اس لئے عطا کی ہے کہ اس کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک یسوع مسیح کا جھنڈا لہرانے لگے۔" اسی طرح میکالے (جس کے اصرار پر مغربی تعلیم رائج ہوئی) نے اپنی ماں کو خط میں لکھا کہ نئے تعلیمی نظام کے زیر اثر 30 سال کے عرصے میں سارا ہندوستان عیسائی بن جائے گا۔ یہ صرف یہاں تک ہی نہ تھا۔ بلکہ حکومت کے ذمہ دار افسر بھی تبلیغ کا کام کرتے۔ یہاں کے مذاہب اسلام اور ہندومت کو برا بھلا کہتے اور عیسائیت کو فروغ دینے کی جہد کرتے۔

یتیم بچوں کو عیسائی مشنریوں کے سپرد کر دیا گیا۔ جہاں وہ اپنے مذاہب سے نابلد رہے۔ ملازمت کے لالچ میں لوگوں کو عیسائی بنانے کی نازیبا حرکات کی گئیں۔ اور پھر چند ایسے قوانین وضع کیئے گئے جن کا مقصد تبدیلی مذہب کی حوصلہ افزائی کرنا تھا۔ مثلاً" وراثت کا قانون، رسم ستی کا خاتمہ وغیرہ۔

مزید برآں ایک فوری وجہ یہ ہو گئی کہ فوج کو ایسے کارتوس مہیا کئے گئے جن پر چربی لگی ہوئی تھی۔ استعمال کے وقت چربی کو دانتوں سے الگ کرنا پڑتا تھا۔ یہ چربی سور اور گائے کی مشترک تھی۔ جلد ہی یہ راز فاش ہو گیا۔ سپاہی بیزار ہو گئے۔ انہوں نے احتجاج کیا لیکن کچھ شنوائی نہ ہوئی۔ آخر 85 سواروں کو کارتوس کے استعمال کرنے کے انکار میں دس سال قید بامشقت کی سزا دی گئی۔ جس کی وجہ سے میرٹھ میں بغاوت کی ابتدا ہو گئی جس نے ایک تاریخی ہنگامے کی صورت اختیار کرلی۔

یہ ہنگامے دہلی' اودھ' روہیل کھنڈ' کانپور جھانسی اور دیگر مقامات پر ہوئے۔ جنہیں انگریزوں نے سکھوں اور مہاراجہ پٹیالہ اور جھنڈ کی مدد سے فروغ کیا۔ جس کا ذکر رسل (Russell) "ہندوستان میں میری ڈائری" (My Diary in India) میں اس طرح کرتا ہے "ہمارا دہلی پر قبضہ بالکل ناممکن ہوتا اگر مہاراجہ پٹیالہ اور جھنڈ ہمارے دوست نہ ہوتے اور اگر سکھوں کو ہم نے اپنی بٹالین میں بھرتی نہ کیا ہوتا۔ اور وہ پنجاب میں خاموش نہ رہتے۔ سکھوں نے لکھنؤ میں بہت بڑی اور اچھی خدمت سرانجام دی۔ یہ ہنگامے تو فروع ہو گئے لیکن مسلمانوں پر قتل وغارت کے دروازے کھل گئے۔ مردوں' عورتوں اور بچوں کو گولی کا نشانہ بنایا گیا۔ مساجد کی بے حرمتی کی گئی۔ ہزاروں جانیں بھوک اور سردی سے لقمہ اجل ہوئیں۔ مسٹر سپیر تحریر کرتے ہیں کہ "اس کے بعد خوف وخطر کا منظم زمانہ شروع ہوا۔ جو کہ کئی ہفتے جاری رہا۔ دہلی کی تمام آبادی کو شہر سے باہر نکال دیا گیا"۔ مس سندرز (Saunders) اپنے 25 اکتوبر کے خط میں اس طرح رقمطراز ہیں "شہر کا ہر گھر خالی ہے اور اکثر گرے پڑے ہیں۔ اس سات میل کے اردگرد کے باشندے بہت بڑی تعداد میں روزانہ بھوک اور پناہ نہ ملنے کی وجہ سے مر رہے ہیں۔ اور حکومت کے انعام یافتہ نمائندے امیر باشندوں کے گھروں کو خزانہ کی تلاش میں کھود رہے ہیں۔" اس طرح لوٹ مار کا سامان اکٹھا نیلام کیا گیا جس کو برہمن اور بنیا لوگوں نے 2 لاکھ ستر ہزار پونڈ سے خریدا۔ سب سے بڑا نقصان جو مسلمانوں کو ہوا وہ شاہی کتب خانہ کی تباہی کا ہے۔ انگریزوں نے ان قیمتی دستاویزات کو پارہ پارہ کر دیا۔ تمام علماء' فضلاء اور شعراء کو تہ تیغ کر دیا۔ بمبئی کے گورنر الفنسٹن کے اعتراف کے مطابق "انگریزوں کی سفاکی کے سامنے تیمور اور نادر شاہ کے حملے بے حقیقت ہو کر رہ گئے۔" مگر انگریز اس تمام تباہی

وبربادی کے باوجود مسلمانوں کے دل سے آزادی کی روح مسخ نہ کرسکا۔

حوالہ جات

1 مسٹر سمتھ' فرشتہ اور بدایوانی' کا مطالعہ کریں

Col. G.B Malleoon, "The Decisive Battles of India-" 2
p-67

3 پاک وہند کی اسلامی تاریخ' صفحہ 344

The India War of Independence (1857), P-5. 4

Discovery of Pakistan by A.A.Aziz, P-288. 5

مسلم قومیت کا ارتقاء

مسلمان تباہ و برباد ہو رہے تھے' ان کے گھر لٹ رہے تھے' ان کی عصمتیں لٹ رہی تھیں' ان کے مذہب کی بے حرمتی ہو رہی تھی' ملت احساس خودی اور خود اعتمادی کھو رہی تھی' احساس کمتری میں مبتلا ہو رہی تھی' اس کی اقتصادیات' معاشیات اور سیاست تباہ ہو چکی تھی کہ اتنے میں اس بے یار و مددگار قوم کو قدرت نے سرسید احمد خان جیسے فرزند ارجمند سے نوازا۔ جس نے قوم کی ڈوبتی ہوئی نیا کو بھنور سے نکالنے اور کنارے لگانے کی سرتوڑ کوشش کی۔ قوم کو چھوٹے ہوئے پتوار پھر ہاتھ لگے۔ وہ منزل بہ منزل کنارے کی طرف رواں ہو گئی۔

1 تحریک علی گڑھ

تحریک علی گڑھ پر روشنی ڈالنے سے پیشتر یہ لازمی معلوم ہوتا ہے کہ یہ جان لیا جائے کہ اس تحریک کا مقصد کیا تھا؟ اس کے بانی مبانی کون تھے؟ اس نے کس طرح تحریک کی شکل اختیار کی۔ یہ زمانہ مسلمانوں کے انحطاط کا زمانہ تھا۔ انگریز مسلمانوں کو کچل رہے تھے۔ ہندو انگریزی تعلیم سے آراستہ ہو کر دولت برطانیہ کے زیر سایہ ترقی کرتے جا رہے تھے۔ وہ یہ جانتے تھے کہ ایک دن ضرور آنے والا ہے۔ جب برطانیہ ہندوستان کو آزاد کرنے پر مجبور ہو گا۔ چنانچہ وہ اس مقصد کے حصول کے لئے مسلمانوں پر حکمرانی کرنے کے جذبے میں دن رات کوشاں تھے اور مسلمان بے دست و پا حاکم سے نبرد آزما تھے۔ قوت نہ ہونے کی وجہ سے بری طرح کچلے جا رہے تھے کہ اتنے میں مسلمانان ہند میں سرسید احمد خان جیسا مستقل مزاج' مصمم ارادے کا مالک ایک دور اندیش رہنما آگے بڑھا۔ جس کو قوم نے غدار کہا' اس نے قوم سے وفا کی۔ قوم نے

جس کے ہر کام میں رکاوٹ پیدا کی اس نے اس کو بسرو چشم قبول کیا۔

سر سید احمد خان (1817ء تا 1898ء)

آپ 1817ء میں دہلی کے ایک ممتاز گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آپ کے خاندان کے بزرگان مغلیہ خاندان کے زمانہ میں بڑے بڑے عہدوں پر فائز تھے۔ آپ کے والد میر تقی گوشہ نشین بزرگ تھے۔ لہٰذا آپ کی تعلیم و تربیت والدہ کے زیر سایہ ہوئی۔ آپ نے عربی فارسی کی تعلیم گھر پر ختم کی۔ اس کے علاوہ مروجہ علوم میں ریاضی اور طب میں بھی دستگاہ حاصل کی۔ بائیس سال کی عمر میں کمپنی کی ملازمت اختیار کی۔ اس سلسلے میں آپ صوبجات متحدہ کے مختلف ضلعوں میں رہے۔ 1857ء میں جب جنگ آزادی شروع ہوئی تو آپ بجنور میں تھے۔ آپ نے انگریزوں کی امداد کی۔ ان فسادات کے بعد مسلمانوں پر ظلم و ستم کے دروازے کھل گئے۔ آپ کڑھتے رہے۔ یہاں تک (1) ڈبلیو سی سمتھ کے خیال کے مطابق آپ نے مصر میں ہجرت کے بارے میں بھی غور کی۔ لیکن بعد میں ارادہ ملتوی کر دیا۔ مسلمانوں اور انگریزوں کے درمیانی اختلاف دور کرنے کی سعی شروع کر دی۔ اور "اسباب بغاوت ہند" 1859ء میں تحریر کی۔ اس میں انہوں نے حکومت برطانیہ کو ان کی ذمہ داریوں سے آگاہ کیا۔ 61-1860ء میں "ہندوستان کے وفادار مسلمان" تحریر کی۔ جس میں ان مسلمانوں کا ذکر تھا جنہوں نے انگریزوں کی امداد کی۔ مذہب کے مسئلہ میں انہوں نے اسلام اور عیسائیت میں جو مطابقت ہے اس کا ذکر کیا۔ اور دونوں پیروکاروں کو یکجا کرنے کی سعی کی (2) 1869ء میں آپ نے انگلستان کا دورہ کیا اور وہاں کی تہذیب سے متاثر ہوئے۔ 15 اکتوبر 1869ء کو لندن سے خط میں اپنے تاثرات کو اس طرح ظاہر کیا "ہندوستان کے باشندے خواہ وہ بڑا ہے یا چھوٹا' تاجر ہے یا دکاندار' عالم ہے یا جاہل سب کا موازنہ جب انگریزوں کی تعلیم' اطوار یا کردار سے کیا جائے تو ایسا ہی ہے جیسا کہ ایک گندا جانور قابل و خوبصورت انسان کے مقابلے میں ہو" (3) اب انہوں نے ہندوستانیوں اور خاص کر مسلمانوں کے اخلاق کو بہتر بنانے کا بیڑا اٹھایا۔ وہ اسی صورت ممکن تھا کہ انگریزوں اور مسلمانوں میں مصالحت کی کوئی سبیل نکل آئے۔ اس لئے انہوں نے سب سے پہلے اسلام کا مذہب ہونا ثابت کرنے کے لئے ولیم میر (Muir) کی "حیات

محمدؐ" اور ولیم ہنٹر کی "ہندوستانی مسلمان" کے باب "وہابی" کا واضح الفاظ میں جواب دیا (4)
جن کا اثر بہتر ہوا۔ اس کے بعد برطانیہ کے سپکٹیٹر (Spectator) اور ٹیٹلر (Tatler) کے
نمونے پر "تہذیب الاخلاق" جاری کیا۔ پھر مسلمانوں میں مزید بیداری پیدا کرنے کے لئے ایم
اے او کالج علی گڑھ کی بنیاد ڈالی جو کہ بعد میں یونیورسٹی کے درجے تک پہنچا اور اسی سے ہماری
تحریک کو جنم ملا۔

آپ نے قوم کی علمی وادبی اور معاشرتی خدمات کرتے ہوئے 1898ء میں وفات پائی اور
علی گڑھ میں ہی دفن ہوئے۔

سیاست

سرسید کی خدمات کو ہم تین حصوں میں تقسیم کرسکتے ہیں:

1- دولت برطانیہ سے وفا
2- جانثاری تعلیم
3- سیاست سے علیحدگی

آپ نے 1876ء تک مسلمانوں کو انگریزوں کے نزدیک لانے کی ہر ممکن کوشش کی۔
1876ء تا 1898ء تک کا عرصہ آپ کی سیاسی زندگی کا عرصہ ہے۔ اس عرصہ میں انہوں نے
بھانپ لیا کہ جمہوری دور میں مسلمان ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اکثریتی فرقے کے غلام بن جائیں
گے۔ اس غلامی سے نجات اسی صورت ممکن ہے کہ مسلمان تعلیم حاصل کریں اور انگریز سے
تعاون مسلمان کی بہتری کا زینہ تھا۔ مسلمان اسی صورت زیادہ ترقی کر سکتے تھے کہ انہیں حاکم کا
اعتماد حاصل ہو۔ اس اعتماد کے حصول کے لئے سیاست سے علیحدگی لازمی امر تھا۔ تعلیم کے لئے
1875ء میں ایم اے او کالج کی بنیاد رکھی جہاں سے بعد میں مسلمان اکابرین نکلے۔ حالی، شبلی
نعمانی اور نذیر احمد قابل ذکر ہیں۔ جنہوں نے سرسید کے ادھورے کام کو پایہ تکمیل تک
پہنچانے کی ہر ممکن کوشش کی۔

آپ 1878ء سے 1883ء تک گورنر جنرل کی قانون ساز کونسل میں ممبر رہے۔ یہاں پر
انہوں نے متحدہ رائے شماری کے خلاف آواز بلند کی اور کہا کہ ہندوستان جیسے ملک میں نمائندہ

جمہوری حکومت کسی صورت ممکن العمل نہیں ہے۔ چونکہ یہاں پر دو بڑی قومیں' ہندو و مسلمان' موجود ہیں۔ جو کہ ہر لحاظ سے ایک دوسرے کے خلاف ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب 1885ء میں کانگریس کا وجود ہوا آپ نے اپنی شہرت' وقار اور اثر و رسوخ سے ہر ممکن کوشش کی کہ مسلمان کانگریس میں شامل نہ ہوں۔ انہوں نے تو یہاں تک کہہ دیا "یہ میرا مکمل یقین ہے کہ اگر یہاں کی کانگریس کی قرارداد موثر طور پر مان لی گئی تو حکومت برطانیہ کے لئے یہ ممکن نہ ہو گا کہ وہ یہاں پر امن و امان قائم کر سکے۔ یا جو خون خرابہ یا خانہ جنگی اس سے پیدا ہو گی اس پر کنٹرول کر سکے" (5) عوام نے ان پر بھرپور تنقید کی' ان کو انگریز کا ٹوڈی قرار دیا' غیر جمہوریت پسند اور غیر قومیت پسند ٹھہرایا۔ لیکن وہ ہمت و استقلال سے اپنے خیالات کی اشاعت کرتے رہے اور لوگوں کو اپنے راہ عمل کی ہدایت کر گئے۔

تحریک علی گڑھ

یہ تحریک گاندھی جی کی عدم تعاون و ستیہ گرہ کی تحریک نہ تھی جو کہ صرف وقتی مفاد کے لئے بروئے کار لائی گئیں تھیں بلکہ یہ ایک ہمہ گیر' علمی ادبی' ثقافتی' معاشرتی' مذہبی اور سیاسی تحریک تھی۔ جس کے اثرات بہت دور رس ہوئے۔ مسلمانوں پر جمود طاری تھا۔ ان کی حالت اس کھڑے پانی کی سی تھی جو دن بدن بدبودار ہو رہا تھا۔ اس تحریک نے انہیں سیلاب کی شکل دی ان کو قوت بخشی' ان کو خودی اور خود مختاری سکھائی۔ اسی سے اسلام کی نشاۃ ثانیہ ہوئی۔ مسلمان منتشر ہو چکے تھے۔ ان کو من حیثیت القوم اکٹھا کیا۔ جن کا مرکز علی گڑھ تھا یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر •ینکر اپنی کتاب (Survey of Indian History) میں سرسید کے بارے میں اس طرح رقمطراز ہے "سرسید کی نسبت سچائی سے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ انہوں نے نہ صرف مسلمانوں کے تنزل کو روک لیا' بلکہ ایک پشت کے اندر انہیں پھر سے ایک جلیل القدر اہمیت اور غیر مشتبہ اثر کا رتبہ دے دیا" (6) یہ اثر صرف اس علی گڑھ تحریک کا ہی تھا۔ مسلمانان ہند کی موجودہ بیداری اسی تحریک کی مرہون منت ہے آج ہمارے رجحانات وہی ہیں جو کہ علی گڑھ کے احباب کے جاری کردہ ہیں۔ اس تحریک کے بڑے بڑے علمبردار محسن الملک' شبلی' نذیر احمد' حالی اور اکبر تھے۔ جنہوں نے اپنے خیالات اور تحریرات اس تحریک کو مادیت

پرستانہ بنادیا تھا۔ سرسید نے جو اصل خواب دیکھا تھا "فلسفہ ہمارے دائیں ہاتھ میں ہوگا' نیچرل سائنس بائیں ہاتھ میں اور لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ کا تاج سر پر" شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔ ان احباب نے تاج کی پرواہ کم کردی دائیں اور بائیں ہاتھ کی زینت پر زیادہ غور کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مفکر کے تخیل نے غلط پہلو اختیار کرلیا۔ اور قوم مغربیت پرست ہو گئی۔ لیکن اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ اس تحریک کی بدولت بڑے بڑے عالم فاضل اور سیاستدان پیدا ہوئے۔ عوام کے اندر سیاسی شعور پیدا ہوا۔ عوام منتظر فردا رہنے کی بجائے اپنی کشتی کو آپ کھینچنے لگے۔ وہ قوم جو خواب خرگوش میں غرق تھی' بیدار ہونے لگی۔ اس کی مردہ رگوں میں پھر خون دوڑنے لگا۔ انہیں اپنے نیک و بد کی تمیز ہونے لگی۔ سیاسی لحاظ سے اس جگہ کو ایک بہت بڑا مرتبہ حاصل ہے۔ جیسا کہ عام مشہور ہے واٹرلو کی جنگ سکول گراؤنڈ میں جیتی گئی۔ تو اسی طرح اگر میں کہوں کہ پاکستان علی گڑھ کے میدان میں حاصل کیا گیا تو بے جا نہ ہوگا۔ یہاں تک ڈبلیو سی سمتھ بھی یہ کہنے سے نہ رہ سکا کہ "علی گڑھ پاکستان کا جذباتی سنٹر بن گیا" (7) یہاں تک کہ آج مسلمان بہت زیادہ اسی رنگ سے متاثر ہیں جو کہ علی گڑھ نے انہیں بخشا۔

کارکنان تحریک

27 مارچ 1898ء کو سرسید کی وفات کے بعد علی گڑھ کالج کی بنیادیں اکھڑتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ جس کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ 1895ء میں طلباء کی تعداد 565 ہے اور 31 مارچ 1898ء میں وہی تعداد کم ہو کر 343 رہ جاتی ہے۔ (8) اور طلباء میں بتدریج کمی ہو رہی تھی۔ سرسید' سمیع اللہ اور دیگر اکابرین کالج کی محنت اکارت جانے کا خدشہ لاحق ہو گیا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ کالج کے ٹرسٹیوں کی نظر انتخاب محسن الملک پر پڑی۔ جنہوں نے اپنی فہم و فراست' دوراندیشی و اعلیٰ کارکردگی سے پھر کالج کو مضبوط بنیادوں پر کھڑا کردیا۔

محسن الملک نواب مولوی مہدی علی خان

آپ 9 دسمبر 1837ء کو بمقام اٹاوہ پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم پرانی طرز کی تھی تعلیم سے فارغ ہو کر دس روپے کے مشاہرے پر بطور کلرک ملازم ہو گئے۔ وہ قابل اور ذہین تھے۔ ان

میں خداداد قابلیت موجود تھی۔ جس کی وجہ سے ترقی کرتے کرتے تحصیلدار ہو گئے۔ 1867ء میں ڈپٹی کلکٹری کے امتحان میں شریک ہوئے تو سب امیدواروں میں اول آئے۔ وہ یو پی میں کلکٹر تھے کہ سالار جنگ نے 1871ء میں انسپکٹر آف ریونیو مقرر کیا اور آپ حیدر آباد چلے آئے۔ یہاں محنت و فرض شناسی سے کام کیا۔ منیر نواز جنگ محسن الدولہ محسن الملک کے خطاب سے سرفراز ہوئے۔ 1893ء میں پنشن پاکر علی گڑھ چلے آئے۔ یہاں آکر سرسید احمد خان کی وہ امداد کی جس کے بارے میں الطاف حسین حالی حیات جاوید میں یوں رقمطراز ہیں:

"لیکن ایک شخص جو سرسید کے کاموں کا مددگار ہی نہ تھا۔ بلکہ اس گاڑی کے ہانکنے میں گویا برابر کا جوڑ تھا۔ اگر اس موقع پر اس کا ذکر نظرانداز کیا گیا تو ہمارے نزدیک سرسید کی کامیابی کا ایک بڑا سبب بیان کرنے سے رہ جائے گا" (9)

ان کی دیگر خوبیوں کے علاوہ سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ حلیم الطبع تھے۔ باہمی مفاہمت اور مل جل کر کام کرنے کے عادی تھے۔ لیکن یہ خوبیاں سرسید میں موجود نہ تھیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ لوگ جو سرسید کے کاموں سے متنفر رہتے تھے وہی بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے تھے اور سب مسلمان علی گڑھ کو اپنا کالج سمجھنے لگے۔ جہاں محسن الملک سرسید کے ادبی وارث بنے وہاں انہیں سیاسی وارث بھی بننا پڑا۔ اور آپ نے اپنی جانشینی کا حق ادا کیا یہاں تک کہ اردو کے مسئلے پر مولوی عبدالحق اس طرح رقمطراز ہیں:

"سرسید کی وفات کے قریب زمانے ہی میں اردو کی مخالفت کا آغاز ہو گیا تھا۔ اگرچہ سرسید کی حالت اس وقت نازک تھی تو بھی اس جوان ہمت بڈھے نے اس کے متعلق لکھا پڑھی شروع کر دی تھی۔ محسن الملک کے زمانے میں اس مخالفت نے اور زور پکڑا۔ اردو کی حفاظت اور حمایت کے لئے ایک انجمن قائم کی گئی۔ جس کا ایک عظیم الشان جلسہ لکھنؤ میں ہوا۔ اس میں نواب محسن الملک نے بڑی زبردست اور پر جوش تقریر کی۔ جس کا لوگوں پر بڑا اثر ہوا اور جوش کی ایک لہر دوڑ گئی۔ سرانٹونی میکڈانل اس وقت لیفٹننٹ گورنر تھے۔ وہ ہندی کے بڑے حامیوں میں تھے۔ انہوں نے کچھ ایسی دھمکی دی کہ نواب صاحب کو اس سے دست بردار ہونا پڑا اور انجمن ٹوٹ پھوٹ کے رہ گئی۔ ان کی یہ کمزوری نہایت قابل افسوس ہے لیکن اندیشہ یہ تھا کہ اگر انہوں نے اصرار کیا تو انہیں کالج کی سیکرٹری شپ سے سبکدوش ہونا پڑے گا۔ کالج کی

حالت اس وقت بہت نازک تھی۔ اس لئے مصلحت اس میں سمجھی کہ اردو کی حمایت سے دست بردار ہو جائیں۔ تاہم ان کی یہ کاروائی بے اثر نہ رہی"۔ (10) موج کوثر کے فاضل مصنف مولوی صاحب کے اس بیان پر معترض ہیں۔ ان کے خیال میں یہ کام بوجہ مجبوری ہوا۔ جو کہ مندرجہ ذیل ہے:

"وہ (سرانٹونی میکڈانل) بحیثیت پیٹرن علی گڑھ آئے۔ اور ٹرسٹیوں کو جمع کر کے (ہندی) کے خلاف ایجی ٹیشن پر جو اردو ڈیفنس ایسوسی ایشن کی ذریعے کی جاتی تھی۔ اپنی سخت ناراضگی کا اظہار کیا اور یہ الزام لگایا کہ ایم اے او کالج کے طلبا اس تحریک کے مناد بنائے گئے۔ نیز اساتذہ اور بعض ٹرسٹیوں اور آنرری سیکریٹری نے اس میں نمایاں حصہ لیا۔ اگر یہ طریقہ جاری رہا تو گورنمنٹ سے جو امداد کالج کو ملتی ہے۔ وہ بند کر دی جائے گی۔

بعض ٹرسٹیوں نے سرانٹونی کی خوشامدانہ تائید کی اور تمام تر الزام نواب محسن الملک پر لگایا اور اب ان کے لئے بجز اس کے کوئی چارہ کار نہ تھا کہ وہ یا تو سیکریٹری شپ سے مستعفی ہو جائیں یا اس تحریک سے۔" (11)

تذکرہ محسن میں لکھا ہے:

چنانچہ انہوں نے ان حالات کی نزاکت پر غور کر کے 26 اگست 1900ء کو ٹرسٹیوں کے جلسے میں سیکریٹری شپ سے استعفیٰ پیش کر دیا۔ (12)

اس استعفے کی خبر جنگل کی آگ کی طرح سارے ملک میں پھیل گئی۔ ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ لوگوں کو احساس تھا کہ اس نازک مرحلے پر نواب محسن الملک کے کالج سے علیحدہ ہونے کا کیا نتیجہ ہو گا۔ چنانچہ اسلامی انجمنوں نے اس مقصد سے جلسے منعقد کئے اور استعفیٰ واپس لینے کی درخواستیں کیں۔ (13) سرسید کے جو رفقا زندہ تھے انہوں نے خانگی اور ضابطہ (14) کے خطوط میں سخت اصرار کیا اور ہر قسم کا ذاتی اثر ڈالا۔ نواب وقار الملک نے اس کی واپسی پر سخت اصرار کیا۔ (15) حالی نے نواب حبیب الرحمان شروانی کو لکھا "نواب محسن الملک کو مجبور کرنا چاہیے کہ اپنا استعفیٰ واپس لے لیں ورنہ پبلک میں مدرسے کی طرف سے بہت بے چینی پیدا ہو جائے گی۔ (16) سر مزمل اللہ خان نے تو نواب صاحب کے نام ایک خط میں صورت حالات کو صاف صاف واضح کر دیا:

"سیکرٹری شپ کالج سے اس وقت حضور کا علیحدہ ہونا کالج کی موت اور قومی مصیبت ہے۔ اس کا مواخذہ حضور کے اوپر خدائے ذوالجلال کے حضور میں ضرور ہو گا۔ نیز یہ ظاہر کر دینا چاہتا ہوں کہ اگر اس وقت از خود حضور نے کالج کی سیکرٹری شپ کو چھوڑ دیا اور ہمارے اصرار و الحاح پر توجہ نہ فرمائی تو میں بھی جائنٹ سیکرٹری کے عہدے سے استعفیٰ دے دوں گا۔"

(17)

ان حالات کے تحت نواب صاحب نے استعفیٰ واپس لیا اور اردو کی سرپرستی سے دست بردار ہو گئے۔

1906ء منٹو مارلے اصلاحات کا اعلان ہوا۔ تو محسن الملک فوراً" مستعد ہوئے اور ایک وفد کا اہتمام کیا جو لارڈ منٹو کے پاس فرقہ وارانہ انتخابات کا مسلک منوانے کے لئے حاضر ہوا۔ چنانچہ ستر سربر آوردہ اراکین کا ایک وفد جناب ہنرہائنیس آغا خان کی سرکردگی میں یکم اکتوبر 1906ء کو وائسرائے کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور اپنے مقاصد میں کامیاب رہا۔

اب ان کی نظر ایک پولیٹیکل ایسوسی ایشن کے قیام پر پڑی۔ اس کے لئے جدوجہد شروع کی یہاں تک کہ 30 دسمبر 1906ء میں بمقام ڈھاکہ مسلمانوں کا ایک نمائندہ جلسہ ہوا۔ جس میں "آل انڈیا مسلم لیگ" قائم کرنے کا فیصلہ ہوا۔ اور نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک اس کے سیکرٹری منتخب ہوئے۔ (18)

نواب محسن الملک کے آخری ایام علی گڑھ کالج کی سٹرائک نے بہت مکدر کر دیئے۔ جس وجہ سے آپ کو بہت صدمہ ہوا۔ اور آپ 16 اکتوبر 1907ء کو اس جہاں فانی سے کوچ کر گئے اور علی گڑھ میں دفن ہوئے۔ مولانا حالی نے خراج تحسین پیش کرتے ہوئے نظم پڑھی:

وہ ملک کا محسن، وہ مسلمانوں کا غم خوار
سر کر کے مہم، قوم کے کام آگیا آخر!

خواجہ الطاف حسین حالی (1914-1837)

آپ 1837ء میں پانی پت میں پیدا ہوئے۔ آپ اعلیٰ پائے کے شاعر تھے۔ مسٹر سمتھ کے قول کے مطابق مسلم ہند حالی، شبلی اور اقبال کے درجہ کے عالم بہت کم پیدا کر سکا۔ حالی نے قوم

کی روحانی' ادبی اور اخلاقی اصلاح میں بڑھ چڑھ کے حصہ لیا۔ پاکستان کی تاریخ کا مورخ آپ کے کارناموں کو کبھی فراموش نہ کر سکے گا۔ آپ کی پہلی ملاقات سرسید سے دہلی میں ہوئی۔ جس کی وجہ سے آپ ان کی قابلیت' ذہانت اور خلوص کے دل سے قائل ہو گئے اور بعد میں "حیات جاوید" لکھ کر ہدیہ عقیدت پیش کیا۔ اس کے علاوہ "حیات سعدی" اور "یادگار غالب" انہیں کی تصنیف ہیں۔ سرسید نے حالی سے کہا کہ مسلمانوں کے زوال پر ایک نظم رقم کریں۔ تاکہ مسلمان خواب خرگوش سے بیدار ہو جائیں چنانچہ آپ نے "مدوجزر اسلام" یا "مسدس" 1879ء میں تحریر کی۔ جو کہ 2800 سطور پر مشتمل ہے۔ اس میں اسلام کی پوری تاریخ کو رکھ دیا گیا ہے۔ آپ کی اس نظم کو قبول عام حاصل ہوا۔ اور وہ کام جو علی گڑھ نہ کر سکا وہ مسدس نے سرانجام دیا۔ اگر علی گڑھ نے امراء و متوسط طبقے کو جلا بخشی تو اس نظم نے غربا اور اجڈ عوام کو ضیاء دی۔ انہوں نے اس کے شعروں کو پڑھا' روئے اور آنسو بہائے۔ اگر ہم یہ کہیں کہ اس نے قوم کو نئی زندگی دی تو بے جا نہ ہو گا۔ سرسید جیسا حقیقت شناس اس کے بارے میں یوں کہتا ہے "بے شک میں اس کا محرک ہوا ہوں اور اس کو میں اپنے ان اعمال حسنہ میں سے سمجھتا ہوں کہ جب خدا پوچھے گا تو دنیا سے کیا لایا ہے۔ میں کہوں گا حالی سے مسدس لکھوا لایا ہوں اور کچھ نہیں!" (19)

خالد بن سعید نے ایک جگہ کہا "ہندو اور مسلم خیالات کی کوئی دوسری دو کتابیں اتنی نمائندگی نہیں کرتیں جتنی الطاف حسین حالی کی مسدس اور بنکم چندر چٹرجی کی "انند ماتھ" جس میں بندے ماترم کا ترانہ اور ہندو قومیت کی اپیل ہے۔ اور "مسدس" مسلمانان ہند کو اپیل کرتی ہے کہ جہالت' سستی و کاہلی اور خود غرضی سے دور ہو کر ایک منظم' محنتی اور متحد قوم بنائیں۔ اس پر ایک ہندو عالم (20) رام بابو سکسینہ کا تبصرہ قابل قدر ہے۔ جو اکیلا ہی اس کو زندہ و جاوید رکھنے کے لئے کافی ہے۔ وہ اس طرح رقمطراز ہیں:۔

"مولانا کی یہ سب سے زیادہ مقبول اور سب سے زیادہ مشہور تصنیف ہے۔ یہ ایک نیا دور پیدا کرنے والی کتاب ہے۔ اس کی مقبولیت اب بھی ویسی ہے۔ جیسی کہ پہلے تھی۔ یہ ایک الہامی کتاب ہے۔ اور اس کو تاریخ ارتقاء ادب اردو میں ایک سنگ نشان سمجھنا چاہیے۔ یہ ایک نیا تارہ ہے۔ جو اردو کے افق شاعری پر طلوع ہوا۔ اس سے ہندوستان میں قومی اور وطنی

نظموں کی بنیاد پڑی۔ اور انہوں نے یہ ثابت کر دیا کہ ایسی پر اثر اور پر درد نظموں کے واسطے مسدس نہایت موزوں چیز ہے۔ اس کے بہت سے نقال پیدا ہوئے۔ مگر کوئی شخص اب تک بہ لحاظ جوش اور زور تخیل اور طرز ادا کے مولانا تک نہ پہنچا۔ اس میں اسلام کی گذشتہ عظمت مسلمانوں کے سابق کارنامے۔ ان کے بلند خیالات اور اولوالعزمیاں برخلاف اس کے موجودہ زمانہ میں ان کی پستی، زوال اور سستی و کاہلی کا ذکر ہے۔ آخر میں مسلمانوں سے اپیل کی گئی ہے کہ تاریخ عالم میں جو ان کا پہلے مرتبہ تھا۔ اب پھر اس کو حاصل کرنے کے لئے کمر ہمت باندھیں۔ یہ کتاب بوڑھے جوان، بچے سب کی دل پسند ہے۔ اس نے کاروان مسلم کے لئے بانگ جرس کا کام کیا۔ کہ اٹھیں اور آمادہ کار ہوں۔ طبع ہوتے ہی اس کی عظیم الشان اشاعت ہوئی۔ زمانہ حال کی کوئی اردو کی کتاب مقبولیت میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ ہندوستان کا ہر پڑھا لکھا مسلمان اس سے آشنا ہے۔ کچھ عرصہ ہوا یہ بہت سے لوگوں کو حفظ تھی اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ تمام قومی اچھائیوں اور برائیوں کا ایک ساتھ جائزہ لیتی ہے یعنی اچھائیاں زمانہ گزشتہ کی اور برائیاں زمانہ موجودہ کی۔ اس میں شاعر زمانہ جاہلیت کی حالت، جزیرہ نما عرب کی تمام متمدن دنیا سے انقطاعی صورت۔ عرب اقوام کا آپس میں ذرا ذرا سی بات پر لڑنا جھگڑنا، ان کا تعصب اور ناروا داری، ان کا طغیان و بت پرستی وغیرہ نہایت و صحیح واقعہ نگاری کے طریق پر دکھاتا ہے۔ اسی حالت میں پیغمبر اسلامؐ کا ظہور ہوتا ہے آپ کی تبلیغ کے ابتدائی ثمرات، اعلائے کلمہ حق، توسیع علوم، استحصال ظلم و تعصب اصلاح اخلاق اور ان خوبیوں کی نشر و اشاعت جن کے مفقود ہونے سے آج کل اہل اسلام مورد آفات ہو رہے ہیں اور جن کی کیفیت آخر کتاب میں نہایت وضاحت اور اثر سے لکھی ہے۔ اس میں اسلام کی وہ تمام بیش بہا خدمتیں بیان کی گئی ہیں جو اس نے اپنے علوم و فنون کے ذریعے سے اخلاقی و علمی دنیا میں کی ہیں پھر مسلمانوں کی تعمیر بلاد اور سیر و سیاحت کا ذکر ہے۔" (21)

(1) Pakistan the Formative phose Khalid Bin Sayeed P-3

(2) تاریخ اردو ادب مصنفہ رام بابو سکسینہ طبع اول 25 فروری 1929ء

شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی (1857 تا 1914)

جب ہندوستان کے مسلمانوں پر ظلم و ستم کا زمانہ تھا تو شبلی نے جنم لیا چاروں طرف مسلمانوں پر ظلم و تشدد جاری تھا۔ مغرب سے نفرت اپنے جوبن پر تھی جس کے نتیجہ میں آپ نے صرف مروجہ تعلیم حاصل کی اور اسی میں ید طولیٰ حاصل کیا۔ یہاں تک کہ مسٹر سمتھ تحریر کرتے ہیں "وہ موجودہ اردو ادب کی تنقید کے بانی ہیں وہ ایک شاعر اور اعلیٰ درجہ کے مورخ اور سوانح نگار تھے۔" (1) فارغ التحصیل ہو کر علی گڑھ میں ملازم ہو گئے اور قریباً" سولہ سال تک یہاں رہے مسٹر آرنلڈ سے فرانسیسی زبان سیکھی اور متشرقین کی کتابوں تک رسائی حاصل کی اور یہیں سرسید سے مستفید ہوئے بقول مولانا مہدی حسن "شبلی نے مولویت علی گڑھ میں پہنچ کر چھوڑ دی ان کے خیالات کی کایا پلٹ گئی' مذاق تصنیف اور وسیع النظری غرض یہ کہ جو کچھ ہوئے سرسید کے دامن تربیت کا اثر تھا۔ شبلی نے المامون کا دوسرا ایڈیشن جب شائع کیا ہے تو سرسید نے جس خلوص کے ساتھ اس پر دیباچہ لکھا وہ آج بھی ان کی ادبی شرافت کا پتہ دیتا ہے۔" حالات کی ستم ظریفی کہ وہی شخص جو سرسید سے مستفید ہوتا ہے ایک وقت میں آکر وہی سرسید کا مخالف بن جاتا ہے۔ اس کی مخاصمت سیاسی اور مذہبی نہیں ہے چونکہ سرسید کے سیاسی خیالات 1886ء سے واضح تھے اور ایک مدت تک آپ ان کے گن گاتے رہے اور مذہبی خیالات دونوں کے واضح ہیں لیکن پھر بھی ان میں چشمک موجود ہے جناب مہدی حسن صاحب جو کہ دونوں کے قدردان ہیں اور شبلی کو غزالیؒ اور شاہ ولی اللہ کا ہم پلہ تصور کرتے ہیں وہ اس اختلاف کا سبب شبلی کے پیچیدہ چال چلن میں تلاش کرتے ہیں "یہ دلچسپ سوال ابھی باقی ہے کہ حالی کے ہیرو (سرسید) کے ساتھ شبلی کو اس قدر چشمک کیوں ہے۔ کیا یہ جامع حیثیات شخصیت شبلی کے نامور ان اسلام کا رنگ پھیکا کرنے والی ہے؟ یا جس طرح ایک خوبصورت عورت دوسری پر کالہ آتش کو نہیں دیکھ سکتی۔

دراصل جذبہ رشک اس کی تہ میں ہے (23) ان احباب کے درمیان وجہ چشمک خواہ کچھ بھی ہو' لیکن میں اتنا کہنے پر مجبور ہوں کہ شبلی کا دل سرسید کے لئے صاف نہ تھا۔

شبلی نے تحریک پاکستان میں کوئی نمایاں کام سرانجام نہ دیا لیکن انہوں نے جو اردو کی خدمت کی وہ قابل ستائش ہے آپ نے الفاروق' المامون' الکلام' الغزالی' سیرۃ النعمان سیرۃ القرابی اور سیرۃ النبی تحریر کر کے مسلمانان ہند پر ایک بہت بڑا احسان کیا اور یہ ان کے لئے ایک

مشعل راہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ جناب اکرام صاحب ان کے رتبے کا تعین اس طرح کرتے ہیں "وہ رندوں میں رند تھے، زہادیوں میں زاہد، نثاروں میں نثار، شعراء میں شاعر، معلموں میں معلم، مورخوں میں مورخ، سیاستدانوں میں سیاس، اردو میں عشقیہ خطوط کے بانی، تعلیم میں نئی روش کے آموزگار، علمی تصنیف و تالیف کے میدان میں ہماری زبان کے سب سے بانکے شہسوار"۔ (24)

اکبر الہ آبادی

کسی چیز کی تکمیل کے لئے مخالفت کی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی کہ موافقت کی، چونکہ جوہر اصلی ہمیشہ چھان بین کا محتاج ہوتا ہے حنا کو پسنے کے بعد رنگ ملتا ہے یہاں تک کہ اقبال جیسا مفکر مخالفت کو بہت بڑی اہمیت دیتا ہے اور ابلیس کو اس کے کلام میں بہت بڑا مرتبہ حاصل ہے اور عقاب کے باد مخالف کو نیک شگون تصور کرتا ہے اسی طرح ہم اگر تحریک علی گڑھ کا سہرا سرسید کو دیتے ہیں تو اکبر کا اگر اس تحریک میں ذکر نہ کریں تو یہ ناانصافی ہو گی چونکہ یہ وہ عاشق زار ہے جس کے خون نے تحریک کو رنگ دیا تحریک کی خدائی میں ابلیس کا مرتبہ اکبر کو حاصل ہے سرسید کی مخالفت میں انہوں نے سرچوٹی کا زور لگایا یہی وجہ ہے اودھ پنچ کا ذکر کرتے ہوئے مولوی محمد یحیٰی تنہا تحریر کرتے ہیں۔ (1)

"اس اخبار کے مضمون نگاروں میں سید اکبر حسین صاحب سابق جج اور منشی جوالا پرشاد برق سابق جج خفیفہ قابل ذکر ہیں جناب اکبر کو اپنے خاص رنگ میں جو امتیاز حاصل ہے وہ محتاج تشریح نہیں اگر سرسید احمد خان اور اودھ پنچ نہ ہوتے تو سید اکبر حسین صاحب بھی شاعر نہ ہوتے سرسید صاحب کے ہر کام پر نکتہ چینی کرنا اس زمانے میں اکبر کا فرض تھا اور اس کی اشاعت کے لئے اودھ پنچ کے اوراق وقف تھے رفتہ رفتہ جناب اکبر ایک زبردست شاعر اور مسلم الثبوت استاد بن گئے۔"

اسلامی ہندوستان کی ادبی اور ذہنی تاریخ میں اکبر کو ایک اعلیٰ مقام حاصل ہے لیکن جہاں تک اصلاح کا تعلق ہے وہ دیگر احباب حالی، اقبال سے بہت ہی پست درجے پر ہیں۔ وہ قدامت پسند تھے اور مذہب کے بارے میں راسخ العقیدہ تھے۔ جناب اکرام صاحب موج کوثر میں ان کے بارے میں اس طرح اظہار خیال کرتے ہیں۔ (2)

"اکبر الہ آبادی کو ایک بلند پایہ تعمیری مفکر سمجھنا غلطی ہے وہ محض ایک ظریف اور نکتہ رس شاعر اور اپنے رنگ میں ایک سلجھے ہوئے اور پختہ کار انسان تھے لیکن اس سے ان کے کام کی اہمیت و عظمت کم نہیں ہو جاتی ایک کامیاب طنز گو شاعر بالعموم عملی مفکر یا رہنما نہیں ہوتا اس کا کام عمل کی نئی راہیں بتانا نہیں ہوتا بلکہ اپنے طریق کار کی تکمیل میں جب دوسرے رہنما حد اعتدال سے تجاوز کریں تو وہ تمسخر و تضحیک سے ان کی غلطیاں جتاتا ہے اور انہیں اعتدال پسندی کا راستہ دکھاتا ہے اکبر مرحوم نے یہی کیا اور ایک ایسے زمانے میں جب قوم کا ایک بااثر طبقہ مغرب کی رسمی اور سطحی تقلید میں بے اعتدالیاں کر رہا تھا انہوں نے اس روش کے خلاف آواز اٹھائی اور اپنے موثر طنزیہ اشعار سے اس رجحان کو روکا۔" (25)

ان کے علاوہ ذکاء اللہ صاحب (1832-1910) نذیر احمد اور وقار الملک بھی اس تحریک کے علمبردار ہیں۔ جن کی محنت شاقہ نے اس تحریک کو ضیاء بخشی۔

حوالہ جات

1- Modern Islam in India by W.C.Smith --P-7.

2- Modern Islam in India by W.C.Smith--P-8.

3- Life and Work of Sir Syed Ahmad Khan, P-125-126 By G.F.I Graham

4- Modern Islam in India by W.C.Smith--P-9.

5- The Making of Pakistan by K.K. Aziz, P-21

6- موج کوثر، مصنف شیخ محمد اکرم، صفحہ 140

7- Modern Islam in India, P-168.

8- موج کوثر، صفحہ 111

9- موج کوثر، صفحہ 113

10- موج کوثر، صفحہ 115-116

11- تذکرہ محسن از مولوی محمد امین زبیری سے موج کوثر میں، صفحہ 117

12- تذکرہ محسن از مولوی محمد امین زبیری سے موج کوثر میں، صفحہ 119

13- تذکرہ محسن از مولوی محمد امین زبیری سے موج کوثر میں، صفحہ 106

14- تذکرہ وقار از مولوی محمد امین زبیری سے موج کوثر میں، صفحہ 107

15- تذکرہ وقار از مولوی محمد امین زبیری سے موج کوثر میں، صفحہ 107

16- مکتوبات حالی، صفحہ 12

17- موج کوثر، صفحہ 119-120

18- موج کوثر، صفحہ 122

19- ذکر حالی مصنف صادق قریشی، صفحہ 13

20- Pakistan the Formative Phase, Khalid Bin Sayeed, P-3

21- تاریخ اردو ادب، مصنف رام بابو سکسینہ، طبع اول، 25 فروری 1929

22- Modern Islam in India, P-36

23- موج کوثر، مصنف اکرام صفحہ 221 تا 222

24- تذکرہ موج کوثر، صفحہ 224

25- موج کوثر، صفحہ نمبر 234

26- موج کوثر، صفحہ نمبر 220

2- اردو ہندی نزاع

اردو کسی قوم و ملک کی زبان نہ تھی۔ نہ ہی اس کا کوئی علیحدہ وجود تھا۔ دنیا کی زبانوں میں اس کا نام و نشان نہ تھا مسلمان فاتحین نے جب ہندوستان کو فتح کیا تو مکمل طور پر 712ء سے 1857ء تنزل و عروج کے ساتھ ہندوستان کے حکمران رہے ان کی اپنی زبان عربی، ترکی اور فارسی تھیں ہندوستانیوں کی زبان پراکرت یا ہندی تھی مسلمان جو روشن خیالی اور فراغ دلی اور مذہبی رواداری کا دلدادہ ہے۔ اس نے یہاں کے اصلی باشندوں کو فوج اور دیگر جگہوں پر تعین کرنا شروع کر دیا اب معاشرے کی زندگی میں جو مقام زبان کو حاصل ہے وہ قابل تشریح نہیں ہے اس لئے کسی ایسی زبان کی ضرورت محسوس ہوئی جس کے ذریعے عوام اپنا مافی الضمیر ایک دوسرے پر واضح کر سکیں۔ چنانچہ ہندو مسلم میل جول کا نتیجہ یہ ہوا کہ عربی، فارسی، ترکی، سنسکرت اور پراکرت کی آمیزش سے ایک نئی لشکری زبان نکلی جس کا نام اردو رکھا گیا۔ اردو میں ایک قابل قدر لچک ہے اور اس کی وسعت انضمام بہت زیادہ ہے اس نے سب زبانوں کے الفاظ و محاورات اپنے اندر جذب کر لئے اور ان پر اپنی مہر ثبت کر دی۔ اب یہ عام فہم شمال اور شمال مغربی ہندوستان کی زبان بن گئی جس میں تمام طبقوں کے لوگ عام بات چیت کر سکتے تھے۔

مسلمانوں کے زوال کے بعد برطانوی راج کا زمانہ آیا تو فارسی کی جگہ انگریزی سرکاری زبان مقرر ہوئی۔ دفتر اور عدالت میں انگریزی کے ساتھ ساتھ اردو میں اظہار خیال کی اجازت دے دی گئی انگریزوں نے اردو کو سیکھا اور اس کی قدر کی سکولوں میں اس کو رائج کیا اب انگریزی کی نسبت "ہندوستانی" مسلمانوں اور ہندوؤں کے لئے بہت آسان تھی دونوں نے مل کر اس کی خدمت کی اردو کے اعلیٰ نثر نگاروں اور شاعروں میں جہاں اعلیٰ پائے کے مسلمان

موجود ہیں وہاں ہندو شاعر دیا شنکر نسیم، رتن ناتھ سرشار چکبست اور نثر نگار رام بابو سکسینہ جو کہ اردو ادب کی تاریخ کے مصنف ہیں قابل ذکر اور قابل قدر ہیں۔ یہ ان شاعروں اور مصنفوں کی ہی محنت تھی کہ اردو اس قدر قلیل عرصے میں پھلی اور پھولی۔ انیسویں صدی کے آخر میں ہندوستان کے اندر سیاسی شعور پیدا کرنے کے لئے کچھ انگریز مفکروں نے ہندوستان کی سیاسی زندگی کو ہوا دینی شروع کی کہ 1885ء میں مسٹر ہیوم نے آل انڈین نیشنل کانگریس کی بنیاد ڈالی جس کا اصلی مقصد حکومت کے کاروبار کے لئے ہندوستانیوں کو تیار کرنا تھا۔ اب جو ہندو انگریز کی سرپرستی میں ایک پلیٹ فارم پر اکٹھے ہوئے تو ان کی خودی جو کہ صدیوں سے خفتہ تھی اور غلامی کے بوجھ تلے دبی تھی اسکی رگوں میں خون نے حرکت شروع کی۔ اب جیسا کہ ہندو و انگریز اسلام کے قدیم و دائم دشمن ہیں تو انہوں نے آہستہ آہستہ ان نشانات کو ختم کرنے کی ٹھانی جو کہ ان کی غلامی اور مسلمان کی حکمرانی کا ظہور تھے۔ سب سے پہلا حملہ اردو پر ہوا۔

اردو بے چاری کو سب سے پہلے جو ظلم و ستم کا نشانہ بننا پڑا وہ 1867ء کا زمانہ تھا جبکہ بنارس کے چند سربر آوردہ لیڈروں نے یہ مطالبہ کیا "دفتر اور عدالت میں (جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں دفتری زبانیں انگریزی اور اردو تھیں) اردو کی جگہ ہندی جو کہ دیوناگری رسم الخط میں لکھی جاتی تھی جگہ دی جائے" سرسید احمد خان جو کہ اس وقت بنارس میں جج تھے اس تحریک سے بہت متاثر ہوئے اور وہ یہ چیز ماننے پر مجبور ہوئے کہ ہندو اور مسلمان ایک قوم کی حیثیت سے کبھی ترقی نہیں کر سکتے اور مولانا حالی جنھوں نے کہ "حیات جاوید" تحریر کی ہے وہ اس واقعہ کو اس طرح تحریر کرتے ہیں

"یہ پہلا موقع تھا جبکہ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ اب ہندوؤں اور مسلمانوں کا بطور ایک قوم کے ساتھ چلنا اور دونوں کو ملا کر سب کے لئے ساتھ ساتھ کوشش کرنا محال ہے"۔ ان کا بیان ہے کہ "انہیں دنوں میں جبکہ یہ چرچا بنارس میں پھیلا ایک روز مسٹر شیکسپیئر سے جو اس وقت بنارس میں کمشنر تھے میں مسلمانوں کی تعلیم کے باب میں کچھ گفتگو کر رہا تھا اور وہ متعجب ہو کر میری گفتگو سن رہے تھے آخر انہوں نے کہا کہ آج یہ پہلا موقع ہے کہ میں نے تم سے خاص مسلمانوں کی ترقی کا ذکر سنا ہے اس سے پہلے تم ہمیشہ عام ہندوستانیوں کی بھلائی کا خیال ظاہر کرتے تھے میں نے کہا کہ اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ دونوں قومیں کسی کام میں دل سے شریک

نہ ہو سکیں گی ابھی تو بہت کم ہے آگے آگے اس سے زیادہ مخالفت کی بنا پر کسی کام میں دل سے شریک نہ ہو سکیں گی۔ ابھی تو بہت کم ہے آگے اس سے زیادہ مخالفت اور عناد ان لوگوں کے سبب جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں بڑھتا نظر آتا ہے جو زندہ رہے گا وہ دیکھے گا۔ انہوں نے کہا کہ اگر آپ کی یہ پیشین گوئی صحیح ہوئی تو نہایت افسوس ہے۔" میں نے کہا کہ مجھے بھی نہایت افسوس ہے مگر اپنی پیشین گوئی پر مجھے پورا یقین ہے۔" (1)

حالات نے یہ چیز ثابت کر دی ہے کہ سرسید احمد خان کی پیشین گوئی بالکل ٹھیک تھی اردو کے خلاف دوسری تحریک 27 مارچ 1898ء کو چلی جبکہ سرسید سخت علیل تھے آپ نے بستر مرگ سے حکومت اور دفاع اردو کمیٹی الہ آباد کو خطوط لکھے اور اپنی مکمل حمایت کا یقین دلایا لیکن افسوس کہ موت نے وفا نہ کی اور آپ کے اس دنیائے فانی سے چلے جانے کے بعد ہندوستانی مسلمان سیاسی طور پر یتیم ہو چکے تھے ان کا اتحاد و اتفاق ختم ہو چکا تھا اس افراتفری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہندو کے عیار دماغ نے 19 اپریل 1900ء کو اردو کے خلاف حکم جاری کرا لیا اس میں سب سے بڑا کردار سرانتھونی میکڈونل گورنر یوپی نے ادا کیا جو کہ مسلم آزار اور مسلم دشمنی میں مانے ہوئے عیسائی تھے۔ اب ہندی سرکاری اور عدالتی زبان بن گئی مسلمانوں نے تعلیمی، معاشی، قانونی اور ادبی ضروریات کے پیش نظر اس کے خلاف سخت احتجاج کیا اور حکومت کو بتایا کہ ہندو مسلم اتحاد کے راستے میں یہ سخت نقصان دہ قدم ہے لیکن بے داد حاکم نے اس پر غور نہ کی۔

ان دنوں علی گڑھ مسلمانوں کا سیاسی مرکز تھا۔ اور سرسید کے بعد محسن الملک علی گڑھ کالج کے سیکرٹری تھے چنانچہ انہوں نے ان پراگندہ حالات پر غور کرنے کے لئے 13 مئی 1900ء کو تمام مسلم اکابرین کو علی گڑھ میں جمع ہونے اور غور کرنے کے لئے جمع کیا۔ آپ نے ایک پرجوش تقریر کی جس سے لوگ بہت متاثر ہوئے اور قرارداد پاس ہوئی کہ نواب محسن الملک کی سرکردگی میں ایک اعلیٰ درجہ کا وفد سرکار انگریزی کے پاس جائے اور اپنی تکالیف کو گوش گزار کرے۔ ساتھ ہی یہ طے پایا کہ ایسے تمام کاروبار سے اجتناب کیا جائے جن کی بدولت حکومت کے دل میں شکوک پیدا ہوں"

سرانتھونی نے اس پر اظہار ناراضگی کیا لیکن محسن الملک جو کہ صحیح راہ پر تھے اور آئین کی

حدود کے اندر تھے انہوں نے اس ناراضگی کا پاس نہ لیا اور ایسوسی ایشن دفاع اردو قائم کر دی اور 18 اگست 1900ء کو لکھنؤ کے مقام پر مسلمانوں کے جم کثیر کا اجلاس ہوا یہ اجلاس سیاسی لحاظ سے اپنی نوعیت کا سب سے پہلا اجلاس تھا جس میں تمام مسلمان انگریز اور ہندو کے معندانہ رویہ کے خلاف جمع ہوئے تھے محسن الملک نے تقریر میں اپنی خطیبانہ قوت کا مظاہرہ کیا اور کہا "میرا یہ ایقان نہیں کہ حکومت ہماری زبان کو مرنے دے گی وہ اسے زندہ رکھے گی وہ کبھی نہیں مرے گی لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ دوسری طرف سے اس کو مارنے کی مسلسل جدوجہد کی جائے گی جس کی وجہ سے اس کو قریب مستقبل میں نقصان ہو گا جس خطرے کے تحت ہم اکٹھے ہوئے ہیں کہ ہم اپنی زبان کو زندہ رکھیں اگر ہم اس کو زندہ نہ رکھ سکیں تو جنازہ شان و شوکت سے اٹھائیں۔"

"عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے"

ان حالات پر سر انتھونی کو بڑا تاؤ آیا اور وہ علی گڑھ پہنچا اور یہاں کے ٹرسٹیوں کو جمع کیا اور اپنی ناراضگی کا سخت اظہار کیا اور تنبیہہ کی کہ اگر کالج کی یہی حالت رہی تو گورنمنٹ کی طرف سے جو گرانٹ کالج کو ملتی ہے وہ بند کر دی جائے گی سب نے اس کا الزام محسن الملک کے سر تھوپا اور آپ سیکرٹری شپ سے مستعفی ہو گئے۔ اس کے بعد جو اثر ہوا اس کا ذکر میں پہلے کر آیا ہوں۔" (2)

1902ء میں حالات نے پلٹا کھایا اور سر جیمس لاٹاوچ گورنر یوپی بن کر آئے وہ آزاد خیال اور روشن خیال تھے انہوں نے مسلمانوں کے احتجاج پر اردو کو اس کا اصلی مقام بحال کر دیا اس طرح قانونی طور پر اردو کو اصلی مقام تو مل گیا لیکن ہندو دماغ میں جو اس کے خلاف بیج بویا گیا تھا وہ پروان چڑھتا گیا ہر موقع و محل پر اس کا اظہار ہوتا رہا مہاتما گاندھی اور نہرو جیسے لبرل انسان بھی اس مسئلے میں پیش پیش نظر آتے ہیں۔

"ہندو اپنے تعصب کی وجہ سے ہر ایک ایسے امر کے مزاحم ہوتے ہیں جو ان کو مسلمانوں کی حکومت کا زمانہ یاد دلائے۔" فرانسیسی اور نیٹلسٹ گارساں دتاسی

حوالہ جات:

(1) حیات جاوید مصنف مولانا الطاف حسین حالی' صفحہ 163-164' طبع جدید' 1966ء' انار کلی' لاہور

(2) محسن الملک کے باب میں ملاحظہ فرمائیں۔

3- تقسیم بنگال

انگریزوں نے ہندوستان پر تسلط جمانے کے لئے سب سے پہلے بنگال کی سرزمین کو اپنا مسکن بنایا یہ علاقہ بہت زرخیز اور شاداب تھا۔ جس سے انگریزوں کو بہت آمدنی تھی۔ جوں جوں انگریزی علمبرداری ترقی کرتی گئی تو کئی علاقہ جات بنگال کے ساتھ ملا دیئے گئے یہاں تک کہ بیسویں صدی کے ابتداء میں صوبہ جات بنگال بہار اور اڑیسہ سب ایک ہی گورنر کے تحت تھے جن کی کل آبادی سات کروڑ آٹھ لاکھ تھی اور ایک وسیع رقبہ تھا اسی زمانہ میں لارڈ کرزن وائسرائے بن کر ہندوستان آئے ان کے عہد کو "طوفانی دور" کہتے ہیں انہوں نے انتظامی سہولتوں کے لئے تبدیلیاں کیں۔ 1901ء میں صوبہ سرحد کو پنجاب سے علیحدہ کر کے ایک علیحدہ صوبہ قرار دیا۔ 1902ء میں برار کے متعلق اعلیٰ حضرت شہریار حیدر آباد و برار سے جدید معاہدہ کیا خلیج فارس کے مسلمان شیوخ کو انگریزوں کے حلیف بلکہ ماتحت بنایا اب لارڈ کرزن کی نظریں بنگال پر پڑیں اور دسمبر 1903ء میں ایک تجویز پیش ہوئی کہ میمن سنگھ اور ڈھاکہ کے اضلاع علیحدہ کر کے آسام کے ساتھ ملائے جائیں اور ان کو ایک گورنر کے تحت دے دیا جائے اس تجویز پر ہندوؤں نے ہندوستانی قومیت بالائے طاق رکھتے ہوئے خوب غم و غصے کا اظہار کیا اور مخالفت کی۔

فروری 1904ء کو لارڈ کرزن نے مغربی بنگال کا دورہ کیا اور نواب خواجہ سلیم اللہ سے گفت و شنید کی اور ایک نیا صوبہ بنانے کا اظہار کیا فروری 1905ء کو اس سکیم کی تکمیل ہوئی اور سیکرٹری آف سٹیٹ آف انڈیا کی منظوری کے لئے بھیج دی گئی جس کی جلدی منظوری ہو گئی اور 19 جولائی 1905ء کو سکیم شائع کر دی گئی یہاں پر یہ امر قابل ذکر ہے کہ مسلمانوں نے نہ

کبھی تقسیم بنگال کا مطالبہ کیا تھا اور نہ ہی ان کے فائدے کے لئے یہ تجویز پیش ہوئی تھی بلکہ اس کا مقصد صرف انتظامی سہولت تھا مگر چونکہ اس سے ایک ایسا صوبہ وجود میں جاتا تھا جس میں مسلم اکثریت ہوتی تھی اس لئے سارے ہندو مخالف ہو گئے تاریخ ہند کا مورخ اس واقعہ کو اس طرح بیان کرتا ہے۔

"کرزن نے انتظامی سہولت کے مدنظر بنگال کے صوبہ کو جس میں اس زمانہ میں بہار اڑیسہ بھی شامل تھے دو حصوں میں تقسیم کر دیا مشرقی بنگال اور آسام کا ایک علیحدہ صوبہ بنا دیا مشرقی بنگال میں سے ڈھاکہ' چاٹگام اور راجشاہی کی قسمیں توڑ دیں اور انہیں آسام سے ملا کر نیا صوبہ بنا دیا گیا کرزن کا خیال تھا کہ بغیر بنگال کو دو حصوں میں تقسیم کئے ہوئے ایک ہی مرکز سے اتنے بڑے صوبے کا انتظام دشوار تھا۔ اس زمانہ میں بنگال کا رقبہ ایک لاکھ نواسی ہزار مربع میل اور آبادی سات کروڑ اسی لاکھ تھی مشرقی بنگال کے نئے صوبے کا صدر مقام ڈھاکہ مقرر ہوا اور مغربی بنگال کا صدر مقام کلکتہ بدستور برقرار رہا۔" (1)

لیکن ڈاکٹر پٹانے اسی واقعہ کو فرقہ وارانہ نمائندگی کرتے ہوئے یوں رقم کیا:

"فرقہ وارانہ نمائندگی کا سوال اندر ہی اندر جڑ پکڑ رہا تھا مگر اس نے عملی شکل لارڈ منٹو کے زمانہ میں اختیار کی لارڈ کرزن نے بھی تقسیم بنگال سے اس پالیسی کا اظہار کیا کیونکہ اس طور پر بنگال کی ہندو مسلم آبادیاں بالکل علیحدہ علیحدہ ہو جاتی تھیں۔ مشرقی بنگال اور آسام کو ملا کر خالص مسلم اکثریت کا صوبہ پیدا کرنا مقصود تھا۔" (2)

ایک دوسرے ہندو فرقہ پرست مہاراجہ منہدر چندر راننڈی جو کہ قاسم بازار کے تھے انہوں نے یوں فرمایا:

"نئے صوبے میں مسلمانوں کو افضلیت حاصل ہو گی ہندو اقلیت میں ہوں گے ہم اپنے ہی ملک میں اجنبی ہوں گے میں اپنی نسل کے مستقبل پر بہت پریشان ہوں۔"

پیشتر اس کے کہ ہم اس ساری روداد کو سناتے جائیں یہ لازمی معلوم ہوتا ہے کہ یہ جان لیا جائے کہ ہندو اس تقسیم کے اتنے خلاف کیوں ہو گئے تھے جبکہ 77.7 فیصد ہندو اکثریت کا صوبہ موجود تھا جو کہ رقبے کے لحاظ سے اس نوزائیدہ سے بہت وسیع تھا اس کی مندرجہ ذیل اہم وجوہات تھیں۔

1- ہندو تمام صوبہ کی دولت پر چھائے ہوئے تھے وہ تجارت پیشہ تھے اور مسلمان کاشتکار' وہ اپنی امارت کی وجہ سے مسلمانوں سے سود در سود کے طور پر دولت سمیٹ رہے تھے اگر مسلمان علیحدہ ہو جاتے تو ان کا ایک عام ذریعہ آمدنی بند ہو جاتا۔

2- ہندو تعلیم یافتہ تھے جس کی بدولت مسلمانوں کے مقابلے میں اعلیٰ عہدوں پر سرفراز تھے اگر مسلمان نکل جاتے تو انہیں ان اعلیٰ عہدوں کے حصول میں دقت محسوس ہوتی۔

3- مسٹر لوٹ (Lovett) ہندوستان کی قومی تحریک کی تاریخ مرتب کرتے ہوئے اس طرح رقمطراز ہیں:

"اس احتجاج کی ذمہ داری دو جگہوں پر آتی ہے ایک تو کلکتہ بار پر' چونکہ اس نے دیکھا کہ نئے صوبے کے وجود میں آنے سے کلکتہ ہائی کورٹ کو نقصان پہنچے گا چونکہ اس کے مقابلہ میں ڈھاکہ ہائی کورٹ وجود میں آجائے گی دوسرے کلکتہ کے مقامی اخبار تھے وہ ڈر گئے کہ نئے صوبے کی وجہ سے لوگ کلکتہ کی بجائے ڈھاکہ کے اخبارات کی طرف راغب ہوں گے چنانچہ ان دونوں طبقوں نے خوب شور مچایا۔"

4- سب سے اہم وجہ یہ ہوئی کہ ہندو' ہندوستان میں ہندو راج کا خواب دیکھ رہے تھے تو انہوں نے گربہ کشتن روز اول کے مصداق اس پہلی تحریک کو ہی کچلنا شروع کر دیا کہ اس طرح مسلمانوں میں شعور آزادی پیدا ہونے اور برابر کی سطح پر آنے کا خطرہ لاحق تھا۔

رد عمل:۔ ہندوؤں نے اس تقسیم کے خلاف دل کھول کر احتجاج کیا۔ اور جلوس نکالے۔ سندر ناتھ بینرجی ان جلوسوں کے کرتے دھرتے تھے لوگوں کو یہ تسلیم کرایا گیا کہ تقسیم "کالی ماتا" کی توہین ہے اسی زمانہ میں "بندے ماترم" کا گانا ہر سکول اور پبلک جلسہ میں گایا جانے لگا مسلمان بچوں سے مورتی کی پوجا کرائی جانے لگی مسلمانوں پر ظلم و تعدی کے پہاڑ ٹوٹ پڑے جس سے ایک ہندو مورخ بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور رقمطراز ہوا:۔

"بنگال میں اور ملک کے دوسرے حصوں میں حکومت کے خلاف دہشت انگیزی کی وارداتیں ہونے لگیں مسلمانوں کا قتل و غارت عام ہوا' حکومت کو برباد کرنے کے لئے سازشوں کا بازار گرم ہو گیا بعض نوجوان بنگالی شدید جرائم کے مرتکب ہوئے اور بعض بڑے افسروں کو قتل کر ڈالا سودیشی تحریک کی بھی اسی زمانہ میں ابتداء ہوئی اور غیر ملکی اشیاء کا بائیکاٹ

کیا گیا۔ (3)

ہندو مسلم فسادات:۔ تاریخ کا طالب علم ہندوؤں کو آہنسا کا پوجاری یاد کرتا ہے لیکن بعض دفعہ ان کے مظالم ہلاکو و چنگیز خان کے مظالم کو شرمندہ کر دیتے ہیں۔

اب جو انہوں نے مسلمانوں کے خلاف زہر اگلنا اور سودیشی تحریک کا چلانا شروع کیا تو دونوں چیزوں کا نشانہ یہ کمزور اور نہتے مسلمان بنے اور ان کا خوب قتل و غارت کیا گیا۔

لیکن افسوس جس ہما کی خاطر مسلمانوں نے اس قدر قربانیاں دیں اور اپنے خون سے اس کی حفاظت کی وہ انگریز کی قدیم مسلم کش پالیسی اور ہندو نوازی کی نظر ہو گئی اور 12 دسمبر 1911ء کو دربار دہلی میں جارج پنجم نے اپنی رسم تاج پوشی کے وقت اس تقسیم کو ختم کر دیا جس پر تنقید کرتے ہوئے نواب وقار الملک نے لکھا "حکومت کی یہ پالیسی بمنزلہ ایک توپخانہ کے تھی جو مسلمانوں کی مردہ لاشوں پر سے گزر گیا بدوں اس احساس کے کہ ان غریب لاشوں میں سے کسی میں کچھ جان بھی ہے اور ان کو کوئی تکلیف محسوس ہو گی۔" (4)

1- لارڈ کرزن کے بعد لارڈ منٹو ہندوستان کے گورنر جنرل مقرر ہوئے تو ان حالات کے پیش نظر ایک وفد جو کہ مسلمانان ہند کے 35 سربر آوردہ حضرات پر مشتمل تھا یکم اکتوبر 1906ء کو بمقام شملہ پیش ہوا اور ایک ایڈریس دیا جس میں مندرجہ ذیل تین نکات پر زور دیا گیا۔

1- مسلمان اپنی روایات، رسوم، عقائد اور مفادات کے اعتبار سے بالکل علیحدہ قوم ہیں۔

2- جدید قسم کے جمہوری اداروں کو ہندوستان میں اس احتیاط سے رواج دینا چاہئے کہ ہمارے قومی اغراض کا سیاہ و سفید کسی دوسری جماعت کے ہاتھوں میں نہ پڑ جائے۔

3- مخلوط طریقہ انتخاب کے ذریعہ ایک مسلمان کسی ادارہ میں صرف اسی وقت داخل ہو سکتا ہے جبکہ وہ بالکلیہ اکثریتی جماعت کی ماتحتی قبول کرے اس لئے مسلمانوں کو اپنے نمائندے خود منتخب کرنے کا اختیار ملنا چاہئے۔

2- نواب وقار الملک اور نواب سلیم اللہ کی کوششوں سے دسمبر 1906ء کو "آل انڈیا مسلم لیگ" کی بنیاد رکھی گئی۔

3- مسلمان تعلیم کی طرف راغب ہو گئے چونکہ وہ ہندو ذہنیت کو جاننے لگے تھے۔

4- مسلمانوں کے اندر تقسیم کی چنگاری سلگتی رہی اور آخر 14 اگست 1947ء کو صرف چھتیس

(36)سال بعد پھر بنگال تقسیم ہو گیا جو کہ پاکستان کا برابر کا حصہ ہے۔

حوالہ جات

1- تاریخ ہند' مولفہ ایشور ناتھ ٹوپا' مطبوعہ 1944ء' صفحہ 258
2- تاریخ کانگریس' مولفہ ایشور ناتھ ٹوپا' مطبوعہ 1944ء' صفحہ 75
3- تاریخ کانگریس' مولفہ ایشور ناتھ ٹوپا' مطبوعہ 1944ء صفحہ 75
4- حیات قائداعظم' مصنف سردار محمد خان عزیز' صفحہ 62

4- آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام

واعتصمو بحبل اللہ جمیعا ولا تفراقو ○

وجود افراد کا مجازی ہے' ہستی قوم ہے حقیقی
فدا ہو ملت پہ' یعنی آتش زن طلسم مجاز ہو جا
یہ ہند کے فرقہ ساز اقبال آذری کر رہے ہیں گویا
بچا کے دامن بتوں سے اپنا غبار رہ حجاز ہو جا
اقبالؒ

پچھلے باب میں اس چیز پر سیر حاصل بحث ہو چکی ہے کہ ہندوؤں نے کس طرح ہندو ذہنیت کا مظاہرہ کیا۔ مسلمانوں کے گھر بار کو لوٹا' ان کی عزت و ناموس کی بے حرمتی کی' قتل و غارت کا بازار گرم کیا' اس سب کارروائی میں ایک عام ہندو سے لے کر مڑگو کھلے تک پیش پیش نظر آتے ہیں کانگرس جو کہ ہندوستانیوں کی نمائندگی کا دعویٰ کرتی تھی صرف ہندو جماعت ظاہر ہونے لگی۔ مسلمان سیاست کے ایسے بیکران سمندر میں تھے جن کے پاس کوئی چپو اور کشتی نہ تھی وہ ہوا کی موجوں کے سہارے بے مقصود بڑھ رہے تھے اب جو وہ کانگرس پر بھروسہ کئے تھے وہ مار آستیں نکلی۔ مسلمان بے یارومددگار ہو کر رہ گئے۔ ان کے لئے نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن والی حالت تھی لیکن جیسے کہ اقبال نے فرمایا ہے "ذرا سی نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی" کے مترادف قدرت نے ان کی زرخیزی سے کام لینے کے لئے نواب وقار الملک' جناب آغا خان' جناب سلیم اللہ اور جناب امیر علی صاحب کو نمی کا کام سونپا۔ جنھوں نے قوم کو

ایک راہ پر لگانے کیلئے قوم کی رہنمائی کیلئے اور قوم کی بہبود کیلئے دسمبر 1906ء میں ڈھاکہ کے مقام پر ایک اجلاس بلانے کا فیصلہ کیا دسمبر کے پہلے ہفتے میں نواب وقار الملک کی صدارت میں اجلاس ہوا اور "آل انڈیا مسلم لیگ" کی بنیاد پڑی (1) اس میں دو کٹر مسلم قوم پرستوں ــــــ سید حسن امام اور مظہر الحق ــــــ نے بھی اس امید پر شرکت کی کہ نئی تنظیم کی ابھرتی ہوئی فرقہ پرستی اور قدامت پسندی کو ختم کیا جائے قوم کے ترقی پسند عناصر نے لیگ کی طرف سے لاپرواہی برتی۔(2) اس جماعت کے اغراض و مقاصد مندرجہ ذیل قرار پائے۔

1- مسلمانان ہند کے دل میں برٹش سرکار کیلئے وفادارانہ خیالات کو ترقی دینا اور گورنمنٹ کی کسی کارروائی کے متعلق ان میں جو غلط فہمی پیدا ہو جائے اسے دور کرنا

2- مسلمانان ہند کے سیاسی حقوق اور مفاد کا تحفظ کرنا اور ان کی ضروریات اور مطالبات کو مودبانہ طریقہ سے گورنمنٹ کے سامنے پیش کرنا۔

3- لیگ کے اغراض و مقاصد کا پورا پورا تحفظ کرنا اور مسلمانان ہند میں دوسری قوموں کی نسبت معاندانہ خیالات کی پرورش کو روکنا۔

لیگ کے ان اغراض و مقاصد پر سرسری نظر ڈالنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ جماعت ایک خاص اصلاحی پروگرام لے کر آگے بڑھی اور ہندوؤں کی نسبت معاندانہ خیالات سے یکسر پاک تھی۔ علاوہ ازیں لیگ نے یہ قرارداد پاس کر کے ان کے پیش نظر صرف مسلمانان ہند کے حقوق کا تحفظ کیا یک قلم یہ فیصلہ کر دیا تھا کہ مسلمان ایک الگ قوم ہیں اور انہیں ہندوؤں کی اکثریت میں خواہ مخواہ مدغم کرنے کی غیر منصفانہ اور بے ایمانہ کوشش صرف ایک سیاسی شرارت ہے۔

مسلمان تاج برطانیہ کے وفادار رہنا چاہتے تھے اس کی دو وجوہ تھیں ایک تو اس وقت تقسیم بنگال کی وجہ سے مسلمانوں کو کافی سہولتیں میسر آگئی تھیں اور جو وفد یکم اکتوبر 1906ء کو جداگانہ انتخابات کے حصول کے لئے لارڈ منٹو کی خدمت میں حاضر ہوا تھا اس کو کامیابی نصیب ہوئی تھی۔ دوسرے مسلمانوں کی حالت بہت پتلی تھی اکثر مسلمان مفاد پرستانہ نظریہ کے مالک تھے کانگرس پورے ملک پر چھائی ہوئی تھی مسلمان اسی صورت ترقی کر سکتے تھے کہ وہ حکومت کے وفادار رہتے ورنہ ان کی یہ حالت ہوتی کہ بیٹھے ہی نہ تھے کہ اٹھا دیئے گئے۔

مسلمانوں کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو اس سیاست کے منجدھار سمندر میں ایک چپوار ہاتھ لگ گیا عوام نے اس کو سینے سے لگالیا یہاں سے ان کی سیاسی زندگی کا آغاز ہوا قوم نے فلاح کی راہ اختیار کرنی شروع کردی جس کی وجہ سے مسلم لیگ کو کافی ترقی ہوئی یہاں تک کہ ہندوستان کے ہونہار سیاستدان جناب محمد علی جناحؒ 1913ء میں اس میں شریک ہو گئے جنہوں نے قوم کی باگ اپنے ہاتھ میں لی اور حوادثات زمانہ اور مشکلات قاہرانہ کا مقابلہ کرتے ہوئے رواں دواں چلتے گئے اور آخر میں منزل کو جالیا۔

حوالہ جات

(1)Pathway to Pakistan by Chaudhry Khaliquzzaman, P-12

(2)Modern Islam in India by W. C. Smith, P-277

منٹو مارلے اصلاحات

1892ء سے 1909ء کا زمانہ تاریخ ہند میں بہت نازک زمانہ تھا۔ ملک سیاسی طور پر بیدار ہو رہا تھا کانگرس انتہا پسند لیڈروں کے زیر اثر تھی۔ ہندو مسلم فساد جوبن پر تھے۔ ملک میں دہشت انگیزی عام پھیل رہی تھی تقسیم بنگال کی وجہ سے سیاسی حلقوں میں ہیجان پیدا ہو گیا تھا۔ مسلمان اپنی ہستی کو خطرے میں دیکھ کر تگ ودو کرنے لگے تھے۔ مسلم لیگ وجود میں آچکی تھی اور اس نے مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کا بیڑا اٹھالیا تھا۔

1905ء میں انگلستان میں لبرل پارٹی برسر اقتدار آئی اور مسٹر مارلے وزیر ہند مقرر ہوئے ان کے ایما پر گورنر جنرل منٹو نے اصلاحات سے متعلق تجاویز پیش کیں جنہیں برطانوی پارلمان نے منظور کیا اور حکومت برطانیہ نے قانون کی شکل دی یہ گورنمنٹ انڈیا ایکٹ 1909ء کہلایا عرف عام میں انہیں منٹو مارلے اصلاحات کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

دفعات:۔ اس کی مندرجہ ذیل دفعات تھیں۔

1- قانون ساز کونسلوں کے اراکین کی تعداد بڑھا دی گئی۔ زائد اراکین کی تعداد گورنر جنرل کی کونسل میں زیادہ سے زیادہ 60 اور صوبائی کونسلوں میں زیادہ سے زیادہ 50 کر دی گئی۔

2- اراکین میں سے کچھ منتخب تھے اور کچھ حصہ نامزد، منتخب اراکین کیلئے میونسپلٹیاں، ڈسٹرکٹ بورڈ، یونیورسٹیاں، چیمبرز آف کامرس، زمیندار وغیرہ انتخابی حلقوں کا کام دیتے تھے۔

3- کونسل کے اراکین کے اختیارات میں اضافہ کر دیا گیا۔ وہ بجٹ پر بحث کے دوران قراردادیں پیش کر سکتے تھے اور ضمنی سوالات پوچھنے کے مجاز تھے۔

4- جداگانہ انتخاب کا اصول تسلیم کر لیا گیا اور مختلف قومیں اپنے اپنے نمائندے خود منتخب کرنے لگیں۔

5- گورنر جنرل اور صوبوں کی انتظامیہ (Executive) کونسلوں میں ایک ایک ہندوستانی رکن اور وزیر ہند کی کونسل میں دو ہندوستانیوں کا تقرر ہوا۔

تبصرہ:۔

یہ اصلاحات ظاہرہ طور پر تو کوئی خاص اہمیت کی حامل معلوم نہیں ہوتیں چونکہ بنیادی نظام حکومت میں کوئی تبدیلی نہ آئی آئینی حکومت بنانے کی ناکام کوشش کی گئی۔ ووٹ کا حق معدود تھا' مقننہ 'انتظامیہ کا آلہ کار تھی اور اس کے پاس کوئی مالی اختیارات نہ تھے۔ یہ ایک قسم کی (Aristocracy) آرسٹوکریسی تھی۔ مسٹر زنک (H-Zink) اس کے بارے میں یوں رقمطراز ہے:

"1909ء کے ایکٹ کے تحت مقننہ بہت محدود عمل کر سکتی تھی اور مزید برآں یہ مختلف معاملات پر بحث کر سکتی تھی قراردادیں پاس کر سکتی تھی اقتصادی اور دوسرے معاملات میں سفارشات کر سکتی تھی۔ گورنر جنرل انہیں منظور کر سکتا تھا یا رد کر دیتا۔ اس پر کسی قسم کی پابندی نہ تھی المختصر وہ ہندوستانیوں کی نظر میں اپنی خواہشات کا پابند تھا۔"(3)

جداگانہ انتخابات کو تسلیم کرا لینا مسلمانوں کا ایک بہت بڑا کارنامہ تھا۔ یہی وہ اصول ہے جس کی بنا پر بعد میں مسلم قومیت کو تسلیم کیا گیا اس کی منظوری کی وجہ سے مسلم لیگ کو بہت

تقویت ملی۔ اس کی وجہ سے مسلمانوں میں اتحادی روح نے جنم لیا۔

حوالہ

Modern Government by H.Zink Page 742 Second Edition 1962

6- عالم اسلامی اور ہندی مسلمان

منٹو مارلے اصلاحات میں ایک حد تک کامیابی اور اردو ہندی نزع، تقسیم بنگال کے مسئلہ میں ہندوؤں کی روش کے باعث مسلمان کانگرس سے عملاً" بیزار اور انگریزی حکومت پر اعتماد کرنے لگے تھے جیسا کہ مسلم لیگ کی قراردادوں سے ظاہر ہے لیکن یہ مسلمان کی بھول تھی۔ وہ صرف ریت کے محل تیار کر رہا تھا وہ صلیب و ہلال کی جنگیں بھول گیا تھا۔ وہ سپین کا عبرت نامہ فراموش کر گیا۔ انگریز کی مسلم دشمنی اس کی آنکھوں سے اوجھل ہو گئی لیکن 1911ء اور اس کے بعد کچھ ایسے واقعات پیش آئے کہ مسلمانوں کا اعتماد متزلزل ہو گیا۔ وہ کٹے پر پریشان ہونے لگا۔ ملت کو احساس زیاں ہونے لگا۔

12 دسمبر 1911ء کو تاجپوشی کا دربار منعقد ہوا اور ملک معظم نے اس دربار میں تقسیم بنگال کی تنسیخ کا اعلان کیا جن پہ بھروسہ تھا وہ مارے آستیں نکلے کے مترادف یہ اعلان مسلمانوں کے اعتماد پر برق بن کر گرا۔ تاج برطانیہ نے ہندو بنیوں کو گھی کے دیئے جلانے کا موقع دیا کانگرس نے اعلان مسرت کیا اور مسلم لیگ نے 1912ء کے سالانہ اجلاس میں اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کیا لیکن جہاں باڑ جس کا کام فصل کی حفاظت ہوتا ہے فصل کو کھانا شروع کر دے تو بیچاری فصل کیا کرے! بعینہ مسلمانوں کی آواز نقار خانے میں بلند ہو کر ختم ہو گئی۔

اسی زمانہ میں اسلامی ممالک میں کچھ ایسے حالات رونما ہوئے جس کی وجہ سے مسلمانان ہند بددل ہو گئے انگلستان میں ترکی و ایران کے جدید نظام دستوری کی درپردہ مخالفت کی جانے لگی۔ ادھر روس جاپان سے شکست کھانے کے بعد برطانیہ کے دامن میں جا بیٹھا۔ اس سے ترکی و ایران کے لئے ایک خطرہ پیدا ہو گیا 1911ء میں طرابلس کی جنگ چھڑ گئی جس میں کئی

ترک شہید ہوئے' اطالیہ نے طرابلس ترکی سے چھین لیا شمالی ایران میں روس نے مسلمانوں کے ساتھ بہیمانہ برتاؤ شروع کر دیا اور مشہد مقدس میں حضرت امام رضاؓ کے مزار پر گولہ باری کی۔ 1912ء میں جنگ بلقان کا آغاز ہوا اس کی وجہ یہ ہوئی کہ بلقان کی عیسائی ریاستوں نے جو کہ عرصہ سے ترکوں کے ماتحت تھیں ترکوں کی حالت کو کمزور پاتے ہوئے علم بغاوت بلند کیا۔ جنگ بلقان کے اختتام پر ترکی میں صلح کانفرنس ہوئی لیکن اتحادی ایڈریانوپل پر ترکی کے قبضہ کو تسلیم کرنا نہیں چاہتے تھے ترکوں کا یہ مطالبہ تھا کہ ایڈریانوپل کے علاقہ مقدونیہ والبانیہ کے علاقوں کو بھی ترکوں کے ماتحت رکھا جائے لیکن اتحادی اس مطالبہ کے بالکل خلاف تھے ادھر یونان و ترکی میں جنگ جاری تھی۔ ایڈریانوپل میں ترکوں کو شکست ہوئی البانیہ میں مسلمانوں کا قتل عام ہوا اور مقدونیہ میں مسلمانوں پر مظالم توڑے گئے۔ اب مراکش و طرابلس ترکوں کے ہاتھ سے نکل چکے تھے۔ 20 مئی 1913ء کو ترکی اور بلقان میں صلح ہوئی لیکن ترک اس صلح سے مطمئن نہ تھے انہوں نے ایڈریانوپل کو پھر فتح کر لیا لیکن برطانیہ نے ان کے قبضہ کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔

ترکی کی اس شکست نے تمام مسلم دنیا میں صف ماتم بچھادی تھی اور مسلمان آنے والے خطرات سے پوری طرح آگاہ ہو چکے تھے۔ ترکی کی شکست ایک تازیانہ عبرت تھی جس سے ساری دنیا کے مسلمانوں میں اخوت کے جذبات میں ایک نئی روح آگئی تھی اور ہر جگہ محسوس کیا جانے لگا کہ ہندوستانی مسلمان اپنی زندگی کا ثبوت دیں اور ہر ممکن کوشش سے اپنے ترک بھائیوں کی مدد کریں اسی زمانہ میں مولانا شوکت علی نے "انجمن خدام کعبہ" کی بنیاد ڈالی۔ مولانا ابو الکلام آزاد نے "الہلال" کلکتہ سے جاری کیا اور مسلمانوں میں صحیح سیاسی شعور بیدار کرنے میں ناقابل فراموش خدمات انجام دیں مولانا محمد علی اپنا انگریزی اخبار "کامریڈ" کلکتہ سے دہلی لے آئے اور مسلمانوں میں سیاسی بیداری پیدا کرنے میں سب سے نمایاں حصہ لیا مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے طلباء نے اپنے اخراجات کم کئے اور چندہ کی صورت میں ترکی بھیجتے رہے اس بین الاقوامی اخوت کا سب سے زبردست ثبوت ڈاکٹر مختار احمد انصاری نے دیا جو 1912ء میں مشہور و معروف طبی مشن لے کر ترکی پہنچے اور چھ ماہ تک اپنے بھائیوں کی خدمت سرانجام دیتے رہے اس زمانہ کا سب سے بڑا کارنامہ حکیم ملت جناب محمد اقبال و طنیت سے گذر کر ملت

کے مسکن میں آ بسے "حرم" کو چھوڑ کر "نیا شوالہ" بنانے والا حرم کی طرف لوٹ آتا ہے۔ ترانہ ہندی کہنے والا "ترانہ ملی" کہتا ہے اب اقبال "تہذیب حجازی کے مزار" پر ماتم کناں ہے۔ اقبالؔ اپنے بنائے ہوئے "صنم" کو خود ہی توڑ دیتا ہے اور ملت پر فدا ہونے لگتا ہے:

وجود افراد کا مجازی ہے ہستی قوم ہے حقیقی
فدا ہو ملت پہ یعنی آتش زن طلسم مجاز ہو جا
یہ ہند کے فرقہ ساز اقبال آذری کر رہے ہیں گویا
بچا کے دامن بتوں سے اپنا غبار راہ حجاز ہو جا

اب وہ اپنے کارواں کی تسکین "میر حجاز" کی سالاری میں پاتا ہے۔ ع

سالار کارواں ہے میر حجاز اپنا
اس نام سے ہے باقی آرام جاں ہمارا

اس زمانہ میں اس کی سب سے مشہور نظم "شکوہ" اور "جواب شکوہ" ہے یہ شکوہ کوئی گستاخ کی شکایت نہیں ہے خوگر حمد کا گلہ ہے شکوہ ارباب وفا ہے وہ اللہ کے سامنے مسلمانوں کے وہ تمام کارنامے جو کہ انہوں نے اللہ کے نام کو سربلند کرنے کے لئے انجام دیئے گناتے ہیں اور کہتے ہیں:

ہم جو جیتے تھے تو جنگوں کی مصیبت کیلئے
اور مرتے تھے تو ترے نام کی عظمت کیلئے

یہ مسلمان ہی تھے جو کہ اللہ کے پیغام یعنی کہ مئے توحید کے جام کو لے کر ہر گلی اور ہر کوچے میں پھرے۔ دشت و جبل میں خیمہ زنی کی لیکن آج ان کو اس خدمت عظمیٰ کا صلہ کیا مل رہا ہے۔

بت صنم خانوں میں کہتے ہیں مسلمان گئے
ہے خوشی ان کو کہ کعبے کے نگہبان گئے
منزل دہر سے اونٹوں کے حدی خوان گئے

اپنی بغلوں میں دبائے ہوئے قرآن گئے

اسی نظم میں شاعر اغیار کی مست مئے پنداری دکھاتا ہے ان کے خزانے معمور بتاتا ہے ان کے حور و قصور کی فراوانی بتاتا ہے اور پلٹ کر خدا سے سوال کرتا ہے:

کیوں مسلمانوں میں ہے دولت دنیا نایاب
تیری قدرت تو ہے وہ جس کی نہ حد ہے نہ حساب
تو جو چاہے تو اٹھے سینہ صحرا سے حباب
رہر و دشت ہو سیلی زدہ موج سراب
طعن اغیار ہے رسوائی ہے ، ناداری ہے
کیا تیرے نام پر مرنے کا عوض خواری ہے

اور اسی درد انگیز لہجے میں اللہ سے دعا کرتا ہے:

اپنے پروانوں کو پھر ذوق خود افروزی دے
برق دیرینہ کو فرمان جگر سوزی دے

فروری 1912ء میں اپنی مشہور عالم نظم "شمع و شاعر" لکھی اور ملت کے رستے ہوئے زخموں کو چھیڑا۔ جون 1912ء میں انہوں نے "مسلم" کے عنوان سے ایک نظم لکھی اور مسلمانوں کو "فتح امید" کی خوشخبری دی۔ "حضور رسالت میں" اور "فاطمہ بنت عبداللہ" بھی اسی زمانہ کی یادگار ہیں۔ فاطمہ ان کے نزدیک ایک عرب دوشیزہ ہی نہیں تھی بلکہ وہ آبروئے ملت مرحوم ہے۔ چشم شاعر کو فاطمہ کی تربت میں آثار حیات نظر آتے ہیں:

ہے کوئی ہنگامہ تیری تربت خاموش میں
پل رہی ہے ایک قوم تازہ اس آغوش میں
بے خبر ہوں اگرچہ ان کی وسعت مقصد سے میں
آفرینش دیکھتا ہوں ان کی مرقد سے میں

اب مسلمانوں کے انداز فکر میں ایک زبردست تغیر پیدا ہوا اور آئندہ پروگرام پر غور و

فکر کرنے کیلئے ایک کمیٹی بنائی گئی سید وزیر حسن اس وقت لیگ کے سیکرٹری تھے انہوں نے ایک گشتی مراسلہ کے ذریعے بڑے بڑے مسلم مدبرین سے تبادلہ خیال کیا اور فیصلہ کیا کہ آئندہ اجلاس میں حکومت خود اختیاری اور ہندوؤں سے تعاون میں اضافہ کیا جائے۔ 1912ء میں لکھنؤ میں آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس سر میاں محمد شفیع کی صدارت میں ہوا اور مندرجہ ذیل قراردادیں پاس ہوئیں: (1)

1- "آل انڈیا مسلم لیگ کو پورا یقین ہے کہ ہندوستان کی ترقی اور مفاد کا انحصار یک جہتی اور دوسری قوم کے ساتھ پورے تعاون پر ہے امید کی جاتی ہے کہ دونوں قوموں کے لیڈر کبھی کبھی ایک جگہ مجتمع ہو کر پبلک مفاد کے لئے کوئی پروگرام مرتب کیا کریں گے۔"

2- حکومت برطانیہ کی سرپرستی میں مناسب حال سلف گورنمنٹ حاصل کی جائے۔"

اس اجلاس میں دیگر اکابرین کے ساتھ قائداعظم محمد علی جناحؒ کو خاص طور پر مدعو کیا گیا تھا اور جیسا کہ اس کے اولین ریزولیوشن سے ہندو مسلم اتحاد کی بو آتی ہے وہ اسی ہندو مسلم اتحاد کے شیدائی کے کارہائے نمایاں کا ثمر تھا۔ کانگریسی حلقوں میں ان قرارواد کا گرم جوشی سے خیر مقدم کیا گیا یہاں تک کہ مسٹر سید محمود کانگریسی صدر نے لیگ کے اس تازہ اقدام پر اظہار مسرت کرتے ہوئے کہا: (2)

"میں اپنے دوست مسٹر وزیر حسن کے خیالات کی تائید کرتا ہوں کہ ہماری مشترکہ ملکی ترقی کا انحصار صرف ہمارے اتحاد پر ہے مجھے معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ لیگ کی یہ تازہ پالیسی چند وقتی اور عارضی وجوہات کی وجہ سے معرض وجود میں نہیں آئی بلکہ یہ ان حالات کا تقاضا ہے جو بار بار ہمیں اپنے فرائض اعلیٰ اور حب الوطنی کی طرف بلا رہے ہیں۔"

اسی عرصہ میں قائداعظمؒ ولایت چلے گئے اور وہاں پر مولانا محمد علی اور مسٹر وزیر حسن نے اپنی کوششوں سے مسٹر محمد علی جناح کو 1913ء میں مسلم لیگ کا ممبر بنالیا۔ (3) اس مستحسن قدم سے مسلم لیگ اور کانگرس جماعتیں بہت قریب ہو گئیں چنانچہ دسمبر 1913ء میں کانگریس کے کراچی کے جلسہ میں حد درجہ دوستانہ تعلقات اور اتحاد کا مظاہرہ ہوا مسلم لیگ کے حکومت خود اختیاری کے ریزولیوشن کا بہت گرم جوشی سے خیر مقدم کیا گیا بھوپندر ناتھ باسو نے اسی موقع پر کہا:

"ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک متحدہ نصب العین کی طرف قدم بڑھانا چاہئے کیونکہ اب ہندوستان نہ تو ہندوؤں کا ہے اور نہ ہی مسلمانوں کا بلکہ سب کا ہے اور ہر ایک کا اس میں حصہ ہے ہمیں چاہئے کہ ہم اپنی پرانی غلط فہمیاں بھول جائیں اور ایک ہو جائیں۔ اگر ہماری متحدہ کوششیں جاری رہیں تو ہمارا مستقبل کا ہندوستان اشوک اور اکبر کے ہندوستان سے بھی زیادہ سنہری دور پیش کرے گا۔"

اسی زمانہ میں کانپور میں مچھلی بازار والی مسجد کا واقعہ پیش آیا جہاں سڑک بنانے کیلئے مسجد کا ایک حصہ شہید کر دیا گیا تھا حکومت کے اس غیر مہذبانہ فعل پر مسلمانوں میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ مسلمان جب اس منہدم شدہ حصے کی اینٹیں اکٹھی کرنے لگے تو ظالم انگریز نے ان پر گولی چلا دی ہندوؤں نے اس موقع پر مسلمان بھائیوں کا ساتھ دیا اس طرح ہندوؤں اور مسلمانوں میں اخوت کے جذبات اور بڑھ گئے۔

جنگ عظیم اول 1914ء تا 1918

جب ہندوستان میں ہندو و مسلمان اس طرح شیر و شکر ہو رہے تھے یورپ میں جنگ چھڑ گئی یہ جنگ جرمنی اور اتحادیوں کے درمیان ہوئی جو کہ یورپ کی تاریخ میں یہ سامراجی جنگ مشہور ہے۔ ہندی مسلمانوں کی بدقسمتی یہ ہوئی کہ ترکی نے جرمنی کا ساتھ دیا اور یہاں انگریز حکمران تھا جس کی بدولت مسلمانوں کو اپنے آقا کی حفاظت کرنی پڑتی تھی۔ دوسری طرف اسلامی اخوت انہیں مجبور کرتی کہ وہ مسلمانان ترکی کی امداد کریں جو کہ اس وقت ایک حکومت ہی نہ تھی بلکہ مسلمانوں کی ایک خلافت تھی۔ خلیفہ کی حفاظت ہر مسلمان کا فرض تھا اس کے نتیجے میں مسلم لیگ نے قرارداد پاس کی کہ مسلمانوں کو ترکوں کے خلاف استعمال نہ کیا جائے لیکن اس کی بہت کم شنوائی ہوئی۔ مسلمانان ہند میں اضطراب پھیل گیا مسلمان انگریز کی مسلم دشمن پالیسی کی بدولت نالاں رہنے لگے مولانا آزاد کا "الہلال" مولانا ظفر علی خان کا "زمیندار" اور مولانا محمد علی کا "کامریڈ" ان کی زبان بن کر سامنے آئے۔ پنجاب میں غدر تحریک (1914ء تا 1915) ہوم رول لیگ کا اجراء' گاندھی جی ستیہ گرہ (Satya Garha) کی تحریک اور سودیشی تحریک نے انگریز کو بوکھلا کے رکھ دیا۔ 1917ء میں بدنام زمانہ رولٹ کمیشن ملک کی

انقلابی تحریکات کا جائزہ لینے آیا ان تحریکات کو کچلنے کے طریق کار کی رپورٹ تاج برطانیہ کو دی جس کی وجہ سے انگریز نے گولی اور قید و بند کا رواج عام کر دیا ہزاروں کے حساب سے ہندوستانی گولی کا شکار ہوئے اور تمام راہنمایان قوم قید کر دیئے گئے۔ (4)

1918ء میں جنگ عظیم ختم ہوئی۔ مسٹر جارج لائلڈ برطانیہ کے وزیر اعظم تھے وہ مسلمانوں کے ازلی دشمن تھے انہوں نے مسلمانوں کی مرکزیت کو ختم کرنے کے لئے ترکی کے حصے بخرے کر دیئے مسٹر آرنلڈ ٹوائنی کے قول کے مطابق "جس طرح بھوکا بھیڑیا شکار کی تلاش میں خیمہ گاہ کے گرد منڈلاتا ہے اسی طرح دول یورپ ترکی پر ٹوٹ پڑے۔"

یہ سب کچھ لندن کے خفیہ معاہدہ کا اثر تھا اب کیا تھا۔ مسلمانان ہند میں اضطراب اور بڑھ گیا تحریک خلافت شروع ہو گئی۔

اثرات:۔

1- برطانیہ کی شہنشاہیت نقطہ عروج پر پہنچ گئی

2- ترکی اور جرمنی کو خوب زک اٹھانی پڑی۔ معاہدہ وارسیلز کی وجہ سے جرمنی کو وہ ذلت اٹھانی پڑی کہ بعد میں جرمنی ہٹلر کے زیر اثر آ گیا۔ وہاں ڈکٹیٹر شپ کا رواج ہوا۔ جس نے صرف بیس سال کے بعد پھر دنیا کو ایک نئی آگ میں جھونک دیا۔

3- ترکی کے حصے بخرے ہو گئے خلافت کا خاتمہ ہو گیا اور کمال اتاترک ایک ڈکٹیٹر کے روپ میں سامنے آیا۔

4- ہندوستان میں تحریک خلافت چلی اور ہندو اور مسلمان زیادہ نزدیک نظر آنے لگے۔

5- ہندوستانیوں میں زیادہ بیداری پیدا ہو گئی۔

6- اس وقت حق خود ارادیت کو تسلیم کیا گیا جس کی وجہ سے یورپ چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم ہو گیا بعد میں اسی اصول کے تحت بہت سی غلام قوموں کو آزادی نصیب ہو گئی۔ قائد اعظمؒ نے جو پاکستان کا مطالبہ کیا وہ اسی اصول پر تھا۔

7- لیگ آف نیشنز کی بنیاد پڑی۔

حوالہ جات:

1- حیات قائداعظم، مصنف سردار محمد خان عزیز، صفحہ 71
2- " " " " صفحہ 73
3- " " " " صفحہ 76

7- میثاق لکھنؤ 1916ء

قائداعظمؒ کے مسلم لیگ میں شامل ہو جانے سے مسلم لیگ کو بہت تقویت ملی وہ ایک اہم جماعت تصور ہونے لگی۔ اب قائداعظمؒ کا جیسے خیال تھا کہ متحدہ ہندوستان ہی انگریز کو یہاں سے نکال سکتا ہے لہذا انہوں نے دونوں قوموں کو یکجا کرنے کی انتھک دوڑ شروع کر دی۔ آپ نے دسمبر 1915ء میں مسلم لیگ کو اپنا اجلاس کانگریس کے ساتھ ایک ہی شہر (بمبئی) میں ملی جلی تاریخوں میں منعقد کرنے پر راضی کر لیا۔ دونوں جماعتوں کی کمیٹیاں اس غرض سے مقرر کرائیں کہ وہ باہم مشورے اور گفت و شنید کے ذریعے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان سیاسی سمجھوتے کا راستہ نکالیں۔ آئندہ سال کے دوران ان کمیٹیوں نے ہندوستان کے آئندہ سیاسی مطالبات کے متعلق ایک سکیم پر اتفاق کر لیا اور اس سکیم کو دونوں جماعتوں کے اگلے سالانہ جلسوں میں جو دسمبر 1916ء میں لکھنؤ میں منعقد ہوئے۔ رسمی منظوری دے دی گئی اور یہ معاہدہ میثاق لکھنؤ کے نام سے مشہور ہے جو کہ مندرجہ ذیل ہے۔

الف:۔ اس حقیقت کو ملحوظ رکھتے ہوئے کہ ہندوستان کی بڑی قومیں اپنے ملک کے قدیم تمدن اور تہذیب کی وارث ہیں حکومت و نظم و نسق کے چلانے میں انہوں نے زبردست اہلیت و صلاحیت سے کام لیا ہے اور برطانوی اقتدار کی گزشتہ ایک صدی کے دوران ان قوموں نے جمہوری اسپرٹ اور تعلیم کے اعتبار سے نمایاں ترقی کی ہے مزید بر آں اس امر واقعہ کے پیش نظر کہ حکومت کا موجودہ نظام عوام کی جائز خواہشات اور آرزوؤں کے مطابق نہ ہونے کی وجہ سے موجودہ ضروریات اور حالات کے لئے سخت غیر موزوں ثابت ہو چکا ہے اس کانگریس کی رائے میں اب وہ وقت آ چکا ہے کہ ہز میجسٹی شاہ برطانیہ ایک فرمان کے ذریعہ اعلان کر دیں

کہ کسی قریبی تاریخ میں انڈیا کو حکومت خود اختیاری عطا کرنا برطانوی پالیسی کی عنایت اور مقصد قرار پاچکا ہے۔

ب:۔ کانگریس کا مطالبہ یہ ہے کہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے آل انڈیا مسلم لیگ ریفارم کمیٹی کے ساتھ مل کر جو اسکیم تیار کی ہے اور اس میں جن اصلاحات کی سفارش کی گئی ہے ان کو نامزد کر کے حکومت خود اختیاری کی جانب ایک قطعی قدم اٹھایا جائے (تفصیل درج ذیل)۔ (آل انڈیا مسلم لیگ کو مسلمانوں کا واحد نمائندہ تسلیم کرنے کا کوئی مطالبہ نہیں)۔

اصلاحات کی اسکیم:۔

(1) صوبائی مجالس قانون ساز

(2) اراکین صوبائی مجالس قانون ساز کے پانچ حصوں میں سے ایک حصہ نامزد اراکین اور بقیہ چار حصے منتخب اراکین پر مشتمل ہوں گے۔

(3) بڑے صوبوں میں ان کی تعداد ایک سو پچیس (125) سے کم نہیں ہوگی اور چھوٹے صوبوں میں پچاس (50) سے لے کر 75 تک ہوگی۔ مجالس قانون ساز کے ارکان کو براہ راست خود عوام ممکنہ حد تک وسیع حق رائے دہی کی بنیاد پر منتخب کریں گے۔

(4) انتخابات کے ذریعہ اہم اقلیتوں کی نمائندگی کے لئے کافی گنجائش فراہم کی جائے گی مجالس قانون ساز میں مسلم لیگ کو درج ذیل تناسب کے ساتھ خصوصی حلقہ ہائے انتخاب کے ذریعہ نمائندگی ملنی چاہئے۔

پنجاب:۔	منتخب ہندوستانی ممبروں کا نصف
صوبہ جات متحدہ:۔	منتخب ہندوستانی ممبروں کا 30 فیصد
بنگال:۔	منتخب ہندوستانی ممبروں کا 40 فیصد
بہار:۔	منتخب ہندوستانی ممبروں کا دس فیصد
مرکزی صوبے:۔	منتخب ہندوستانی ممبروں کا 15 فیصد
مدراس:۔	منتخب ہندوستانی ممبروں کا 15 فیصد
بمبئی:۔	منتخب ہندوستانی ممبروں کا ایک تہائی۔

کوئی مسلمان صوبائی یا مرکزی مجالس قانون ساز کے دوسرے انتخابات میں سے کسی انتخاب میں حصہ نہیں لے گا بجزان انتخابات کے جو خصوصی مفادات کی نمائندگی کرنے والے حلقہ ہائے انتخاب کے تحت عمل میں آئیں۔ یہ بات بھی مزید اس میں شامل ہے کہ کسی غیر سرکاری ممبر کی جانب سے پیش کیا جانے والا کوئی مسودہ قانون اس کی کوئی دفعہ یا کوئی تجویز جو کسی ایک یا دوسرے فرقہ کو متاثر کرتی ہو (اس کا سوال اس فرقے کے ممبر اٹھائیں گے جو متعلقہ، مجلس قانون ساز میں شامل ہیں اور اس فرقے کے تین چوتھائی ممبر کسی مجلس قانون ساز میں خواہ وہ مرکزی ہو یا صوبائی اس قانون یا اس کی کسی دفعہ یا تجویز کی مخالفت کریں تو وہ پاس نہیں ہوگی۔

(5) صوبائی حکومت کے سربراہ کو مجلس قانون کا صدر نہیں بنایا جائے گا خود مجلس کو اپنا صدر منتخب کرنے کا اختیار حاصل رہنا چاہئے۔

(6) ضمنی سوالات اٹھانے کے حق کو اصل سوال پیش کرنے والے ممبر تک ہی محدود نہ کیا جائے بلکہ کسی بھی ممبر کو اس حق سے فائدہ اٹھانے کی اجازت ملنی چاہئے۔

(7) (الف) کسٹم ڈاک، ٹیلی گراف، ٹیکسٹائل، نمک، افیون، ریلوے، فوج، بحریہ اور ہندوستانی ریاستوں سے وصول ہونے والی رقوم کے سوا مالیات کے تمام ذرائع صوبائی قرار دیئے جائیں گے۔

(ب) محاصل کی الگ الگ حدوں کا تعین نہیں کیا جائے گا۔ مرکزی حکومت کو مقررہ حصہ صوبائی حکومتوں کی جانب سے فراہم کیا جاتا رہے گا اس مقررہ مالیاتی حصوں پر جب بھی غیر متوقع اور غیر معمولی حالات پیش آئیں، نظر ثانی کی جاسکتی ہے۔

(ج) صوبائی مجلس قانون ساز کو صوبے کے داخلی نظم و نسق کے متاثر کرنے والے تمام معاملات سے عہدہ برآ ہونے کا مکمل اختیار حاصل رہے گا۔ اس میں قرضوں کی مقدار میں اضافے ٹیکس لگانے اور اس میں ترمیم کرنے اور بجٹ پر رائے شماری کا اختیار بھی شامل ہے خرچ کی تمام مدوں اور ضروری محاصل میں اضافے کے لئے وسائل اور ذرائع سے متعلق تجاویز مسودہ قانون میں شامل کی جائیں گی اور اس کی منظوری کیلئے صوبائی مجلس قانون ساز میں پیش کیا جائے گا۔

(د) صوبائی حکومت سے متعلق تمام مسائل پر کسی بھی تجویز کو ان قاعدوں کے مطابق زیر بحث لانے کی اجازت حاصل ہو گی جو اس سلسلے میں خود مجلس کی جانب سے وضع کئے جائیں گے۔

(و) صوبائی مجلس قانون ساز کی طرف سے پاس کی جانے والی تجویز کی حیثیت حکومت انتظامیہ کے لئے ایک لازمی امر کی ہو گی بجز اس کے کہ گورنران کونسل کی طرف سے ویٹو' استعمال کیا گیا ہو اگر مجلس قانون ساز ایک سال سے کم وقفے میں اس قرارداد کو دوبارہ پاس کردے تو اسے نامزد کردینا چاہئے۔

(ی) عوامی اہمیت کے کسی فوری اور متعین مسئلے کو زیر بحث لانے کیلئے تحریک التواء پیش کی جا سکتی ہے بشرطیکہ حاضر آرائیں جن کی تعداد ان کے آٹھویں حصے سے کم نہ ہو اس کی حمایت کریں۔

(8) صوبائی مجلس قانون ساز کا خصوصی اجلاس بلایا جا سکتا ہے بشرطیکہ مطالبہ کرنے والے ممبروں کی تعداد ان کے آٹھویں حصے سے کم نہ ہو۔

(9) مالی مسودہ قانون کے سوا کوئی بھی مسودہ قانون ان قاعدوں کے مطابق جو اس سلسلے میں خود مجلس نے وضع کئے ہوں پیش کیا جا سکتا ہے۔ اور اس کے لئے حکومت کی منظوری کی ضرورت نہ ہو گی۔

(10) تمام قانونی مسودات جو صوبائی مجلس قانون ساز کی جانب سے پاس کئے جائیں قانون بننے سے پہلے ان کے لئے گورنر کی منظوری حاصل کرنا ضروری ہو گا لیکن گورنر جنرل ان کے خلاف اپنا ویٹو استعمال کر سکے گا۔

(11) اراکین مجلس قانون ساز کے عہدے کی معیاد پانچ سال ہو گی۔

2- صوبائی حکومتیں

(1) ہر صوبائی حکومت کا سربراہ ایک گورنر ہو گا وہ قاعدے کے مطابق نہ انڈین سول سروس سے متعلق ہو گا اور نہ اس کا تعلق کسی قسم کی ملازمت سے ہو گا۔

(2) ہر صوبے میں ایک انتظامیہ کونسل ہو گی جو گورنر کے ساتھ مل کر صوبے کی حکومت انتظامیہ کو تشکیل دے گی۔

(3) انڈین سول سروس کے ممبر قاعدے کے مطابق انتظامیہ کونسل میں شامل نہیں کئے جا سکیں گے۔

(4) انتظامیہ کونسل میں ہندوستانی ممبروں کی تعداد نصف سے کم نہ ہو گی ان کا انتخاب صوبائی مجلس قانون ساز کے منتخب ارکان کی طرف سے عمل میں لایا جائے گا۔

(5) ممبروں کے عہدے کی معیاد پانچ سال ہو گی۔

(3) مرکزی مجلس قانون ساز

(1) مرکزی مجلس قانون ساز کی کل تعداد ایک سو پچاس ہو گی۔

(2) کل تعداد میں سے چار حصے منتخب ممبروں پر مشتمل ہوں گے۔

(3) مرکزی مجلس قانون ساز کیلئے حق رائے دہی کو ممکنہ حد تک اسی طریقے سے وسیع کیا جائے گا جو صوبائی مجلس قانون ساز کے مسلم انتخابی حلقوں کیلئے اختیار کیا گیا تھا۔ صوبائی مجالس قانون ساز کے منتخب ممبر مرکزی مجلس قانون ساز میں اراکین بھیجنے کیلئے ایک انتخابی حلقہ تشکیل دیں گے۔

(4) منتخب ہندوستانی ممبروں میں سے ایک تہائی مسلمان ہوں گے جو مختلف صوبوں میں جداگانہ مسلم حلقہ ہائے انتخاب کے ذریعہ چنے جائیں گے ان کا تناسب تقریباً وہی ہو گا جس کے مطابق انہیں جداگانہ مسلم حلقہ ہائے انتخاب کی بنیاد پر صوبائی مجالس قانون ساز میں نمائندگی حاصل ہے۔

دفعہ ایک، شق چار کے لئے وسیع قانونی شرائط:۔

(5) مجلس قانون ساز کا صدر خود مجلس کی طرف سے منتخب کیا جائے گا۔

(6) ضمنی سوالات کرنے کے حق کو اصل سوال پیش کرنے والے تک ہی محدود نہیں کیا جائے گا بلکہ اس حق کے استعمال کرنے کی کسی بھی ممبر کو اجازت حاصل رہے گی۔

(7) کونسل کا خصوصی اجلاس بلایا جا سکتا ہے بشرطیکہ اس کا مطالبہ کرنے والوں کی تعداد ان کے آٹھویں حصے سے کم نہ ہو۔

(8) مالی مسودہ قانون کے سوا کوئی بھی مسودہ قانون ان قاعدوں کے مطابق جو اس سلسلے میں

خود مجلس نے وضع کئے ہوں' پیش کیا جاسکتا ہے اور حکومت انتظامیہ کی منظوری اس کے لئے ضروری نہیں ہوگی۔

(9) تمام مسودات قانون جو مجلس کی طرف سے پاس کئے جائیں گے قانون بننے سے پہلے ان کیلئے گورنر جنرل کی منظوری حاصل کرنا ضروری ہو گا۔

(10) خرچ کے حدوں اور آمدنی کے ذرائع سے تعلق رکھنے والی تمام مالی تجاویز مسودات قانون میں شامل کی جائیں گی ایسا ہر مسودہ قانون اور بجٹ بحیثیت مجموعی رائے شماری کیلئے مرکزی مجلس قانون ساز میں پیش کیا جائے گا۔

(11) اراکین کے عہدے کی معیاد پانچ سال ہو گی۔

(12) درج ذیل معاملات پوری طرح مرکزی مجلس قانون ساز کے کنٹرول میں رہیں گی۔

(الف) ایسے مسائل جن کے سلسلہ میں سارے ہندوستان کے لئے یکساں نوعیت کے قوانین بنانا مناسب ہو۔

(ب) صوبائی قانون سازی جو صوبوں کی آپس کے مالی تعلقات پر اثر انداز ہو۔

(ج) ایسے مسائل جو خالص مرکزی حکومت کی مالیات پر اثر انداز ہوتے ہوں بجز ان رقوم کے جو ہندوستانی ریاستوں سے وصول ہوتی ہیں۔

(د) ایسے مسائل جو خالص مرکزی حکومت کے اخراجات پر اثر انداز ہوتے ہوں الایہ کہ مرکزی مجلسِ قانون ساز کے کسی ریزولیوشن نے ملک کے دفاع کے لئے فوجی ذمہ داریوں کے سلسلہ میں گورنر جنرل نے کونسل پر کوئی پابندی عائد کردی ہو۔

(و) کروڑ گیری اور کسٹم ڈیوٹی پر نظر ثانی' کسی ٹیکس یا ٹیکسوں کے عائد کرنے' انہیں ختم کرنے یا ان میں ترمیم کرنے' بینکنگ اور کرنسی کے موجودہ نظام میں تبدیلی لانے' ملک کے کسی یا تمام مستحق اور ضروری صنعتوں کو امداد دینے کا حق۔

(ی) بحیثیت مجموعی پورے ملک کے نظم و نسق سے تعلق رکھنے والے مسائل کے بارے میں کوئی تجویز منظور کرنا۔

(13) مجلس قانون کی جانب سے منظور کی ہوئی تجویز حکومت انتظامیہ کے لئے ایک امر لازم ہے۔ الایہ کہ گورنر جنرل۔ ان۔ کونسل' اپنا ویٹو استعمال کر کے اسے مسترد کردے۔ بشمول اس

کے کہ ایک سال کے کم وقفے میں اگر مجلس دوبارہ اسے پاس کردے۔ تو اسے نافذ کردیا جانا چاہیے۔

(14) عوامی اہمیت کے کسی فوری اور متعین مسئلے کو زیر بحث لانے کے لئے تحریک التواء پیش کی جاسکتی ہے۔ حاضر اراکین جن کی تعداد آٹھویں حصے سے کم نہ ہو اس کی حمایت کریں۔

(15) صوبائی مجلس قانون ساز یا مرکزی مجلس قانون ساز کے منظور کئے ہوئے کسی مسودہ قانون کے خلاف تاج "ویٹو" استعمال کرنے کا فیصلہ کرے تو اسے ایسے حق کو مسودہ قانون کے پاس ہونے کی تاریخ سے بارہ ماہ کے اندر اندر استعمال کرلینا چاہیے۔ اور قانون اس تاریخ سے بے اثر قرار پائے گا۔ جس تاریخ کو "ویٹو" کے استعمال کرنے کی اطلاع متعلقہ مجلس قانون ساز کو دی جائے گی۔

(16) حکومت ہند کے فوجی معاملات ہندوستان کے خارجی وسیاسی تعلقات، جن میں اعلان جنگ، معاہدہ صلح اور بین الاقوامی معاہدات میں شرکت بھی شامل ہے۔ مرکزی مجلس قانون ساز کو ان امور سے متعلق ہدایات میں مداخلت کرنے کا کوئی اختیار حاصل نہیں ہو گا۔

حکومت ہند:

(1) ہندوستان کا گورنر جنرل حکومت ہند کا سربراہ ہو گا۔

(2) اس کی ایک انتظامیہ کونسل ہوگی۔ جس کے آدھے ممبر ہندوستان سے ہوں گے۔

(4) انڈین سول سروس کے ممبر گورنر جنرل کی مجلس انتظامیہ میں شامل نہیں کئے جائیں گے۔

(5) امپیریل سول سروس کے عہدوں پر تقرر کے اختیارات حکومت ہند کو حاصل ہوں گے۔ اس اسکیم کو ترتیب دیتے ہوئے موجودہ مفادات کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے۔

(6) حکومت ہند ضابطے کی رو سے صوبے کے مقامی معاملات میں مداخلت نہیں کرے گی۔ اور صوبائی حکومت کو جو اختیارات دیئے گئے ہیں۔ جب تک وہ اولنڈر کی طرف منتقل نہیں کر دیئے جائیں گے۔ حکومت ہند کا اختیار قاعدے کی رو سے صوبائی حکومتوں کی عام نگرانی اور دیکھ بھال تک محدود رہے گا۔

(7) قانونی انتظامی امور میں اس اسکیم کی رو سے ممکنہ حد تک سیکریٹری آف اسٹیٹ سے آزاد رہے گی۔

(8) حکومت ہند کے حسابات کی جانچ پڑتال کے لئے ایک خود مختار نظام قائم کیا جائے گا۔

سیکرٹری آف اسٹیٹ ان کونسل

سیکرٹری آف اسٹیٹ کی تنخواہ برطانیہ کے حسابات میں ڈال دینی چاہئے۔

(1) ہندوستان کے لئے سیکریٹری آف اسٹیٹ کی کونسل کو ختم کردینا چاہئے۔

(2) جہاں تک ممکن ہو حکومت ہند کے تعلق سے سیکریٹری آف اسٹیٹ کو وہی پوزیشن حاصل ہونی چاہئے جو نو آبادیات کے سیکریٹری آف اسٹیٹ کو حکومت خود اختیاری رکھنے والی ریاستوں کی حکومتوں کے مقابل میں حاصل ہے۔

(3) ہندوستان کے سیکریٹری آف اسٹیٹ کی مدد کے لئے دو مستقل انڈر سیکریٹری مقرر کئے جائیں۔ ان میں سے ایک کو ہمیشہ ہندوستانی ہونا چاہئے۔

انڈیا اور حکومت برطانیہ

(1) کسی کو بھی کونسل یا کوئی اور مجلس جو سلطنتی امور کے تصفیے یا کنٹرول کے لئے بلائی جائے یا تشکیل دی جائے۔ انڈیا کو بھی ریاستوں کی طرح مساوی حقوق کے ساتھ اس میں کافی نمائندگی دی جانی چاہئے۔

(2) ہندوستانیوں کو ہر مجسٹی کی دوسری رعایا کے ساتھ ساری سلطنت میں مرتبے اور شہری حقوق کے اعتبار سے مساوی حیثیت حاصل ہونی چاہئے۔

فوجی اور دوسرے معاملات

(1) ہر مجسٹی کی فوج اور بحریہ میں اعلیٰ اور ادنیٰ دونوں طرح کے عہدوں کے دروازے ہندوستان پر بھی کھول دیئے جائیں۔ ان کے انتخابات، مشق اور ان کی تربیت کے لئے ہندوستان میں کافی سہولتیں بہم پہنچائی جائیں۔

(2) ہندوستانیوں کو رضاکارانہ طور پر اپنے نام درج کرانے کی اجازت دے دی جائے۔

(3) انڈیا میں انتظامیہ کے افسروں کو عدالتی اختیارات حاصل نہیں ہوں گے۔ عدالتی اختیارات ہر صوبے میں صوبے کی سب سے اعلیٰ عدالت کو دیئے جائیں گے۔

لکھنؤ پیکٹ کی توثیق کرتے ہوئے آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس لکھنؤ میں یکم جنوری 1917ء کو ایک قرارداد منظور کی اور سفارش کی کہ صوبائی اسمبلیوں میں 80 فیصد منتخب اراکین اور 25 فیصد نامزد اراکین ہونے چاہیں۔ بڑے صوبوں میں اسمبلیوں کے اراکین کی تعداد 125 اور چھوٹے صوبوں میں 50 تا 75 ہونی چاہیں۔ اراکین کا انتخاب عوام براہ راست رائے دہی کی ممکنہ وسیع بنیادوں پر کریں۔ مسلمانوں کو پنجاب میں 50 فیصد منتخب نشستیں دی جائیں' یوپی میں 30 فیصد' بنگال میں 40 فیصد' اور بہار میں 25 فیصد۔ سی پی اور مدراس میں 15 فیصد اور بمبئی میں ایک تہائی منتخبہ نشستیں مسلمانوں کو دی جائیں۔ اسمبلیوں میں کوئی قرارداد کسی فرقہ کی طرف سے کسی ایسے مسئلہ کے بارے میں جو اس فرقہ سے تعلق رکھتا ہو' اس وقت تک پیش نہیں ہو سکے گی جب تک اس فرقہ کے تین چوتھائی اراکین سے زائد کی حمایت حاصل نہ ہو۔ کسٹم' ڈاک و تار' نمک' ریلوے' فوج' بحریہ' اور ہندوستانی ریاستوں کے راج کے علاوہ تمام محاصل کے وسائل صوبوں کے پاس ہوں۔ صوبائی کونسلوں کو اندرونی معاملات میں پورا اختیار ہو۔

تبصرہ

عام طور پر جو اس معاہدہ پر اعتراض مسلمانوں کی طرف سے کیا جاتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے پنجاب اور بنگال میں جہاں ان کی اکثریت تھی وہاں بھی اقلیت میں رہنا قبول کر لیا۔ لیکن اگر اس کا باریک بینی سے مطالعہ کیا جائے تو علم ہوتا ہے کہ پنجاب میں مسلمانوں نے تقریباً" دس فی صد کم نشستیں لیں۔ لیکن دوسری طرف یوپی میں 30 فیصد نشستیں حاصل کیں جب کہ آبادی صرف 15 فیصد تھی۔ مدراس میں آبادی 6.15 فیصد اور نشستیں 15 فیصد' بنگال میں باقی 60 فیصد میں تمام قومیں شامل تھیں اس طرح ہندوؤں کو اکثریت کبھی میسر نہ آسکتی جب کہ پہلے حالت یہ تھی کہ 23 غیر مسلموں کے مقابلہ میں صرف 5 مسلمان تھے۔ ایسی صورت میں 40 فیصد نشستیں حاصل کر لینا نقصان نہ تھا۔

اس وقت کے لحاظ سے لکھنؤ پیکٹ کی بڑی اہمیت ہے۔ وہ اس طرح کہ کانگرس جس کو برعظیم کی ساری آبادی کے نمائندہ ہونے کا دعوی تھا۔ اس نے مسلم لیگ کو مسلمانوں کی نمائندہ جماعت تسلیم کرلیا اور خود ہندو جماعت ہو کر رہ گئی۔ اور بعد کی سیاست پر جب غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا کہ دونوں جماعتوں کی آئندہ کوششوں کا محور یہ رہا ہے کہ کانگرس اپنا سابقہ معیار قائم کرسکے اور مسلم لیگ کا یہ زور رہا ہے کہ اسے مسلمانوں کی نمائندہ جماعت تسلیم کرلیا جائے۔

اس معاہدہ کا بڑا دور رس نتیجہ یہ نکلا کہ تقسیم پنجاب و بنگال کے وقت جو مسلمانوں کو نقصان ہوا وہ اسی معاہدہ کے تحت لائی ہوئی نشستوں کی وجہ سے تھا۔ پنجاب میں خضر حیات جیسے ہندو پرور اور انگریز نواز بھی مسلمانوں کے نمائندہ بن گئے۔ اور مسلمانوں کی خرابی کا باعث بنے۔

ڈاکٹر خالد بن سعید کے مطابق یہ معاہدہ ہندو مسلم اتحاد کا عظیم مینار تھا۔

اس معاہدہ پر سب لوگوں کو شرح صدر نہ تھا۔ مسلمانوں کا ایک گروہ پنجاب اور بنگال میں مسلم اکثریت کے اقلیت میں بدل جانے پر تشویش کا اظہار کرتا تھا۔ علی برادران نے جیل سے رہائی کے بعد اس معاہدہ پر تنقید کی۔ چوہدری خلیق الزمان نے اس معاہدہ کو سیاست میں مسلمانوں کی ناتجربہ کاری قرار دیا۔ دوسری طرف ہندوؤں میں سے ایک متعصب گروہ نے اس کی شروع ہی سے مخالفت کی۔ مدن موہن مالویہ اور دوسرے مہاسبھائیوں نے جداگانہ انتخابات کی کھلم کھلا مخالفت کی۔ حالانکہ یہ لوگ اس معاہدہ پر دستخط کرنے والوں میں شریک تھے۔ لیکن چانکیہ کے ان پیروکاروں کا یہ انداز کوئی نرالا نہیں یہ لوگ وقتی ضرورت کے پیش نظر بعض اصولوں پر اتفاق کرلیتے ہیں اور جب حالات بدل جائیں تو بلا تکلف ان اصولوں سے انکار کرلیتے ہیں۔ چنانچہ چند سالوں کے بعد ان ہندو لیڈروں نے میثاق لکھنؤ کے پرخچے اڑا دیئے۔

اس معاہدہ نے ہندوؤں اور مسلمانوں میں اتحاد کی فضا پیدا کردی۔ دونوں قوموں نے مل کر اگلے دس تک انگریزوں کے خلاف زوردار تحریک چلائی۔ جس کی بنا پر انگریزی اقتدار کی جڑیں ہل گئیں۔ یہ انہی حالات کا اثر تھا کہ ہندوستانیوں نے مکمل آزادی کا مطالبہ شروع کر دیا۔

8- تحریک خلافت

جنگ عظیم 1918ء میں ختم ہو گئی۔ اس جنگ میں جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے ترکی نے جرمنی کا ساتھ دیا تھا۔ اس لئے جرمنی کے ساتھ ترکی کو بھی شکست ہوئی اور تباہی بھی زیادہ تر ترکی کی ہی ہوئی۔ چونکہ یہاں پر بھی مذہبی تعصب کار فرما تھا مغربی طاقتیں ترکی پر اس طرح جھپٹیں جیسے کہ گدیں مردار پر حملہ کرتیں ہیں۔ ترکوں سے عرب' عراق' شام اور فلسطین چھین لئے گئے' یورپ میں تھریس کا علاقہ بھی ہتھیا لیا گیا اور ترکی کا دار الخلافہ قسطنطنیہ اتحادیوں نے اپنے قبضے میں کر لیا۔ پیرس میں صلح کی کانفرنس منعقد ہوئی تو مسلمانوں کو یہ خدشہ لاحق ہونے لگا کہ کہیں اتحادی خلافت کو ہی ختم نہ کر ڈالیں۔ کیونکہ خلافت اب انگریزوں کے رحم و کرم پر تھی۔ لیکن پیشتر اس کے کہ ہم خلافت کے متعلق مسلمانان ہند کی سرگرمیوں کا ذکر کریں' کچھ ترکوں کے متعلق بھی بیان کر دینا شاید غیر مناسب نہ ہو۔ پروفیسر Smith C.W. اپنی کتاب "ماڈرن اسلام ان انڈیا" میں خلافت کے متعلق اپنا تعصبانہ نقطہ نگاہ پیش کرتے ہوئے لکھتا ہے "انیسویں صدی کے اختتام پر خلیفتہ المسلمین سلطان عبدالحمید نے ایک بار پھر اپنے اقتدار کو قائم رکھنے کی کوشش کی اور اس کے لئے پان اسلامک (Pan Islamic) تحریک ملک میں شروع کر دی اس تحریک میں تقریباً" تمام دنیا کے مسلمانوں نے کم و بیش حصہ لیا۔ اس تحریک سے سلطان اپنی سلطنت کو اپنے ہی ملک کی اندرونی سازشوں سے محفوظ رکھنے کی تدبیر کرنے لگا۔ کیونکہ اس وقت خود ترکی میں ہی خلافت کے خلاف ایک "ڈیموکریٹک پارٹی" وجود میں آچکی تھی۔ اور بڑے بڑے با اثر لوگ اس میں شامل ہو چکے تھے۔ لیکن 1918ء میں "ینگ ترکی پارٹی" نے خلیفہ کو معزول کر دیا۔ خلیفہ

یعنی سلطان کے معزول ہونے سے نہ خلافت رہی اور نہ ہی "پان اسلامک تحریک"۔ لیکن چار سال بعد یہ تحریک پھر ایک بار ہندوستان میں زندگی کے آثار دکھلانے لگی۔ اس وقت ایک طرف ترکی اور اٹلی میں لڑائی ہو رہی تھی۔ دوسری طرف یورپ کی بڑی بڑی طاقتوں نے بلقان میں ترکوں کے خلاف جنگ کے شعلے بھڑکا رکھے تھے۔ ترکوں کے خلاف جس قدر تحریکیں اس وقت کام کر رہی تھیں ان میں برطانیہ سب سے پیش پیش تھا۔ مسلمانوں کو یہ خوف ہونے لگا تھا کہ انگریز نہ صرف یورپ ہی میں بلکہ تمام دنیا میں مسلمانوں کو اور مسلمانوں کے ساتھ ان کے اسلامی کلچر کو بھی ختم کر دینا چاہتا ہے۔ ان حالات میں عام مسلمانوں میں ایک ہیجان سا پیدا ہو گیا۔ دوسری طرف ہندوستان میں شبلی' اکبر' حالی اور اقبال نے لوگوں کے جذبات کو ابھارا۔ خصوصاً "علامہ اقبال" نے "شکوہ" لکھ کر اور حالی نے "مسدس حالی" لکھ کر وہ کام بڑی خوبی سے کیا۔ صرف چھ ماہ کے قلیل عرصہ میں الہلال کی اشاعت گیارہ ہزار تک پہنچ گئی۔ الہلال صرف مسلمانوں کے جذبات کو ہی نہیں ابھارتا تھا بلکہ بڑی بے باکی سے برطانیہ کی مسلم آزار پالیسی پر بھی کڑی نکتہ چینی کرتا تھا۔ اسی طرح پنجاب میں روزنامہ زمیندار (لاہور) نے بھی اس نازک موقع پر مسلمانوں کی قلمی خدمات کرنے میں بڑی سرگرمی دکھلائی اور زمیندار کی اشاعت بیس ہزار روزانہ تک پہنچ گئی۔ مولانا محمد علی جوہر نے انگریزی میں کامریڈ اور اردو میں ہمدرد اخبار نکالا۔ دونوں اخبار دہلی سے شائع ہوتے تھے۔ ان دونوں اخبارات نے محمد علی کی زیر ادارت مسلمانوں میں زندگی کی ایک نئی تڑپ پیدا کر دی"۔

1912ء میں مولانا محمد علی جوہر کی کوششوں سے ہندوستان کے مسلمانوں کی طرف سے ترکوں کی طبی امداد کے لئے ڈاکٹر انصاری کی سرکردگی میں "ریڈ کریسنٹ مشن" ترکی بھیجا گیا۔ مسلمانان ہند نے بڑی دریا دلی سے اس کار خیر کے لئے مالی مدد دی۔ ان واقعات کے کچھ عرصہ بعد پہلی جنگ عظیم چھڑ گئی۔ سیاسی حالات نے ترکوں کو اتحادیوں کی مخالف صف میں کھڑا کر دیا۔ حکومت ہند نے مسلمانوں کے عام اخبارات پر پابندی عائد کر دی اور ان کے ایڈیٹروں اور دوسرے مسلمان لیڈروں کو جیلوں میں بند کر دیا۔ سرکار انگریزی اپنے اوچھے ہتھکنڈوں پر آ گئی تھی۔ شاید یہ سمجھتے ہوئے کہ یہ پھونکوں سے اس شمع فروزاں کو گل کر لے گی۔ لیکن حالات کسی اور سمت کی نشاندہی کر رہے تھے۔

حکومت کی ان سختیوں کی وجہ سے ملک میں ایک انقلابی تحریک کے آثار نظر آنے لگے۔ خصوصیت سے پنجاب میں "رولٹ کمیشن" 1913ء میں مقرر کیا گیا۔ مسلم عوام الناس پہلے ہی حکومت سے بد ظن تھے اب مسلمان فوجی بھی بے چین اور بد دل ہونے لگے۔ اس وقت فوج میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ اب حکومت نے ایک شاطرانہ چال چلی کہ ہندوستانیوں کو "سیلف گورنمنٹ" کے سبز باغ دکھانے شروع کر دیئے۔ لیکن سیاسی حالت میں کوئی خوشگوار تبدیلی واقع نہ ہوئی۔ اسی زمانہ میں "رولٹ ایکٹ" ہندوستان کے سر تھوپ دیا گیا جس کا مقصد اولین صرف یہ تھا کہ اس بدامنی اور بے چینی کو سختی سے کچل دیا جائے یہ حکومت کا سب سے بزدلانہ فعل تھا۔ وہ بھول گئی تھی کہ سختی اور ظلم سوئے ہوئے احساسات کو اور ابھارتے ہیں اسی لئے "ستیا گرہ" کی تحریک تمام ہندوستان کے طول و عرض میں منائی گئی۔ ہندو مسلم چھوت چھات کو چھوڑ کر یک جان و دو قالب ہو گئے اس حالت بد میں امرت سر میں "جلیانوالہ باغ" میں بے حد افسوسناک و شرمناک واقعہ پیش آیا جس میں بے شمار ہندو مسلم جنرل ڈائر کی فوج کی گولیوں کا نشانہ بنے۔

اب مسلمانوں کی نظریں خلافت کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ "خلافت کمیٹی" قائم ہو چکی تھی جنگ عظیم کے بعد انگریزوں کو جب فتح حاصل ہوئی تو حکومت برطانیہ نے ترکوں کے متعلق جو وعدے مسلمانوں سے کر رکھے تھے بالکل فراموش کر دیئے مسٹر لائیڈ جارج نے ترکوں کے سامنے جو صلح کی شرائط پیش کیں وہ بہت ذلت آمیز تھیں۔ انگریزوں کی اس معاندانہ روش سے مسلمانوں میں غیظ و غضب کی آگ بھڑک اٹھی اس وقت "خلافت کمیٹی" کے علاوہ "جمیعتہ العلماء ہند" کے نام سے مسلمانوں میں ایک اور جماعت جنم لے چکی تھی تحریک خلافت کے روح رواں مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی تھے۔ مسلم انڈیا کے سیاسی آسمان کے ان دو درخشندہ ستاروں نے اپنی آب و تاب سے ہر مرد مومن کے دل میں اسلام کی تڑپ پیدا کر دی۔ کچھ روز بعد مسٹر گاندھی نے بھی تحریک خلافت میں مسلمانوں سے ہمدردی کا عملی اظہار کیا اور بہت جلد مسلمانوں کے دل میں اعتماد پیدا کر لیا۔

انگریزوں نے معاہدہ سیورز (Treaty of Severs) کے تحت ترکی کے حصے بخرے کر ڈالے۔ 1920ء میں مولانا محمد علی اور چند دیگر اکابرین ملت خلافت کا نظریہ پیش کرنے کے

لئے انگلستان گئے لیکن ان کی کچھ شنوائی نہ ہوئی اور یہ وفد بے نیل و مرام واپس آگیا گاندھی جی نے مسلمانوں کے جذبات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انگریزوں کے خلاف "تحریک ترک موالات" شروع کر دی لیکن بعض مسلمان لیڈر خصوصاً" مسٹر محمد علی جناح اس تحریک کو مسلمانوں کے لئے مفید نہیں سمجھتے تھے کیونکہ اس سے مسلمان کی انفرادیت پر ضرب پڑتی تھی بہرکیف ہندو مسلم اتحاد کی آواز فضا میں گونجتی سنائی دیتی تھی۔ 10 اگست 1920ء کو اتحادیوں نے ترکوں سے اس توہین آمیز صلح نامے پر دستخط کرائے مسلمانوں کے دلوں میں انگریزوں کے خلاف غصے اور نفرت کی آگ بھڑک اٹھی اور مسلمان گاندھی جی کی تحریک ترک موالات میں اندھا دھند شامل ہونے لگے۔ مصلحتاً" مسلم لیگ بھی اس میں شامل ہو گئی اسی سال کلکتہ میں کانگریس کے اجلاس میں دو بڑے اہم ریزولوشن پاس ہوئے ایک "سوراج" حاصل کرنے کیلئے اور دوسرا "خلافت" کی بحالی کیلئے۔

مسلمانوں کی بدبختی کا ابھی ایک اور مظاہرہ ہونے والا تھا کہ اسی سال موسم گرما میں ہندوستان میں ہجرت کی تحریک پھیلی اور ہندو راہنماؤں نے اس تحریک کو بہت ہوا دی اس کی دو وجوہ تھیں ایک تو مسلم لیگ جو ہندوؤں کے درد سر تھی مسلمانوں کے چلے جانے کے بعد قوت ختم ہو جانے کے بعد خود بخود اپنی موت آپ مر جاتی تھی دوسرے انگریزوں پر بھی اخلاقی ضرب پڑتی تھی اور اس سب کارروائی کا فائدہ ہندو بنیا کو آزادی کی صورت میں مل جاتا۔ مسلمانوں کی بدقسمتی کہ چند زر خرید راہنماؤں نے مسلم عوام میں یہ بدظنی پھیلانی شروع کر دی کہ ہندوستان میں مسلمان چونکہ مذہبی آزادی سے نہیں رہ سکتے اس لئے انہیں یہاں سے ہجرت کر کے کسی اور اسلامی ملک میں چلے جانا چاہئے اور اس کے ساتھ یہ لقمہ بھی دیا کہ حکومت افغانستان اپنے مہاجر بھائیوں کو لبیک کہنے کو چشم براہ ہے۔ سادہ لوح مسلمان اس بھرتے میں آگئے اور ہجرت کا سلسلہ شروع ہو گیا ان حالات میں اقبال شیدائی نے اہم کردار ادا کیا اور مسلمانوں کی ہجرت کا سلسلہ بند ہو گیا۔

اب قدرت کو ہندو کی خاص ذہنیت مسلمانوں کے سامنے لانی تھی کہ جنوبی ہند کے وہ مسلمان جو ساحل مالابار کے ساتھ ساتھ رہتے تھے اور موپلے کہلاتے تھے فطرتاً" ایک بہادر اور جنگجو قوم تھے ان لوگوں کی معاشی حالت بہت خراب چلی آ رہی تھی اور حکومت بھی تساہل سے

کام لیتی رہی تھی اس لئے موپلے اکثر سر اٹھا لیتے تھے سب سے پہلے 1873 میں انہوں نے سر اٹھایا اور حکومت نے ان کی سرکوبی کیلئے ان کے علاقوں میں مستقل چھاونیاں قائم کر دیں پھر 1885ء' 1894ء اور 1896ء میں ان لوگوں نے حکومت کے خلاف ہتھیار اٹھائے لیکن ہر موقع پر فوجی قوت سے ان کا سر دبا دیا گیا۔ 1921 کے شروع میں یہ لوگ تحریک خلافت اور ترک موالات سے بہت متاثر ہوئے۔ حکومت نے ہر طرح کا بندوبست کیا لیکن ایک روز کھلم کھلا حکومت کے خلاف بغاوت کر دی کئی دن تک کشت و خون کا بازار گرم رہا کئی ہندو کیفر کردار کو پہنچے جس کی وجہ سے گاندھی نے متاثر ہو کر "ترک موالات" کی تحریک کو ختم کر دیا چونکہ اب کے ہندوؤں کا خون ہوا تھا گاندھی جی ہمیشہ اس بات پر کف افسوس ملتے رہے' یہ تھا گاندھی اور ہندو اکابرین کا مسلمانوں سے اتحاد و اشتراک۔

ادھر ترکی میں حالات ایک نئی کروٹ لے رہے تھے سلطان نے تو اس ذلت آمیز معاہدہ کو تسلیم کر لیا تھا لیکن مصطفیٰ کمال پاشا جو کہ اس وقت انقرہ میں تھا اس نے اس ذلت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور اپنی فوج اور عوام کی مدد سے سقاریہ کے مقام پر یونانیوں کو شکست فاش دی اور غیر اقوام کو ترکی سے باہر نکالنے کا تہیہ کر لیا جس میں وہ شاندار طریقے سے کامیاب ہوا۔ آخر اس نے 1924ء میں خلافت کا ہی خاتمہ کر دیا اور جمہوری نظام حکومت کی طرح ڈالی اس طرح مسلمانوں کی نام نہاد خلافت کا جو کہ خلافت راشدہ کے بعد ملوکیت بن چکی تھی خاتمہ ہو گیا۔ جب یہ حالت ہو گئی تو ہندوستانی مسلمانوں کا جوش بھی دھیرے دھیرے ٹھنڈا پڑ گیا۔

بے شک تحریک خلافت اپنے مقاصد کے حصول میں ناکام رہی لیکن اس نے اتنی تیزی سے مسلمانوں میں سیاسی بیداری پیدا کی کہ کانگرس نے جو فاصلہ 35 سال میں طے کیا تھا وہ مسلمانوں نے صرف تین سالوں میں طے کر لیا۔ بقول ڈاکٹر آئی ایچ قریشی اس نے مسلمانوں کو بڑی بڑی تحریکیں منظم کرنے کی ترغیب دی یہ تربیت حصول پاکستان کی جدوجہد میں بہت بڑا سرمایہ ثابت ہوئی یہ مسلمانوں کی پہلی عوامی تحریک تھی جس سے مسلمانوں کے حوصلے بلند ہوئے اور غیر مسلموں کے دلوں پر مسلمانوں کا رعب بیٹھ گیا ہندوؤں کی شدھی اور سنگٹھن کی تحریکیں اس کے رد عمل کا نتیجہ ہیں۔

تحریک خلافت نے اتحاد اسلامی کے لئے اہم کردار ادا کیا۔ اس تحریک نے مسلمانوں میں

غیرت ملی کا احیاء کیا۔ وزیر اعظم ترکیہ روف بے نے ڈاکٹر انصاری سے کہا کہ معاہدہ لوزان سے پہلے نہ جانے کتنی بار ہم سخت مایوس ہو کر ہتھیار ڈالنے پر آمادہ ہوئے تھے مگر پھر خیال آتا ہندی مسلمانوں کو کیا منہ دکھائیں گے۔

تحریک خلافت کی سرگرمیاں محض خلافت تک محدود نہ رہیں بلکہ اس نے ملکی آزادی میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ کیا جوہر کے عدالتی بیانات خود انگریزی راج کے خلاف اعلانِ جنگ نہیں کیا' حسرت موہانی نے اسی دور میں 1921ء ہی میں کامل آزادی کا اعلان نہ کر دیا تھا۔ اس لحاظ سے غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے مسلمانوں نے آزادی کے ہر مقام پر اپنے خون کا عطیہ پیش کیا۔

رولٹ ایکٹ 1919ء

سرسڈنی رولٹ (Sir Sidney Rowlatt) کی سرکردگی میں 1917ء کے آخری مہینوں میں ایک کمیشن بٹھایا گیا تھا۔ جس کے ذمہ ان اسباب کا تجزیہ کرنا تھا جو برصغیر میں باغیانہ سرگرمیوں کا موجب بن رہے تھے۔ نیز اس کمیشن کو ان کا علاج بھی تجویز کرنا تھا۔ کمیشن نے اپریل 1918ء کو اپنی رپورٹ پیش کردی اس رپورٹ کی بنیاد پر مارچ 1919ء میں "بغاوت اور انقلابی جرائم کا قانون" پاس ہوا جو تاریخ میں رولٹ ایکٹ کے نام سے مشہور ہے۔ اس قانون کا بنیادی مقصد عوام کی آزادی کو سلب کرنا اور ان کی سیاسی سرگرمیوں کو کچلنا تھا۔ اس کے تحت کسی بھی شخص کو محض شک وشبہ کی بنا پر مناسب عدالتی کاروائی کئے بغیر جیل میں بھیجا جا سکتا تھا۔ بے شک ایسے قوانین کی زمانہ جنگ میں ضرورت ہوتی ہے تاکہ دشمن اندرونی خلفشار اور افراتفری نہ پھیلا سکے۔ لیکن رولٹ ایکٹ اس وقت نافذ ہوا جب کہ جنگ ختم ہو چکی تھی ۔جس میں ہندوستانیوں نے بہت بڑا جانی نقصان برداشت کیا تھا۔ اس ایکٹ سے حکومت کی اس بددیانتی کا صاف علم ہوتا تھا کہ وہ اس کے ذریعے حاصل ہونے والے اختیارات کو ناجائز طور پر استعمال کرنا چاہتی ہے۔ تاکہ اس پر تنقید کرنے والے سیاسی راہنماؤں کو آسانی سے کچلا جاسکے۔ ہندوستانی راہنماؤں نے رولٹ کی رپورٹ کے منظرعام پر آتے ہی حکومت کو خبردار کیا تھا کہ اس رپورٹ میں جس جابرانہ قانون کو تجویز کیا گیا ہے اسے پاس نہ کیا جائے۔ قدرتی طور پر ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک اس کے خلاف احتجاج کا ایک طوفان کھڑا ہوگیا۔ بدقسمتی سے اس وقت مرکزی اسمبلی میں ہندوستانیوں اور انگریزوں کی تعداد بالترتیب 23 اور 34 تھی۔ انگریز اپنی اکثریت کی بنا پر اس کو قانون کی شکل دے سکتے تھے اس

کے باوجود ہندوستانی راہنماؤں نے کھل کر اس کے خلاف تقریریں کیں۔ قائد اعظمؒ نے اپنی مخصوص بیباکی اور جرات سے کام لیتے ہوئے اس بل کی سختی سے مخالفت کی اور تقریر کے دوران فرمایا:۔

"مجرمانہ سازش کا مسئلہ رولٹ کمیٹی نے اس طرح اٹھایا ہے جیسے کچھ جرائم پیشہ قبائل ہم میں دفعتاً نمودار ہو گئے ہیں اور اب ضروری ہے کہ ایک قانون بنا کر ان کا صفایا اور قلع قمع کر دیا جائے لیکن قانون بنانا مرض کا علاج نہیں تمہیں اپنی پالیسی ترک کرنی چاہیے یہ مجرمانہ سازشیں خود بخود دور ہو جائیں گی۔ اس کمیٹی نے ایسی سفارشات پیش کی ہیں جن کو کوئی بھی مہذب حکومت قبول نہیں کر سکتی بلکہ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔"

جب اس بل کو قانون حیثیت دے دی گئی جس کا پہلے ہی سے خدشہ تھا تو قائد اعظمؒ نے اس پر بطور احتجاج اسمبلی کی رکنیت سے استعفیٰ دے دیا۔ اس سلسلہ میں انہوں نے 28 مارچ 1919ء کو ایک خط وائسرائے ہند کو لکھا جس سے ان کی غیرت قومی اور جرات کردار کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔ آپ نے تحریر کیا:۔

"رولٹ ایکٹ کی منظوری اور اس پر آپ کی مہر تصدیق نے عوام کو برطانوی انصاف سے برگشتہ کر دیا ہے۔ عدل انصاف کے بنیادی تقاضوں کو تہس نہس کر دیا گیا ہے۔ لہٰذا میں آپ کے اس فیصلہ اور آپ کی حکومت کی اس روش کے خلاف احتجاج اور اظہار برہمی کے طور پر استعفیٰ دیتا ہوں۔" قائد اعظمؒ اور ان کا عہد از رئیس احمد جعفری، صفحہ 95

مسٹر گاندھی جو ان دنوں سیاست کی اونچی منازل پر تھے انہوں نے اس قانون کی منظوری کے بعد عوام سے اپیل کی کہ 6 اپریل کو ملک بھر میں عام ہڑتال کی جائے۔ چنانچہ اس اپیل پر پورے ملک میں ہڑتال رہی جلوس نکلے اور جلسے ہوئے اور پرجوش تقریروں کے ذریعے اس نئے جابرانہ اور بہیمانہ قانون کے خلاف تقریروں کے ذریعے اظہار نفرت کیا گیا۔ مسٹر گاندھی ان دنوں بمبئی میں تھے تمام سیاستدانوں اور حکومت کو یہ واضح علم تھا کہ ہر تحریک میں اہم کردار پنجاب نے ادا کرنا ہوتا ہے۔ چنانچہ عازم پنجاب ہوئے تو حکومت نے اُن کی پنجاب میں داخلہ پر پابندی لگا دی۔ جب وہ پلول ریلوے سٹیشن پر پہنچے تو ان کو وارنٹ دکھائے گئے مسٹر گاندھی نے تعمیل سے انکار کیا جس پر ان کو گرفتار کر کے واپس بمبئی بھیج دیا گیا۔ اسی شام یہ خبر امرتسر میں

پھیل گئی۔

10 اپریل کو ڈی سی مائلز ارونگ نے امرتسر کے دو نامی لیڈروں ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور ڈاکٹر ستیہ پال کو بات چیت کے لئے بلا بھیجا وہ جب آئے تو انہیں بند گاڑی میں بٹھا کر دھرسالہ روانہ کر دیا گیا۔ ان کی غیر حاضری سے عوام میں ان کی گرفتاری کی خبر پھیل گئی۔ چنانچہ ایک ہجوم ڈی سی کی کوٹھی کی طرف روانہ ہوا کہ ہمارے لیڈروں کو رہا کریں یا ہمیں بھی گرفتار کرلیں۔ ریلوے لائن پر پولیس نے انہیں روکا۔ ابھی باہمی بات چیت جاری ہی تھی کہ پولیس کے ایک سنتری نے گولی چلا دی۔ جواباً" لوگوں نے پولیس پر خشت باری کی اور پولیس نے فائر کھول دیا۔ لوگ منتشر ہو کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ بعض غنڈوں نے دو بینک لوٹ لئے اور دو انگریزوں کو قتل کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شہر میں دفعہ 144 نافذ کر دی گئی۔

12 اپریل کو جالندھر سے فوج طلب کر لی گئی جس کا کمانڈر بریگیڈیر ڈائر تھا۔ یہ اڈوائر سے کم بدخو' خود سر اور بد اندیش نہ تھا۔ اسی دن لاہور سے کمشنر بھی یہاں پہنچ گیا اور شہر فوج کے حوالے کر دیا گیا۔

جلیانوالہ باغ کا المیہ

13 اپریل کو بیساکھی کا تہوار تھا۔ دور دراز سے لوگ اس تہوار کو منانے آئے تھے۔ مارشل لاء کی وجہ سے عوامی جلسے ممنوع تھے لیکن اس کے باوجود ساڑھے چار بجے شام جلسہ عام کا اعلان کر دیا گیا۔ تمام وہ لوگ جو اس سیاسی ہنگامے سے بے خبر تھے وہ جلیانوالہ باغ میں جلسے کے لئے پہنچ گئے۔ کل حاضرین جلسہ کی تعداد پچیس ہزار سے زیادہ تھی (دی امرتسر ٹریجڈی 1919ء' از کپل دیو مالویا)۔ جلیانوالہ باغ امرتسر کا کوئی باغ نہیں تھا بلکہ ایک کھلا میدان ہے جو چاروں طرف سے مکانوں سے گھرا ہوا ہے اور مکانوں کی پشتیں اس کی جانب ہیں صرف ایک راستہ گلی کے طور پر اس میدان کو جاتا ہے۔

ڈائر نے جب اس جلسے کے بارے میں سنا تو فوراً" موقع پر پہنچا۔ وہ گلی روک کر کھڑا ہو گیا وہیں مشین گن نصب کر لی اور مجمع کو دو منٹ کے اندر اندر منتشر ہونے کا حکم دیا۔ اس کے ماتحت اس وقت 50 گورکھے اور 100 ہندوستانی سپاہی تھے۔ بیشتر اس کے کہ مجمع کچھ سمجھ پاتا

اس نے فائر کرنے کا حکم دے دیا یہ وحشت و بہمیت کا وہ نمونہ تھا جس کو ہلاکو کی ہلاکت اور چنگیز کی چنگیزیت دیکھ کر شرما جائے۔ یہ فائرنگ اس وقت تک جاری رہی جب تک آخری راؤنڈ بھی فائر نہ ہو گیا۔ فائرنگ کا رخ گنجان مجمع کی طرف تھا۔ سرکاری اعدادو شمار کے مطابق 1699 گولیاں چلائی گئیں جن سے 379 آدمی ہلاک اور 1200 آدمی زخمی ہوئے۔ غیر سرکاری اعدادو شمار اس کی نفی کرتے ہیں لوگ کہتے ہیں کہ صرف چند منٹوں میں 541 آدمی ہلاک ہو گئے چنگیز کے ظلم و ستم کا مقابلہ ذرا ڈائر کے ظلم سے کریں آپ اس نسب تناسب میں ڈائر کو چنگیز سے بڑا ظالم قرار دیں گے۔

فائرنگ کا یہ سانحہ شام پانچ اور چھ بجے کے درمیان واقع ہوا آٹھ بجے شام کرفیو کا اعلان ہو چکا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے بے گناہ افراد ہلاک ہونے والے اور جاں بلب زخمی وہیں میدان میں پڑے رہے اور کوئی رشتے دار یا مددگار ان کی مدد کو نہ پہنچ سکا۔ بلکہ تحقیقاتی کمیٹی میں ایک استفسار کے جواب میں ڈائر نے جواب دیا "زخمیوں کو سنبھالنا' اس کی ذمہ داری نہیں تھی۔"

نہ جانے کتنے آدمی صبح تک سسکتے ہوئے اپنی جان ہار بیٹھے اور مغربی تہذیب کا دلدادہ ہلاکت کے نشے میں چور شراب کے لنڈ کے لنڈ لنڈھاتا رہا۔ جب حادثہ جلیانوالہ کی خبر پنجاب کے دوسرے علاقوں میں پہنچی تو ہر جگہ ہنگامے شروع ہو گئے جن میں قابل ذکر مقامات گوجرانوالہ' سیالکوٹ' وزیر آباد' حافظ آباد' رام نگر' گجرات' لائلپور اور قصور ہیں۔ 15 اپریل سے پنجاب میں مارشل لاء نافذ کر دیا گیا تھا اس کے بعد فوجیوں نے لوگوں کے ساتھ کیا سلوک کیا یہ ایک دردناک اور غمناک داستان ہے۔ ان ظالموں نے چودہ چودہ سال کے بچوں کو ٹکٹکی پر باندھ کر بیس بیس کوڑے مارے۔ ایک پوری بارات کو معہ دولہا بلاوجہ کوڑوں سے پیٹا گیا عورتوں کی بے حرمتی کی گئی۔ لاہور کالج کے طلباء کو تین ہفتے تک حکم دیا گیا کہ وہ دن میں چار مرتبہ سولہ میل کا سفر طے کر کے منٹو پارک جا کر دھوپ میں کھڑے ہو کر حاضری دیا کریں۔ لوگوں کو حکم دیا گیا کہ وہ موٹر کاریں' موٹر سائیکلیں' بائسکلیں' بجلی کے پنکھے اور لیمپ آرمی کے حوالے کر دیں۔ لاٹھی لے کر چلنا اور پاس رکھنا ممنوع قرار دیا گیا۔

لوگوں کو بے عزت کرنے کے لئے مارشل لاء احکام کے پوسٹر لوگوں کے گھروں کے باہر لگا

دیئے جاتے اور انہیں مجبور کیا جاتا کہ وہ اس کی حفاظت کریں۔

دیال سنگھ کالج کی بیرونی دیوار پر قابل اعتراض قسم کا پوسٹر چسپاں کیے جانے کی بنا پر کالج کے پرنسپل کو دھر لیا گیا 250 روپے جرمانہ وصول کر کے چھوڑا گیا۔ اس کے بعد کالج کے تمام لڑکوں نے پہرا دینا شروع کر دیا اور ایک ایسے شخص کو ایسے پوسٹر چسپاں کرتے ہوئے پکڑ لیا۔ اسے پولیس کے حوالے کر دیا گیا مگر اس شخص کے خلاف کوئی کاروائی نہ کی گئی گویا یہ تخریب کار خود پولیس کا آدمی تھا اور لوگوں کو تنگ کرنے کے لئے مارشل لاء حکام اسے استعمال کرتے تھے۔

حادثے کی تحقیقات

ہر ظالم اپنے ظلم پر پردہ ڈالنے کے لئے عموماً" عدالت کا فائدہ اٹھاتا ہے کیونکہ عدالت ہی ان مظالم پر پردہ ڈالنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ اور غلام ملکوں میں عدالت کا کام حکومت کے قدم مضبوط کرنا ہوتا ہے۔ شدید عوامی دباؤ کے پیش نظر حکومت نے لارڈ ہنٹر کے زیر قیادت ایک تحقیقاتی کمیٹی بنائی جس کے ارکان ـــــــ جسٹس رینکن' مسٹر رائس' میجر جنرل سر جارج برو' پنڈت جگت نرائن' مسٹر ٹامس سمتھ' سر چمن لال سلواڈ اور صاحبزادہ سلطان احمد تھے۔ دوران مقدمہ عجیب وغریب انکشافات ہوئے - امرتسر کیس میں ایک سابق کلکٹر ہنس راج کا کردار بڑا گھناؤنا تھا۔ بینکوں کو لوٹنے اور انگریزوں کو قتل کرنے میں وہ پیش پیش تھا۔ 12 اپریل کو ایک احتجاجی جلسہ اس کی صدارت میں ہوا۔ 13 اپریل کو اس بد قسمت جلسے کا منتظم اعلیٰ بھی وہی تھا وہ جلسے کا اعلان کرنے والے ڈھنڈورچی کے ساتھ رہا تھا اور اس نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ جلسہ میں ڈاکٹر کچلو اور ستیہ پال کی طرف سے موصولہ پیغام پڑھ کر سنائے گا۔ اور جب گولی چلی تو بھاگتے ہوئے لوگوں سے اس نے بلند آواز سے کہا "بیٹھ جاؤ اے پھوکے فیرنے" لیکن دوران مقدمہ وہ سلطانی گواہ بن گیا۔

کوتوال شہر نے رپورٹ دی کہ شہر پولیس کے کنٹرول میں نہیں ہے۔ مگر وہ اسی رات سرکاری اعلان کے لئے ایک چھاپہ خانہ کھلوا کر بہت سے پوسٹر چھپوالایا۔ عوام کو پریشان کرنے کے لئے شہر میں 24 گھنٹے کے لئے بجلی اور پانی بند کر دیا گیا۔ اڈوائر اور کمشنر لاہور نے بغیر کسی قانونی جواز کے شہر میں دفعہ 144 یعنی مارشل لاء نافذ کر دیا تھا جس کا انہیں اختیار نہ تھا۔ اس

وحشیانہ فائرنگ میں مارے جانے والوں میں بہت سے بچے بھی شہید ہوئے۔

جرح کے دوران ڈائر کا رویہ عدالت کے لئے نہایت توہین آمیز اور گستاخانہ تھا۔ اس نے بعض سوالات کے جوابات میں صاف صاف کہا "میرے سپاہیوں نے فائرنگ کی اور خوب کی"۔ اور جسٹس رےلنکن جو اسی قوم کا ایک فرد تھا اس کے معذرت خواہانہ سوال "جنرل مجھے پوری صورت حال کو اس طرح پیش کرنے پر معاف رکھئیے گا لیکن جو کچھ ہوا وہ ایک حیثیت سے خوفناک، وحشت انگیز اور بھیانک تھا؟ اس نے جواب دیا نہیں ہرگز نہیں۔ یہ ایک ناخوشگوار فرض تھا جو مجھے انجام دینا پڑا۔ میرا خیال ہے جو کچھ میں نے کیا رحملانہ تھا۔ میں نے طے کیا کہ مجھے خوب اچھی طرح گولی چلانی چاہیے تاکہ مجھے یا کسی اور کو گولی نہ چلانی پڑے۔ یہ بالکل ناممکن تھا کہ میں مجمع کو گولی چلائے بغیر بھی منتشر کر سکتا تھا۔ اس طرح وہ دوبارہ اکٹھے ہو جاتے اور میرا مذاق اڑاتے۔ اس طرح میرا خیال ہے کہ میں اپنے آپ کو بیوقوف بناتا۔"

اڈوائر سامراج کا نمائندہ تھا اس نے سامراجیت کے دوام کے لئے یہ وحشیانہ قدم اٹھایا۔ جس کے بدلے میں اسے جنرل بنا دیا گیا تھا لیکن عدالت نے اسے بغیر پنشن کے ریٹائر ہونے کی سزا دی۔ اڈوائر ہندوستان اور پنجاب کو جلتا چھوڑ کر چلا گیا۔ بقول وکٹر ہیوگو مارکس آزادی کا بیج ہمیشہ جو روستم کے پانی کی آبیاری سے بار آور ہوتا ہے۔ غلام ہندوستان اس کے مظالم اور زیادتیوں کا انتقام نہ لے سکتا تھا۔ تاہم اس ظالم وحشی سے اس ملک کے ایک آزاد فرد نے انفرادی طور پر بدلہ لے لیا۔ ہوا یوں کہ 31 مارچ 1940ء کو انڈیا ہاوس نے اس کے اعزاز میں ایک دعوت دی۔ وہ ہندوستانیوں میں اپنی خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے چند کلمات ہی ادا کر پایا تھا کہ ہال کے ایک کونے سے ریوالور کی چھ گولیاں سنسناتی ہوئی اس کے سینے سے پار ہو گئیں وہ اوندھے منہ گرا۔ اور ساتھ ہی نعرہ بلند ہوا:

شہدائے جلیانوالہ باغ زندہ باد ------ برطانوی ملوکیت مردہ باد

اس نے اپنا نام رام محمد سنگھ آزاد بتایا۔ اس کو پھانسی کی سزا ہوئی۔ اعتراف جرم کرتے ہوئے اس نے کہا تھا "اگر میں ایسا نہ کرتا تو اپنے فرائض سے کوتاہی کرتا۔"

مسٹر گاندھی

تحریک خلافت میں مسٹر گاندھی کا نام بار بار آتا رہا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بزم سیاست کے اس ساحر سے مختصر سا تعارف حاصل کر لیا جائے۔ جو ایک طوفان کی طرح افق سیاست پر چھا گیا۔ تمام پرانے شاطر اس کی گرد راہ بننے پر مجبور ہو گئے۔ یہ 2 اکتوبر 1869ء کو پور بندر' کاٹھیاواڑ گجرات میں پیدا ہوا۔ اس کا والد ایک دیوان تھا۔ 12 سال کی عمر میں شادی 19 سال کی عمر میں لندن چلا گیا۔ وہاں بیرسٹری پاس کی۔ راجکوٹ اور بمبئی میں قانون کی پریکٹس کی لیکن کامیاب نہ ہوئے۔ وہ افریقہ گئے جہاں انہوں نے ہندوستانیوں پر مظالم کا مظاہرہ کیا۔ اور نسلی امتیاز کی برائیوں سے متاثر ہوئے کہ ایک مرتبہ وہ فرسٹ کلاس کے ڈبہ میں سفر کر رہے تھے کہ ایک یورپین نے انہیں وہاں سے باہر نکلوا دیا اسی تعصب کی بنا پر وہ کسی اچھے ہوٹل میں رہائش نہ رکھ سکے۔ یہیں انہوں نے "ستیہ گرہ" کی تربیت پائی۔

ہندوستان واپس آکر احمد آباد رہائش اختیار کی۔ اور اپنی سیاست کا آغاز صوبہ بہار کے علاقہ چمپارن سے کیا۔ یہاں پہلی مرتبہ نیل کے کاشتکاروں کی طرف سے نیل کے یورپی تاجروں کے خلاف آواز بلند کی۔ اور وہ احمد آباد کے مزدوروں کے قائد بن گئے۔ گاندھی جی نے اپنی اہمیت کو منوانے کے لئے "مرن برت" کا طریقہ ایجاد کیا۔ وہ اس سے دو کام لیتے۔ لوگوں سے ہڑتال کرانی ہو یا کوئی کام کرانا ہو تو برت رکھ لیتے اور دوسری طرف حکومت پر اثر انداز ہونا مقصود ہو تو بھی برت رکھ لیتے۔ گاندھی جی نے کتاب "سول نافرمانی" تو پڑھ رکھی تھی لیکن اس کا پہلی مرتبہ تجربہ "کھیدا" میں کیا۔ جہاں قحط سالی کی بنا پر فصلیں کم ہوئی تھیں۔ آپ نے حکومت سے اس سلسلہ میں چند مطالبات کئے جنہیں منظور نہ کیا گیا۔ آپ نے لوگوں کو

ٹیکس ادا نہ کرنے کی ترغیب دی۔

ابتداء میں آپ کی کوئی سیاسی حیثیت نہ تھی یہاں تک کہ 1915ء تک کانگریس کی سبجیکٹ کمیٹی کے رکن بھی نہ بن سکے تو صدر کانگرس لارڈ سہنا نے اپنے خصوصی اختیارات استعمال کر کے آپ کو ممبر بنوایا۔ 1919ء میں رولٹ ایکٹ کی بنا پر حکومت کے خلاف لوگوں کی نفرت عروج پر تھی۔ فضا کو سازگار پاکر آپ نے "ستیہ گرہ" کی تحریک کا آغاز کیا۔ اس کا آغاز دہلی فائرنگ سے ہوا اور انجام جلیانوالہ باغ کے سانحہ سے سوائے تباہی اور جانی نقصان کے اس سے کوئی مقصد حاصل نہ ہوا۔

انگریزوں کی بدعہدی' منافقانہ رویہ کی بنا پر جب تحریک خلافت کا آغاز ہوا تو گاندھی جی نے نہایت دانشمندی کا مظاہرہ کیا اور اس تحریک میں شامل ہو گئے۔ مسلمان جو انگریزوں کے خلاف تھے وہ جوش و خروش میں اندھے ہو چکے تھے انہوں نے ان کے جوش سے فائدہ اٹھانے کی نہات گھٹیا اور روباہیانہ حرکات کیں جن سے مسلمانوں بنیادی نصب العین کو بہت بڑا نقصان پہنچا۔ لیکن وہ خود ہندوستان کے چوٹی کے سیاستدان بن گئے۔ تحریک خلافت کے دوران جب چند دور اندیش مسلمانوں کی کوششوں سے مسلمانوں کی تحریک ہجرت ناکام ہو گئی اور گاندھی اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوئے تو انہوں نے "چوری چورا" کے واقعہ کو بہانہ بنا کر تحریک سے تقریباً" الگ ہو گئے۔ بے شک گاندھی ایک بہت بڑا شاطر تھا اگر اس کی وضع کردہ تحریک ہجرت کامیاب ہو جاتی اور مسلمان ہجرت کر کے افغانستان چلے جاتے تو ہندوؤں کے لئے ہندوستان میں ہندوراج کا خواب پورا ہو جاتا اور مسلمانوں کے لئے حقوق اور بعد میں علیحدہ وطن کا مسئلہ ابتداء میں ہی ختم ہو جاتا۔ یہ تو ان دور اندیش اور مخلص مسلمانوں کی بروقت سوچ کا ثمر ہے کہ یہ تحریک ناکام ہو گئی ورنہ گاندھی اپنی چال چل گیا تھا اور اس نے بغیر کسی تردد کے مسلمانوں کی ایک ہزار سالہ تاریخ اور کوششوں کو ختم کر دیا تھا۔

تحریک خلافت کے بعد جب مسلمانوں کا اتحاد پارہ پارہ ہو گیا۔ وہ مختلف ٹکڑوں میں بٹ گئے تو گاندھی جی اپنے اصلی ہندوانہ رنگ میں ظاہر ہونے لگے۔ انہوں نے بھانپ لیا کہ اب ہندوؤں کو آزادی کے بعد اور پہلے مسلمانوں سے لڑنا پڑے گا اور اس خانہ جنگی کے لئے ہندوؤں کو تیار کرنا چاہیے چنانچہ اس مقصد کے حصول کے لئے ہندوؤں کو تربیت دینا ضروری

ہو گیا تھا۔ نیز تحریک خلافت کے دوران مسلمان بڑی قوت کے ساتھ اس میں شریک ہوئے اور انہیں کانگریس کے نظام میں غلبہ رہا۔ اس امر نے انگریزوں پر واضح کر دیا تھا کہ مسلمان ایک اہم قوت ہیں۔ بلکہ ڈاکٹر امیڈکر کے بقول:

"کانگریس کو واقعی جو عظمت اور طاقت حاصل ہوئی ہے وہ ہندوؤں سے نہیں بلکہ مسلمانوں سے ہوئی ہے۔"

یہ چیز ہندو لیڈروں کے لئے وحشت کا سبب بنی نیز اس جوش مردانگی اور فعالت سے تحریک عدم تعاون میں مسلمانوں سے ظاہر ہوئی ہندوؤں کے لئے ضروری ہو گیا کہ وہ شدھی اور سنگھٹن جیسی تنظیموں کے ذریعے ہندوؤں میں جرات و مردانگی پیدا کریں۔ ان دونوں تحریکوں کا بنیادی مقصد ایک ہی تھا۔ جس کا اظہار لالہ ہردیال نے ان الفاظ میں کیا:

"میں اعلان کرتا ہوں کہ ہندوستان کی ہندو نسل اور پنجاب کا مستقبل ان چار ستونوں پر قائم ہے

1- ہندو سنگھٹن (ہندوؤں کا مضبوط و منظم ہونا)

2- مسلمانوں کا شدھی (مسلمانوں کو اسلام سے پاک کر کے ہندو بنانا)

3- ہندو راج

4- افغانستان اور سرحدی علاقے کی فتح اور شدھی

جب تک ہندو قوم یہ چار چیزیں حاصل نہیں کر لیتی اس وقت تک ہماری موجودہ اور آئندہ نسلوں کی سلامتی خطرے میں رہے گی۔ اور ہندو قوم کا سلامت رہنا غیر ممکن ہو جائے گا۔ ہندو نسل کی بس ایک ہی تاریخ ہے اور اس کے ادارے یک رنگ ہیں مگر مسلمان اور عیسائی ہندو مت کی حدود سے بہت زیادہ ہٹے ہوئے ہیں۔ کیونکہ ان کے مذہب اجنبی ہیں۔ اور وہ ایرانی عربی اور یورپی اداروں سے محبت کرتے ہیں اس لئے بالکل اسی طرح کہ آنکھ میں کوئی چیز پڑ جائے تو اسے باہر نکال دیتے ہیں ان دونوں مذہبوں کی بھی شدھی کر دینی چاہیے۔ اگلے زمانے میں افغانستان اور سرحد کے کوہستانی علاقے ہندوستان کا حصہ تھے۔ مگر آج کل ان پر اسلام کا غلبہ ہے بالکل اسی طرح جیسے چین اور نیپال میں ہندو مت ہے افغانستان اور سرحدی علاقوں میں ہندو ادارے ہونے چاہیں ورنہ سوراج (آزادی) حاصل کرنا بے کار ہے کیونکہ

پہاڑی قبیلے جنگجو اور بھوکے ہوتے ہیں اگر وہ ہمارے دشمن ہو گئے تو نادر شاہ اور زمان شاہ کا عہد از سرنو شروع ہو جائے گا۔ موجودہ زمانے میں انگریز حکام سرحدوں کی حفاظت کر رہے ہیں مگر ہمیشہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ اگر ہندو اپنی حفاظت کرنا چاہتے ہیں تو انہیں افغانستان اور سرحد کو فتح کرنا چاہئے اور تمام کوہستانی قبائل کے مذہب کو تبدیل کرا لینا چاہئے۔ برعظیم اور افغانستان سے اسلام کو باہر نکال دیا جائے اور اگر یہ نہیں ہو سکتا تو سوراج (آزادی) اس قابل نہیں ہے کہ اسے حاصل کیا جائے۔"

گاندھی جی جو عدم تشدد اور انتہا کے پرچارک تھے انہوں نے ان تحریکوں کی کبھی مذمت نہ کی بلکہ ہر ہندو مسلم فساد میں مسلمانوں کی ہلاکت میں خاموشی اختیار کر لی۔ اس کے باوجود وہ متحدہ قومیت کا راگ الاپتے رہے۔ ان کا یہ کردار نہایت گھناؤنا' گھٹیا اور منافقانہ نہ تھا نہرو رپورٹ نے جب مسلمانوں کی رہی سہی امیدوں پر بھی پانی پھیر دیا۔ اور محمد علی جوہر جنہوں نے تمام عمر کانگرس میں گذاری تھی انہوں نے اس رپورٹ کو مسلمانوں کی دائمی غلامی کا پھندا قرار دیا۔ لیکن گاندھی جی مہر بہ لب رہے۔ اور کہا تو اس قدر کہ مسلمان اپنی بے وقوفی کی بنا پر آزادی کو دور دھکیل رہے ہیں۔ انہوں نے گول میز کانفرنس کا بائیکاٹ کر دیا اور فوری آزادی کا مطالبہ کر دیا۔ حالانکہ اس سے دو سال قبل مولانا حسرت موہانی کی آزادی کی قرارداد کی آپ نے شدید مخالفت کی تھی۔ پھر جب کانفرنس میں شرکت کی تو کانگرس کے واحد نمائندہ کی حیثیت سے کی۔ انہوں نے ہندوستانی قومیت اور کانگرس کی واحد نمائندہ حیثیت پر زور دیا۔ اقلیتوں کے مسائل کے حل کی راہیں بند کر دیں ریمزے میکڈانلڈ وزیر اعظم برطانیہ نے کمیونل ایوارڈ کے رو سے جداگانہ انتخابات کو برقرار رکھا تو مرن بھرت رکھ لیا۔ جس کے دباؤ میں آ کر اچھوتوں نے پونا پیکٹ کی رو سے اپنے جداگانہ حق سے دست برداری کا اعلان کر دیا۔

1934ء میں کانگرس سے ریٹائرڈ ہو گئے۔ لیکن اس کے باوجود وہ لیڈر ہی رہے۔ اب ان کی حیثیت "باپو جی" کی ہو گئی۔ اور اس حیثیت سے آپ نے بڑے بڑے کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ انگریزوں سے وزارتوں کا سمجھوتہ' "ہندوستان چھوڑ دو تحریک" اور قائد اعظمؒ سے بات چیت اور دیگر اقدامات آپ کے کارنامے ہیں۔

بدقسمتی سے گاندھی جی ایک ایسے چیستاں ہیں جن کا ضمیر منافقت میں رچا بسا تھا۔ وہ جب

دلائل کا جواب نہ دے پائے اور قائداعظمؒ کے دلائل کو ماننے کے بغیر کوئی چارہ کار نہ رہتا تو کہتے یہ میری ذاتی بات چیت تھی کانگرس اس کو تسلیم کرنے پر مجبور نہیں کبھی وہ اپنی اندر کی آواز کا جھانسا دینے کا ڈھونگ رچاتے۔ وہ آہنسا اور عدم تشدد کے پرچارک تھے لیکن جب ہندو مسلمانوں پر ظلم و ستم کرتے ان کی عصمتوں کو لوٹتے اور قتل و غارت کرتے تو خاموش ہو جاتے۔ ہندوؤں کی بہمیت کے خلاف ذرا برابر زبان نہ کھولتے اس کے برخلاف جب کوہاٹ اور دوسرے علاقوں میں مسلمانوں کے ہاتھوں ہندوؤں کی گت بنتی تو رحم اور محبت و اخوت کا درس دیا جانے لگتا۔ انہوں نے متحدہ قومیت کا ایسا سحر انگیز راگ الاپا کہ ابوالکلام آزاد اور ان کی قبیل کے بہت سے لوگ ان کے بے دام غلام بن گئے۔ غفار خان اور ان کا خاندان ہمیشہ ان کا چیلا رہا۔ وہ ثقافتی طور پر مسلمانوں کو ہندوؤں میں جذب کرنا چاہتے تھے اس مقصد کے حصول کے لئے انہوں نے عمر بھر جدوجہد کی اور جمیعت العلمائے ہند کے قائدین اور دیگر علمائے دین کو آلے کے طور پر استعمال کیا۔ یہ انہی لوگوں کی کوتاہ نظری اور قائداعظمؒ سے تعصب تھا کہ مسلمانوں کو ان کے جائز حقوق نہ ملے اور پاکستان کو نقصان ہوا۔

وہ میکیاولی اور چانکیہ کا نہایت اعلیٰ درجہ کا پیروکار تھا۔ تمام عمر ہندو رہا لیکن لوگوں میں مساوات اور برابری کی باتیں کرتا رہا۔ وہ نہایت اعلیٰ درجہ کا سیاسی دماغ رکھتا تھا۔ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی نفسیات کو جانتا تھا اسے تمام لیڈروں' فرقوں اور گروہوں کو خوش رکھنے کا ڈھنگ آتا تھا۔ وہ مسلمانوں کی علیحدگی کے خلاف تھا اس نے قیام پاکستان کی راہ میں ہر ممکن رکاوٹ پیدا کی۔ یہاں تک کہ قائداعظمؒ کو کل ہند کا وزیراعظم بھی بنانے کو تیار ہو گیا۔ اس نے اس راہ میں ہندو مت کو بھی کھینچ لیا۔ اور کہہ دیا کہ تقسیم ہند کا مطلب "گاؤ ماتا" کے ٹکڑے کرنا ہے۔ یعنی آہنسا کا پجاری مذہب کے نام پر لوگوں کو اشتعال دے رہا ہے۔

وہ ایک بہت بڑا سیاسی قائد تھا۔ جس نے "مہاتما" کا مرتبہ پایا۔ اس کے خون کا ہر قطرہ ہندوؤں کا محافظ و معاون اور دردخواہ اور مسلمانوں کا دشمن تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ بہت کوتاہ اندیش مسلمان قائدین کا ملجا و ماویٰ تھا۔ وہ عزم و ہمت کا پیکر تھا۔ انہوں نے مادر وطن کے لئے سب کچھ برداشت کیا یہاں تک کہ آخر ایک ہندو کی گولی کا نشانہ بھی بنے۔ لیکن مادر وطن اور ہندوؤں کے مفاد کے خلاف کبھی ایک لفظ بھی زبان سے نہ نکالا۔ بلاشبہ ہم انہیں ایک اعلیٰ

سیاسی قائد کہہ سکتے ہیں۔ پاک و ہند کی اس صدی کی تاریخ ان کے بغیر مکمل ہو ہی نہیں سکتی انہوں نے ہندوؤں کے لئے گرانقدر خدمات انجام دیں۔ جن کی بنا پر وہ ہندوؤں کے "باپو" اور بعض مسلم قائدین مثلاً" ابوالکلام آزاد اور خان عبدالقادر خان کے سیاسی رہبر ہیں۔ حالانکہ یہ وہی ہندو قائد تھا جس نے "ینگ انڈیا" میں لکھا تھا:

"مسلمان یا تو عرب حملہ آوروں کی اولاد ہیں یا ہم میں جدا کئے گئے ہیں۔ اب اپنا وقار بحال رکھنے کے لئے ہمیں یا تو انہیں شدھی بنانا چاہئے یا عرب کو واپس بھگانا چاہئے یا ہند میں ہی غلام بنا کر رکھنا چاہئے۔"

مولانا ظفر علی خان نے اس شخصیت کا بڑا خوب تجزیہ پیش کیا ہے:

بھارت میں بلائیں دو ہی تو ہیں اک ساور کر اک گاندھی ہے
اک جھوٹ کا چلتا جھکڑ ہے۔ اک مکر کی اٹھتی آندھی ہے

ہندو مسلم اتحاد--- تعمیرو تخریب کے بھنور میں

ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار
یاالٰہی یہ ماجرا کیا ہے
(غالب)

اس کو بدقسمتی کہیں یا مسلمانوں کی سادہ لوحی کہ مسلم اکابرین نے ہمیشہ صدق دل سے ہندو مسلم اتحاد کے لئے جدوجہد کی۔ اور وہ ہندوستان کی آزادی کے لئے ہندو مسلم اتحاد کو بنیادی اہمیت دیتے تھے۔ لیکن ہندو کبھی اس معاملے میں مخلص نہ تھا وہ ضرورت اور حالات کے مطابق مرغ بادنما کی طرح اپنا رخ بدلتا رہتا تھا۔ اس نے ہمیشہ اپنی قدیم روایات کے مطابق بغل میں چھری اور منہ میں رام رام کا ورد رکھا۔ مہاتما گاندھی کے ایماپر جب ہجرت تحریک چلی اور ناکام رہی تو ہندوؤں کے لئے یہ بہت بڑا المیہ بن گئی۔ اس نے جب دیکھا کہ مسلمان اس کے جال میں نہیں پھنسا تو اس نے اپنی عددی برتری کی بناپر مسلمانوں کا صفایا کرنے کی ٹھانی۔ اس مقصد کے لئے ہندوؤں نے مختلف تحریکیں شروع کیں۔ ان میں سنگھٹن اور شدھی کی تحریکیں بہت اہم ہیں۔

سنگھٹن کی تحریک

یہ ہندو مہاسبھا کا ایک منصوبہ تھا اس کا اصلی بانی ڈاکٹر مونجے تھا جس نے 1922ء میں اس کا آغاز کیا۔ اس تحریک کے ذریعے ہندوؤں کو یہ احساس دلایا گیا کہ سات کروڑ مسلمان بائیس کروڑ ہندوؤں کے لئے شدید خطرہ ہیں۔ اور مسلمان تیزی سے بڑھ رہے ہیں اگر یہ اسی طرح

بڑھتے رہے تو کچھ مدت بعد یہ ہندوؤں سے بڑھ جائیں گے اور ہندوؤں کا صفایا کر دیں گے۔ لہٰذا ہندوؤں کو اپنے دفاع کے لئے مسلح ہونا چاہئے۔ اس تحریک کے تحت ملک بھر میں ایسے مراکز مقرر کئے گئے جہاں ہندوؤں کو ورزش' کشتی' جوڈو کراٹے' لاٹھیوں اور خنجروں کا استعمال سکھایا جاتا۔ ہندوؤں کے دل بڑھائے جاتے۔ انہیں مسلمانوں پر حملہ کرنے کی تربیت دی جاتی تاکہ فسادات کے دوران ہندو جم کر لڑ سکیں یہی سنگھٹن بعض مقامات پر نیم فوجی تنظیم کی حیثیت اختیار کر کے "مہابیر دل' کہلانے لگی۔ بعد میں یہی مہابیر دل ہندوؤں کی انتہا پسند تنظیم " راشٹریہ سیوک سنگھ" کے لئے بنیاد بنی اور پھر اس کے بطن سے موجودہ انتہا پسند بھارتی پارٹی" جن سنگ" نے جنم لیا۔

یہی وہ تنظیم ہے جس کے رضا کار ہندو مسلم فسادات میں مسلمانوں پر حملہ کرنے والے ہوتے تھے اور تقسیم ملک تک مسلمانوں کے قتل عام میں ہمیشہ پیش پیش ہوتے تھے۔ ڈاکٹر مونجے نے واضح کیا کہ ہندوستان اسی طرح ہندوؤں کا ملک ہے جس طرح برطانیہ انگریزوں اور فرانس فرانسیسیوں کا ملک ہے۔ نہر دیال جو غدر پارٹی کے قائدین میں سے تھا اس نے اس تحریک میں بھرپور حصہ لیا اس نے واضح کیا "ہندو سنگھٹن کا مقصد ہندوستان میں ایک مضبوط' طاقتور' متحد اور بیدار سیاسی جماعت کی تشکیل ہے جو ایک آزاد ہندو ریاست کے قیام کے لئے پیہم کوشش کرے گی۔ اور یہ ہندو ریاست ہندوؤں کی قومی روایات پر مبنی ہو گی۔ مثلاً" سنسکرت زبان' ہندوی زبان' ہندو میلے' ہندو قومی ہیروں کا احترام' ہندوؤں کے مقدس مقامات کی محبت اور ہندوؤں کی ثقافت سے محبت" اس نے مسلمانوں کو بتایا کہ وہ رفتہ رفتہ شدھی کے ذریعے ہندو مت میں جذب ہو جائیں۔ وہ ہندوؤں کی رسومات اپنا لیں۔ ہندو اکابرین کا احترام کریں اور اپنے آپ کو محمڈن ہندو کہلایا کریں۔

شدھی کی تحریک

یہ خالص ہندوانہ تحریک تھی جس کا مقصد یہ تھا کہ برصغیر کے غیر ہندوؤں کو ہندو بنایا جائے اس کا اصل محرک شردھانند تھا۔ جس کا اصل نام منشی رام تھا۔ وہ بنارس کا باسی تھا اس نے اپنی عملی زندگی کا آغاز ایک سب انسپکٹر پولیس کی حیثیت سے کیا۔ پھر وکالت پیشہ کیا وہاں بھی

طبیعت نہ لگی تو منیاس لے ہردوار جا دھونی رمائی۔ وہیں اسے سوامی شردھانند کا خطاب ملا۔ وہیں اس نے 1902ء میں اکیڈمی کی بنیاد رکھی جس کا بنیادی مقصد قدیم ہندی فلسفہ اور ادب پر تحقیق کرنا اور ٹیکسلا و نالندہ یونیورسٹیوں کے علم کا احیاء تھا۔ نیز چھوٹے ہندو بچوں کو ایسی تربیت دینا کہ وہ عیسائی مشنری جیسا رول ادا کر سکیں۔ اسی قسم کی ایک اکیڈمی دولت پور بنگال میں بھی قائم کی گئی۔ رولٹ ایکٹ کے ہنگاموں کے دوران اس نے نیم مذہبی اور نیم سیاسی قائد کی حیثیت اختیار کر لی اور اتنی گرم جوشی سے کام کیا کہ سادہ دل مسلمان اس کو کندھوں پر اٹھا کر جامع مسجد دہلی میں لے گئے۔ جہاں اس نے منبر پر کھڑے ہو کر تقریر کی۔ اس کے بعد اس نے تحریک عدم تعاون میں حصہ لیا اور 1920ء میں گرفتار کر لیا گیا۔ مگر سزا پوری کئے بغیر ہی رہا ہوا۔ جلد ہی اس کے بعد معلوم ہو گیا کہ اسے غیر مشروط طور پر کیوں رہا کیا گیا۔ اس نے ہندو مسلم اتحاد کو تباہ کرنے کا کام شروع کر دیا۔ وہ دونوں قوموں کے مذہبی اختلافات کو ہوا دیتا۔ اور لوگوں کو باہم لڑاتا۔ اس نے سوامی دیانند کی تحریک آریہ سماج کو زندہ کیا اپنا ہیڈ کوارٹر دہلی اور ذیلی مرکز لاہور میں رکھا۔ اس نے ہر جگہ آشرم کھولے مسلمانوں اور ان کی محترم شخصیات کے خلاف دشنام طرزی شروع کر دی۔ اس نے کہا کہ ہندوستان میں اسلام یا مسلمان ہندی چیزیں بالکل نہیں ہیں۔ آریہ ورت کو ان خارجی عناصر سے پاک کرنا ضروری ہے 1920ء میں تحریک خالص ہندو تحریک کو سیاسی پروگرام میں شامل کر لیا گیا۔ اور ڈاکٹر مونجے جیسے سیاست دان اس کی نگرانی کرنے لگے۔ ایک ہندو لیڈر کے مطابق "جب شدھی کے ذریعے تمام مسلمان ہندو ہو جائیں گے تو ہماری آزادی کے راستے میں کوئی قوت حائل نہیں ہو سکے گی۔" ڈاکٹر مونجے نے واضح الفاظ میں کہا کہ "تم اس وقت تک مسلمانوں کو ہندو بنانے میں کامیاب نہیں ہو سکتے جب تک تم ثابت نہ کر سکو کہ تمہارے جسموں میں جان ہے۔"

لالہ ہردیال نے اس ضمن میں یہ اعلان کیا: "میں اعلان کرتا ہوں کہ ہندوستان کی ہندو نسل اور پنجاب کا مستقبل ان چار ستونوں پر قائم ہے

1- ہندو سنگٹھن (ہندوؤں کا مضبوط اور منظم ہونا)

2- مسلمانوں کی شدھی (مسلمانوں کو اسلام سے پاک کر کے ہندو بنانا)

3- ہندو راج

4- افغانستان اور سرحدی علاقے کی فتح اور شدھی

جب تک ہندو قوم یہ چار چیزیں حاصل نہیں کر لیتی اس وقت تک ہماری موجودہ اور آئندہ نسلوں کی سلامتی خطرے میں رہے گی۔ اور ہندو قوم کا سلامت رہنا غیر ممکن ہو جائے گا۔ ہندو نسل کی بس ایک ہی تاریخ ہے اور اس کے ادارے یک رنگ ہیں مگر مسلمان اور عیسائی ہندو مت کی حدود سے بہت زیادہ ہٹے ہوئے ہیں کیونکہ ان کے مذہب اجنبی ہیں۔ اور وہ ایرانی' عربی اور یورپی اداروں سے محبت کرتے ہیں۔ اس لئے بالکل اسی طرح جس طرح کہ آنکھ میں کوئی چیز پڑ جائے تو اسے باہر نکال دیتے ہیں ان دونوں مذہبوں کی بھی شدھی کر دینی چاہئے۔ اگلے زمانے میں افغانستان اور سرحد کے کوہستانی علاقے ہندوستان کا حصہ تھے۔ مگر آج کل ان پر اسلام کا غلبہ ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے نیپال پر ہندو مت ہے۔ افغانستان اور سرحدی علاقوں میں ہندو ادارے ہونے چاہیں۔ ورنہ سوراج (آزادی حاصل کرنا) بے کار ہے کیونکہ پہاڑی قبیلے جنگجو اور بھوکے ہوتے ہیں اگر وہ ہمارے دشمن ہو گئے تو نادر شاہ اور زمان شاہ کا عہد از سر نو شروع ہو جائے گا موجودہ زمانے میں انگریز حکام سرحدوں کی حفاظت کر رہے ہیں مگر ہمیشہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ اگر ہندو اپنی حفاظت کرنا چاہتے ہیں تو انہیں افغانستان اور سرحد کو فتح کرنا چاہئے اور تمام کوہستانی قبائل کے مذہب کو تبدیل کرا لینا چاہئے۔ ہر عظیم اور افغانستان سے اسلام کو باہر نکال دیا جائے اور اگر یہ نہیں ہو سکتا تو سوراج (آزادی) اس قابل نہیں ہے کہ اسے حاصل کیا جائے۔" مارشل لاء سے مارشل لاء تک' از منظور احمد

شدھی کا آغاز ملکانا راجپوتوں سے کیا گیا جو زیادہ تر صوبہ یو پی کے مغربی علاقوں اور راجپوتانہ کے مشرقی حصوں میں رہتے تھے۔ یہ مسلمان ضرور ہو گئے تھے لیکن ان کی اکثریت اسلامی تعلیمات سے بے بہرہ تھی۔ وہ ہندوؤں جیسی رسومات اور خیالات میں پھنسے ہوئے تھے اور سید نور احمد صاحب کے بقول ان لوگوں نے اپنی چالاکی اور عیاری سے ہندوؤں اور مسلمانوں ہر دو سے خوب دولت کمائی ہندوؤں نے اس تحریک کو مذہبی جذبہ سے شروع کیا اور تمام قوم نے اس مشن میں حصہ لیا اس مشن کی تکمیل کے لئے ہندو بے غیرتی کی انتہا تک پہنچ گئے لاہور میں ایک کھلی گاڑی میں نوجوان خوبصورت کنواری ہندو لڑکیوں نے جلوس نکالا اور پوسٹروں پر لکھا ہوا یہ نعرہ ان کے ساتھ تھا "شدھ ہو جاؤ' پسند کر لو" (اردو ڈائجسٹ' لاہور

،اپریل 1971ء، صفحہ نمبر 102)

اثرات

فرقہ وارانہ فسادات:

ان تحریکوں نے ہندوستان کی تاریخ پر بڑے دور رس اثرات مرتب کئے ہندو اور مسلمان جو مدتوں سے ایک ہی معاشرے میں باہم مل جل کر زندگی بسر کر رہے تھے وہ فرقہ وارانہ فسادات کی زد میں آ گئے۔ 10 محرم 1922ء کو پہلا فساد ملتان میں ہوا پھر دہلی، الہ آباد، لکھنؤ، ناگپور، جبل پور، گلبرگہ، شاہ جہان آباد، کوہاٹ اور ہر جگہ فسادات کی آگ پھیل گئی ان فسادات کی سختی کا اندازہ لارڈ ارون کی اس تقریر سے بھی ہوتا ہے جو اس نے 29 اگست 1927ء کو مرکزی مجلس قانون ساز کے سامنے کی تھی اس نے بتلایا "ایسے بلوؤں میں گزشتہ صرف اٹھارہ ماہ میں 250 آدمی ہلاک اور 2500 زخمی ہوئے اور یہ بلوئے آج تک ہندوستان کا مقدر بنے ہوئے ہیں۔ اعداد و شمار کے لحاظ سے تقریباً" ہر روز ایک بلوہ ہوتا ہے"۔ ڈاکٹر امیسڈکر کے مطابق 1929ء سے 1938ء تک کے عرصہ میں ایسے فسادات 210 دن تک جاری رہے ان میں 560 آدمی مارے گئے اور 5400 زخمی ہوئے۔

سیاسی اثرات:

بدقسمتی سے ہندو کانگرس پر مہا سبھائی ذہنیت غالب آنے لگی کانگرس کا ستمبر 1923ء میں دہلی میں اجلاس ہوا لالہ لاجپت رائے اور ڈاکٹر انصاری کو فرقہ وارانہ فسادات کا حل تلاش کرنے کو کہا گیا انہوں نے سولن کے مقام پر پھر جداگانہ انتخابات، بنگال اور پنجاب میں مسلم اکثریت اور حق گاؤ کشی کو تسلیم کر لیا لیکن کانگرس نے لاجپت رائے کو لیڈر ماننے سے انکار کر دیا۔ 1924ء میں کانگرس نے لکھنؤ پیکٹ کو ہی مسترد کر دیا۔ اور انہی لائنوں پر چل کر نہرو رپورٹ نے ہندو مسلم اتحاد کے تابوت پر آخری کیل لگا دی۔

مذہبی اثرات:

یہ تحریکیں اپنا کام کر رہی تھیں کہ مسلمانوں کو بھی ہوش آ گیا اور مولانا محمد علی جوہر نے

بطور صدر کانگرس کے اجلاس منعقدہ 1923ء میں کہا کہ مسلمانوں کو ہندوؤں کا شکر گزار ہونا چاہئے کہ انہوں نے ملکانہ راجپوتوں میں اسلام کی تبلیغ کے سلسلہ میں انہیں ان کا فرض یاد دلایا ہے" اس کے بعد مسلمانوں نے اس سمت توجہ دی اور خواجہ حسن نظامی نے اپنے پرچے "منادی" میں تبلیغ و تنظیم کے نام سے دو تحریکیں شروع کیں اور جا بجا ان کے مرکز کھلنے لگے۔ دیو بندی اور بریلوی تمام علماء نے اس کار خیر میں حصہ لیا انہوں نے آریہ سماجیوں سے مناظرے کئے اور بر سر عام انہیں نظریاتی طور پر شکستیں دیں۔ مولانا الیاس برنی (خدا انہیں غریق رحمت کرے) نے ایک لاکھ ہندوؤں کو مسلمان کیا۔

------نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی (نعوذ باللہ) توہین------

آریہ سماجیوں نے ان تحریکوں کے ذریعے کئی محاذ کھول رکھے تھے دیگر محاذوں پر تو مسلمانوں نے بوجوہ صبر و تحمل کا مظاہرہ کیا لیکن ایک محاذ ایسا تھا جو ان کی قوت برداشت سے باہر تھا۔ یہ ناقابل برداشت محاذ ان کا نشر و اشاعت کا محاذ تھا۔ ہندو نشر و اشاعت کے ذریعے رسول کریم ﷺ (فدا ابی و امی) کی ذات اقدس کے بارے میں نہایت گند اور دل آزار مواد شائع کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ چیز ہر مسلمان کی برداشت سے باہر ہے وہ اس کے مقابلے میں جان و مال، اولاد اور عزت و مرتبہ سب کچھ قربان کر سکتا ہے۔ بد قسمتی سے حکومت بھی انگریز کی تھی جو خود متعصب اور تنگ نظر تھا اس سے انصاف کی امید نہ تھی اس لئے مسلمانوں کو اس مسئلہ کی روک تھام کے لئے خود جان پر کھیل جانا پڑا اس ضمن میں ہم چند عظیم شہیدوں کا ذکر کریں گے۔

قاضی عبد الرشید شہید

اس میدان کے سب سے پہلے شاہسوار قاضی عبد الرشید بنے۔ وہ یو پی کے رہنے والے ایک کاتب تھے۔ انہیں اس فتنہ کا علم ہوا وہ اس مقصد کے لئے افغانستان گئے وہاں سے ایک پستول خریدا اور واپس آ گئے۔ 17 دسمبر 1926ء کو شردھانند کے آشرم میں داخل ہوئے اور تابڑ توڑ فائر کر کے اس بدذات کو واصل جہنم کیا وہ خود گرفتار ہوئے انہیں پھانسی دے کر سرفراز کیا گیا اس اہم مقدمہ کی عظمت کا اندازہ صرف اس بات سے ہو سکتا ہے کہ اس کی تمام

رپورٹنگ مولانا محمد علی جوہر نے خود کی۔

غازی علم الدین شہید

اس سانحہ کے بعد ضرورت تو اس امر کی تھی کہ ہندو کوئی عبرت حاصل کرتے لیکن وہ اپنی کثرت اور انگریز کی سرپرستی کے نشے میں چور تھے انہوں نے کوئی سبق حاصل نہ کیا اور وہ بدستور مسلمانوں کی دل آزاری میں بڑھتے رہے اسی زمانہ میں ایک لعین کتب فروش راجپال نے ایک کتاب "رنگیلا رسول" چھاپی پہلے پہل تو یہ کتاب مسلمانوں کی نظروں سے اوجھل رہی لیکن بعد میں اس کا علم ہو گیا تو ہندوستان کے طول و عرض میں اس کے خلاف احتجاج شروع ہوا۔ تعزیرات ہند دفعہ A - 152 کے تحت مقدمہ چلا۔ راجپال کو سزا ہو گئی جو سیشن عدالت میں بھی برقرار رہی پھر راجپال نے تقریباً" تین سال کی عدالتی کارروائی کے بعد 1927ء میں ہائیکورٹ میں اپیل دائر کر دی جسٹس کنور دلیپ سنگھ نے ملزم کو بری کر دیا اور فیصلہ دیا کہ جرم متعلقہ قانون کی زد میں نہیں آتا۔ لوگ حیران رہ گئے کہ کیا واقعی قانون میں یہ سقم ہے یا یہ فیصلہ دلیپ سنگھ کی متعصبانہ ذہنیت کا شکار ہے سرکردہ مسلمانوں کا ایک وفد سر شفیع کی قیادت میں گورنر سے ملا اور اسے اصلاح احوال کی طرف توجہ دلائی گورنر نے ٹال مٹول کیا بلکہ قرائین یہ کہتے ہیں کہ یہ سب کچھ انگریزوں کے ایما پر ہو رہا تھا اب مسلمانوں نے جب دیکھا کہ عدل و انصاف کے راستے مسدود کر دیئے گئے ہیں تو قدرتی طور پر ان کے دلوں میں انتقام کی آگ کھولنے لگی تو ان فدایان اسلام اور عاشقان رسولؐ میں ایک شخص علم الدین بھی تھا اس نے دل ہی دل میں راجپال کو جہنم رسید کرنے کی ٹھانی۔ وہ بغل میں خنجر دبائے موقع کی تلاش میں رہا آخر 9 اپریل 1929ء کو اللہ تعالیٰ نے اسے موقع عطا کیا وہ اسے دکان میں اکیلا پا کر اس کی دکان میں گیا اپنے خنجر کے پے در پے واروں سے اسے واصل بہ جہنم کیا اور خود گرفتار ہو گیا یہ معاملہ اتنی شہرت حاصل کر گیا کہ مقدمہ بڑے زور و شور سے چلا۔ وکلاء صفائی کے کہنے کے باوجود غازی علم الدین نے اعتراف جرم سے انکار نہ کیا اور کہا کہ وہ جھوٹ بول کر اپنی جان بچانے کی سوچ کر اپنے عمل کو ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ آخر اس جلیل المرتبت انسان کو میانوالی جیل میں پھانسی دے دی گئی۔

اب شہید کے جنازے اور تجہیز و تکفین کا معاملہ درپیش تھا حکومت کسی اور فساد کے خوف سے صرف اس شرط پر لاش ورثاء کے حوالے کرنے کو تیار تھی کہ تجہیز و تکفین میں چند آدمی شریک ہوں مگر مسلمان یہ ماننے کو تیار نہ تھے آخر سر شفیع کی قیادت میں مسلمانوں کا ایک وفد گورنر سے ملا۔ خاصی ردو کد کے بعد جب انگریز لاش دینے کو تیار نہ ہوئے تو سر شفیع نے کہاکہ اگر آج میرا یہ مطالبہ نہیں مانا جاتا تو کل میں کسی معاملے میں مسلمانوں کو حکومت سے تعاون کرنے کے لئے نہیں کہہ سکوں گا۔ گورنر کو انگریزی حکومت کے مفادات عزیز تھے وہ سر شفیع کی ذمہ داری میں لاش دینے کو تیار ہو گیا۔ جنازے میں لاہور اور بیرون لاہور سے آئے لاکھوں مسلمان شریک ہوئے اور وہ سب شہید کی تدفین کے بعد پرامن طور پر منتشر ہو گئے۔

ہندو مسلم فسادات کی وجوہ

ہندو اور مسلمان دو ایسی قومیں ہیں جو مدتوں اکٹھی زندگی گزارنے کے باوجود نہ متحد و یکجان ہوئی ہیں نہ ہو سکیں گی۔ ان میں مذہب' معاشرت' قانون' تاریخ' فکرو نظراور معاش و اقتصاد کا بعد المشرقین ہے۔ ان کے اندر اتنی بڑی اختلافات کی خلیج حائل ہے جس کو کبھی پاٹا نہیں جاسکتا ان کی تاریخ باہم تصادم کی تاریخ ہے مسلمان فاتح کی حیثیت سے ہندوستان میں آئے تو قدرتی طور پر ان کے درمیان مختلف جنگیں ہوئیں جن میں اکثر ہندوؤں کو شکست ہوئی جس کا ان کے دل میں بڑا دکھ اور کرب تھا۔ اسی بنا پر ہندو تنظیمیں' شاعر اور مورخ وقتاً" فوقتاً" اپنا دکھ اور کرب تحریر و تقریر میں ظاہر کرتے رہتے ہیں۔ دنیا کی ہر تحریک زود یا بدیر مٹ جاتی ہے لیکن جو تحریر خون سے لکھی جائے وہ کبھی نہیں مٹتی۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوؤں نے مسلمانوں کا ہمیشہ خون بہایا' اسے جب موقع ملا۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی بھارت اور کشمیر میں مسلمانوں کا خون بہایا جارہا ہے۔

ہندو اور مسلمان دو مختلف اور متضاد تہذیبوں کے نام ہیں ایک شرک ہے تو دوسرا توحید پرست' ایک کی عبادت گانا بجانا ہے تو دوسرے کی عبادت سکون و خاموشی میں ہوتی ہے۔ ہندو گائے کو دیوتا مانتے ہیں تو مسلمان اس کا گوشت کھاتے ہیں۔ ہر قوم کا ہیرو دوسرے کا دشمن ہے ہر دو کا مذہب' معاشرت' تہذیب و فلسفہ' عادات و اطوار' رہن سہن' ادب و ثقافت اور فنون لطیفہ ہر ایک سے الگ اور جدا ہیں بلکہ کئی حالتوں میں متصادم ہیں۔ لہذا یہ لوگ مذہب کی آڑ میں قتل وغارت کرتے۔

ہندو اور مسلمانوں میں ذبیحہ گاؤ بڑی وجہ فساد تھی۔ ہندوؤں کے نزدیک یہ ایک مقدس اور لائق پرستش جانور ہے یہاں تک کہ موجودہ بھارتی سیکولر دستور کے افتتاحیہ میں بھی گائے

کے مقدس ہونے کا ذکر موجود ہے۔ مگر مسلمان نہ صرف اس کا گوشت کھاتے ہیں بلکہ عید قربان پر اس کی قربانی بھی دیتے ہیں اس لئے زیادہ فسادات اس کی بناء پر ہوتے تھے۔ گاندھی جیسے مکار شخص کو بھی ایک بار کہنا پڑا "گائے کی حفاظت کا مسئلہ سوراج سے کم نہیں اور پکا ہندو وہ ہے جو گائے کی حفاظت کرے"۔

بنیادی طور پر ہندو آہنسا کے پجاری ہیں انسان کا خون تو بڑی بات ہے کسی جاندار کا خون کرنا بھی ان کے مذہب میں بدترین گناہ ہے' لیکن مہاتما گاندھی اور دیگر لیڈروں نے مسلمان دشمنی کے زیر اثر شدھی اور سنگھٹن کی تحریکیں شروع کیں جن کا بنیادی مقصد مسلمانوں کو ہندو بنانا یا قتل کرنا تھا لالہ لاجپت رائے نے کہا:

"میں اعلان کرتا ہوں کہ ہندوستان کی ہندو نسل اور پنجاب کا مستقبل ان چار ستونوں پر قائم ہے (1) ہندو سنگھٹن (ہندوؤں کو مضبوط و مستحکم بنانا)۔ (2) مسلمانوں کا شدھی (مسلمانوں کو اسلام سے پاک کر کے ہندو بنانا)۔ (3) ہندو راج۔ (4) افغانستان اور سرحدی علاقوں کی فتح اور شدھی۔

وہ ان مقاصد کے حصول کے لئے ہندوؤں کو تربیت دیتے جس کا قدرتی نتیجہ مسلمانوں کے خلاف نفرت اور ان کا قتل عام تھا اس صورت حال سے نبرد آزما ہونے کے لئے سیف الدین کچلو نے "تنظیم" اور غلام بھیگ نیرنگ اور سرامام نے "تبلیغ" کو جاری رکھا اس کے بڑے اچھے نتائج بر آمد ہوئے جس سے ہزاروں ہندو مسلمان ہوئے۔ وہ لوگ جو مہاتما گاندھی کو آج بھی اپنا قائد تصور کرتے ہیں انہیں گاندھی جی کو پڑھنا چاہئے تاکہ وہ ان کے ذہن تک پہنچ سکیں۔

ہندوؤں کا تعصب اس درجہ بڑھا ہوا تھا کہ رسول کریمؐ کی ذات اقدس پر حملہ کرتے جو مسلمانوں کی غیرت گوارا نہ کرتی۔ اس بناء پر ہندوؤں کا قتل کار ثواب تصور ہوتا جیسا کہ پچھلے صفحات میں بیان کیا جا چکا ہے۔

سائمن کمیشن اور دیگر رپورٹیں

برطانیہ رفتہ رفتہ ہندوستان میں اصلاحات کا نفاذ کر رہا تھا۔ مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات جو دس سال کے لئے تھیں' اب نئی اصلاحات کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی۔ چنانچہ جون 1924ء کو حکومت ہند نے سر الیگزینڈر مڈی مین کی قیادت میں ایک کمیٹی مقرر کی گئی جس کے ممبران مسٹر جناح' سر شفیع' سر تیج بہادر سپرو' مہاراجہ بردوان' ڈاکٹر پرنجے اور سر آرتھر فردم تھے تاکہ گزشتہ اصلاحات کی کارکردگی کا جائزہ لیا جا سکے اور اس رپورٹ کی روشنی میں نئی اصلاحات نافذ کی جائیں۔ یہ رپورٹ 1925ء میں شائع ہوئی جس نے متفقہ طور پر جداگانہ انتخابات کے حق میں رائے دی اور ساتھ ہی وزیر ہند لارڈ برکن ہیڈ نے وائسرائے ریڈنگ سے صلاح و مشورہ کے بعد 7 جولائی 1925ء کو دارالامراء میں اعلان کیا کہ حکومت کسی صاف صاف نتیجے پر نہیں پہنچ سکی گزشتہ اصلاحات کوئی اتنی ناکام ثابت نہیں ہوئیں حالانکہ ہندوستان کی سب سے بڑی جماعت انہیں درہم برہم کرنے پر تلی رہی اس کے ساتھ ہی کرنل ویجوڈ نے جو ہندی قومیت کے زبردست حامی تھے صاف صاف کہہ دیا کہ "ہم ان لوگوں کی کوئی مدد کیسے کر سکتے ہیں جو خود کوئی قطعی تجویز پیش نہیں کر سکتے" لارڈ برکن ہیڈ کے اس غیر یقینی اعلان کا فوری نتیجہ یہ ہوا کہ سوراج پارٹی اور کانگرس کی مجلس عاملہ کا اجلاس ہوا سوراج پارٹی موتی لال کی صدارت میں کانگرس میں مدغم ہو گئی۔ دسمبر کے اجلاس میں کانگرس نے قرارداد منظور کی کہ اگر اصلاحات کا نفاذ نہ ہوا تو کانگرس اسمبلی سے واک آؤٹ کر جائے گی چنانچہ ہندو کانگرس 1926ء کے اجلاس میں اسمبلی سے واک آؤٹ کر گئی۔

تجاویز دہلی

قائداعظم محمد علی جناحؒ ہندو مسلم اتحاد کو ہندوستان کی آزادی کے لئے انتہائی ضروری خیال کرتے تھے۔ اس زمانہ میں ہندو مسلم فسادات پوری شدت سے جاری تھے جو خرمن امن کو بری طرح خاکستر کر رہے تھے اسی اثناء میں مرکزی اسمبلی کا 1927ء کا بجٹ سیشن شروع ہو گیا ایک دن باتوں باتوں میں موتی لال نہرو نے مسٹر جناح سے کہا کہ ہندو مسلم اتحاد کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ جداگانہ انتخابات ہیں اگر مسلمان ان سے دستبردار ہو جائیں تو میں ان کے باقی مطالبات کانگرس سے منوا سکتا ہوں اس پر مسٹر جناح نے انتہائی اقدام کرنے کا فیصلہ کیا اور مختلف الخیال مسلم اکابرین کا اجلاس بلایا جن میں مولانا محمد علی جوہر، سر علی امام، مولانا شفیع داوٗدی، راجہ محمود آباد، ڈاکٹر انصاری، سر محمد شفیع اور مفتی کفایت اللہ کے علاوہ کل پچیس اشخاص جمع ہوئے۔ کئی ایک نشستوں کے بعد یہ طے پایا:

1- سندھ کو بمبئی سے الگ کر کے علیحدہ صوبہ بنایا جائے۔

2- صوبہ سرحد اور بلوچستان میں مسلمانوں کو وہی اضافی نمائندگی کی مراعات دی جائیں جو ہندوؤں کو اپنے صوبوں میں حاصل ہیں۔

3- صوبہ سرحد اور بلوچستان کو دوسرے صوبوں کے مساوی درجہ دیا جائے۔

4- پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کو متناسب نمائندگی دی جائے۔

5- مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں کو 1/3 حصہ نشستیں دی جائیں۔

اگر ان شرائط کو قبول کر لیا جائے تو مسلمان مخلوط انتخابات کے اصول کو تسلیم کرنے کو تیار ہیں یہ فارمولا 20 مارچ 1927ء کو منظر عام پر آیا اور تجاویز دہلی کے نام سے مشہور ہوا۔ مئی میں بمبئی کے اجلاس میں کانگرس کمیٹی اور مجلس عاملہ کے اجلاس میں اس کو منظور کر لیا گیا۔ سروجنی نائیڈو نے تقریر کرتے ہوئے کہا "میں اتحاد کے اس اہم مورچے کی فتح پر مبارک باد پیش کرتی ہوں۔ اس کامیابی کا سہرا اس مجاہد کے سر ہے جسے جناح کہا جاتا ہے۔" کانگرس نے گو ان تجاویز کو قبول کر لیا تھا مگر سر شفیع نے دہلی سے واپس آ کر مخلوط انتخابات کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا جس کی وجہ سے مسلم لیگ کے دو دھڑے ہو گئے۔ سر شفیع کے ساتھ سر فضل حسین، علامہ اقبال، مولانا حسرت موہانی اور سر ذوالفقار علی خان جیسے اکابرین تھے۔ باقی سب لوگ جناحؒ کے ساتھ تھے۔ مسلم لیگ کا یہ انتشار اور گروہ بندی آئندہ دو سال تک رہی جس

میں مسلمانوں کو بہت بڑا سیاسی نقصان ہوا۔

ادھر ابتداء میں تو کانگرس نے ان تجاویز کو تسلیم کر لیا لیکن کچھ ماہ بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ وہ اس سے منحرف ہو گئی اس پر ہندوستان ٹائمز نے لکھا کہ "مخلوط انتخابات کا سندھ کی علیحدگی اور صوبہ سرحد و بلوچستان میں اصلاحات کے نفاذ سے کیا تعلق ہے۔ مسلمان کم سے کم دے کر زیادہ سے زیادہ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔" دراصل ہندو کسی صورت میں بھی مسلمانوں کو آزادانہ جمہوری حقوق دینے کو تیار نہ تھے وہ اپنی اکثریت کے بل بوتے پر یہاں ہندو راج قائم کرنا چاہتے تھے ورنہ اگر وہ ذرا سی بھی سیاسی بصیرت رکھتے ہوتے اور اپنی ہٹ دھرمی پر قائم نہ رہتے تو ان تجاویز سے فائدہ اٹھا کر بڑی خوبی کے ساتھ رفتہ رفتہ مخلوط انتخابات کے ذریعے ہندو راج کے خواب کو پورا کر سکتے تھے چونکہ مسلمانوں میں بکنے والوں کی بہت بڑی تعداد موجود تھی۔ اور کانگرسی مسلمان اس میں نہایت اہم کردار ادا کرتے۔

سائمن کمیشن

حکومت ہند نے 8 نومبر 1927ء کو سرجان سائمن کی قیادت میں ایک کمیشن مقرر کیا کہ وہ ہندوستان کے آئینی مسائل 1919ء کی اصلاحات کی کارکردگی اور نئی اصلاحات کی ضرورت اور اہمیت کے بارے میں اپنا مفصل جائزہ لے اور رپورٹ پیش کرے اور حکومت ان سفارشات کی روشنی میں نئی اصلاحات کا نفاذ کرے۔ یہ کمیشن تین فروری 1928ء کو بمبئی پہنچ مگر ہندوستان کی تمام بڑی پارٹیوں نے متفقہ طور پر اس کمیشن کا بائیکاٹ کیا کیونکہ اس کمیشن میں کوئی بھی ہندوستانی نمائندہ نہ تھا۔ اور ایسا کمیشن جس میں یہاں کا باسی ہی کوئی نہ ہو وہ بھلا یہاں کے مسائل کے بارے میں کیا سمجھ سکتا تھا۔ اور وہ ان مسائل کی روح تک کیسے پہنچ سکتا تھا۔ تین فروری کو وائسرائے نے اپیل کی کہ کمیشن سے تعاون کیا جائے اس پر 16 فروری کو لالہ لاجپت رائے نے اسمبلی میں بائیکاٹ کی قرارداد پیش کی جو 62 کے مقابلہ میں 68 ووٹوں سے منظور ہوئی۔ نیز اسمبلی نے کمیشن کے ساتھ بیٹھنے کے لئے اپنے تین نمائندے بھی دینے سے انکار کر دیا البتہ کونسل آف سٹیٹ نے اس غرض کے لئے اپنے تین نمائندے دے دیئے۔

یہاں پر ایک اور چیز واضح کر دینے کے قابل ہے۔ وہ یہ کہ ہندوستان میں ہندوؤں کی بہت

بڑی اکثریت تھی اور ان کا اس سیاسی جنگ میں طریق کار یہ تھا کہ ان میں سے کچھ سیاسی حکومت سے تعاون ضرور کرتے رہتے اور وہ حکومت تک اپنا موقف پہنچادیتے اس مرتبہ سر شفیع لیگ نے یہ کردار ادا کیا وہ کمیشن سے ملے اور کمیشن کو اپنے موقف سے آگاہ کیا اور جداگانہ انتخابات کی اہمیت اور ضرورت سے آگاہ کیا۔

سائمن 13 اپریل 1929ء کو واپس چلا گیا اس طویل عرصہ میں کمیشن نے ہندوستان کے طول و عرض کا دورہ کیا یہاں کے لوگوں سے ملاقاتیں کیں۔ حالات کا جائزہ لیا۔ اکثر مقامات پر "سائمن گو بیک" کے نعروں سے اس کا استقبال کیا گیا یہ مخالفانہ نعرے اتنا طول کھینچ گئے کہ پولیس کو بعض جگہوں پر سخت اقدامات کرنے پڑے۔ یہاں تک کہ لکھنؤ میں مظاہرے کے دوران پنڈت نہرو اور نیپ کو 'لاہور میں ڈاکٹر گوپی چند بھارگو' رائے ہنسراج اور لالہ لاجپت رائے کو بھی پولیس کے ڈنڈوں کا نشانہ بننا پڑا۔ لالہ لاجپت رائے کو دل کے قریب ضرب کاری لگی اور سترہ دن صاحب فراش رہنے کے بعد 17 نومبر 1928ء کو انتقال کر گیا اس حادثہ کے بارے میں صوبائی اسمبلیوں اور مرکزی اسمبلی میں سوالات اٹھائے گئے اور حکومت سے تحقیقات کا مطالبہ کیا گیا لیکن مطالبہ مسترد ہو گیا۔ اس پر بعض سر پھروں نے انتقام لینے کا پروگرام بنایا لیکن یہ پروگرام بھی فرقہ وارانہ صورت اختیار کر گیا جس میں انگریزوں کی بجائے ہندوستانیوں کا نقصان ہوا۔

نہرو رپورٹ:

وزیر ہند لارڈ برکن ہیڈ وقتاً" فوقتاً" ہندی قائدین پر طعن کیا کرتے تھے کہ یہ لوگ خود ہی اصلاحات حاصل کرنے کے حق میں نہیں ہیں۔ مگر جب ہندوستانیوں نے سائمن کمیشن کا بائیکاٹ کیا تو انہوں نے چیلنج کے طور پر اعلان کیا کہ "بجائے اس کے کہ وہ حکومت کے خلاف ہمیشہ منفی نکتہ چینیاں کرتے رہیں وہ اپنی طرف سے دستور کی کوئی متحدہ سکیم پیش کریں" چونکہ یہ بات ہندو مفاد میں تھی للذا ہندو پریس نے اس کو خوب اچھالا۔ اور وزیر ہند کو جواب دینے کا اہتمام ہونے لگا۔ 12 فروری 1928ء کو "آل پارٹیز کانفرنس" طلب کر لی گئی یہ کانفرنس تقریباً" تین ہفتے کی بے نتیجہ گفتگو کے بعد بمبئی اجلاس کے لئے 19 مئی تک ملتوی ہو گئی اس

اجلاس میں حاضرین کی تعداد بہت کم تھی۔ اس لئے طے پایا کہ ایک سب کمیٹی قائم کی جائے جو برکن ہیڈ کے چیلنج کا جواب دینے کے لئے دستور مرتب کرے۔ اس کمیٹی کے ارکان درج ذیل تھے:۔

موتی لال نہرو (صدر) محمد شعیب قریشی' سر علی امام' ایم ایس اینے' ایم آر جیکار' سردار منگل سنگھ' سر سپرو' ایم این جوشی' سبھاش چندر بوس اور جی آر پردھان

اس کمیٹی نے جو سفارشات پیش کیں ان کو نہرو رپورٹ کہتے ہیں۔ یہ درج ذیل تھیں۔

1- کامل آزادی کے بجائے ڈومنین سٹیٹس (Dominion Status) کا مطالبہ کیا گیا اور مطالبہ کیا گیا کہ برطانوی حکومت کے اندر رہ کر داخلی خود مختاری' امور دفاع اور امور خارجہ کے محکمے انگریزوں کو مستقل طور پر سونپنے کی تجویز کی گئی۔

2- جداگانہ انتخابات کی بجائے مخلوط انتخابات تجویز کئے گئے۔

3- وفاقی کی بجائے وحدانی نظام کو تجویز کیا گیا تاکہ مرکز مضبوط ہو۔

4- مسلمانوں کے لئے مرکز میں 1/3 حصہ کی بجائے 1/4 حصہ نمائندگی کی سفارش کی گئی۔

5- سندھ کو بمبئی سے الگ کر کے علیحدہ صوبہ بنایا جائے۔

6- بلوچستان اور صوبہ سرحد میں بھی وہی اصلاحات نافذ کی جائیں جو ملک کے دوسرے حصوں میں نافذ ہیں۔

7- انتخابات کے لئے مکمل حق بالغ رائے دہی کا نظام رائج کیا جائے جس کا صاف مطلب یہ تھا کہ ہر جگہ' ہر مقام پر ہندوؤں کو برتری حاصل رہے دوسرے الفاظ میں ہندوستان میں ہندو راج کا قیام تھا۔

کہا گیا کہ برکن ہیڈ کے چیلنج کا فوری جواب دینا ضروری ہے اس لئے اس رپورٹ کو فوری طور پر منظور کر لیا جائے۔ ہندوؤں نے اپنی اکثریت کے بل بوتے پر ان تجاویز کی فوراً" منظوری دے دی اور حکومت کو رپورٹ بھیج دی گئی اور کہا گیا کہ 31 دسمبر 1929ء تک اس رپورٹ کو منظور نہ کیا گیا تو سول نافرمانی شروع کر دی جائے گی۔

مسلمانوں کا ردعمل:

چونکہ یہ رپورٹ مسلم مفادات کے سراسر منافی تھی اس رپورٹ پر تبصرہ کرتے ہوئے

مولانا محمد علی جوہر نے کہا کہ خلقت خدا کی' ملک بادشاہ کا' اور حکم کمپنی بہادر کا' کی بجائے اب کہو خلقت خدا کی' ملک وائسرائے کا اور حکم پارلیمنٹ یا ہندو مہاسبھا کا۔ مسٹر جناحؒ نے اس رپورٹ میں کم از کم تین ترامیم کرنے پر زور دیا کہ:

1- مرکزی مجلس قانون ساز میں کم از کم 1/3 نشستیں مسلمانوں کے لئے وقف ہوں۔
2- دس سال تک بنگال و پنجاب میں مسلمانوں کو متناسب نمائندگی دی جائے۔
3- باقی ماندہ اختیارات مرکز کی بجائے صوبوں کو دیئے جائیں۔

ڈاکٹر ا میسڈ کرنے کہا "ان ترامیم سے واضح ہوتا ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں خلیج بہت زیادہ وسیع نہیں تھی تاہم اس خلیج کو پاٹنے کی کوئی خواہش موجود نہ تھی اور ہندوؤں نے ان تجاویز کو مسترد کر دیا بلکہ ان کے متعلق پکار نے کہا:

"جناح ضدی بچے کی طرح ہے جس کا دماغ کانگرس کے لاڈ پیار سے خراب ہو گیا ہے۔"

اس نازک صورت حال میں سر شفیع نے سر فضل حسین کی تحریک پر "آل پارٹیز مسلم کانفرنس" 31 دسمبر 1928ء کو دہلی میں بلائی جس میں سوائے جناح لیگ کے سب نے شرکت کی اور اس کانفرنس کی صدارت سر آغا خان نے کی اس میں یہ مطالبات پیش کئے گئے:

1- جداگانہ انتخابات سے ہرگز دستبردار نہیں ہوا جا سکتا۔
2- سندھ کو بمبئی سے الگ کیا جائے۔
3- سرحد اور بلوچستان کو دوسرے صوبوں کے مساوی آئینی درجہ دیا جائے۔
4- وفاقی نظام حکومت نافذ کیا جائے۔
5- تمام غیر متذکرہ اختیارات صوبوں کو دیئے جائیں۔
6- مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں کو 1/3 حصہ نشستیں دی جائیں۔

یہ مسلمانوں کی ایک زوردار کانفرنس تھی جس میں شرکائے کانفرنس کی تعداد تین ہزار سے زائد تھی اور سر آغا خان کی شمولیت اور صدارت نے اس کی آواز کو کافی طاقتور اور زوردار بنا دیا جس سے نہرو رپورٹ کے پھیلائے ہوئے زہر کا تدارک ہو گیا۔

نہرو رپورٹ نے مسلمان قائدین کو جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا جس سے ان کے احساسات کو بہت بڑا دھچکا لگا۔ قائداعظمؒ اس وقت تک ہندو مسلم اتحاد کے زبردست حامی تھے اور انہوں

نے اس کے بارے میں لگاتار ایک عرصہ تک بڑے خلوص اور جانفشانی سے کام کیا تھا لیکن اب وہ اس سے ناامید ہو گئے تھے۔ انہوں نے ہندو ذہنیت کو اچھی طرح سمجھ لیا اور صاف صاف کہہ دیا:

"آج سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے راستے جدا جدا ہیں" اور سر آغاخان رپورٹ پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ کوئی باشعور انسان سوچ بھی نہیں سکتا کہ مسلمان ان ذلت آمیز تجاویز کو قبول کر سکتے ہیں۔" مولانا محمد علی جوہر نے نہرو رپورٹ کو ہندو کی دائمی غلامی کے پھندے سے تشبیہ دی۔ مولانا شوکت علی نے کہا کہ "مجھے جوانی میں اعلیٰ نسل کے شکاری کتے پالنے کا بڑا شوق تھا۔ مگر میں نے کبھی ان کتوں کو بھی خرگوش کے ساتھ وہ سلوک کرتے نہیں دیکھا جیسا نہرو رپورٹ کے ذریعے مسلمانوں کے ساتھ کیا گیا ہے۔" بہرکیف یہ ایک نہایت ذلت آمیز دستاویز تھی۔ جس نے ہندو ذہنیت کو واضح کر دیا۔ اور مسلمانوں کو آنے والے طوفان سے آگاہ کر دیا انہیں محسوس ہو گیا کہ ہندو انہیں ہمیشہ اپنا غلام رکھنا چاہتے ہیں۔ یوں تو بہت سی مسلم جماعتیں ہندوؤں سے بدظن ہو کر الگ ہو گئیں لیکن جمعیت العلمائے اسلام اور دیگر بہت سے علماء ان کی دیکھا دیکھی کانگرس کی گود میں چلے گئے اور ان لوگوں کی وجہ سے مسلم مفاد کو بعد میں بہت نقصان ہوا۔ ان میں اہم نام ابوالکلام آزاد' ڈاکٹر سیف الدین کچلو' ڈاکٹر محمد عالم اور تصدق احمد خان شیروانی کافی مشہور ہیں انہوں نے قیام پاکستان اور دو قومی نظریہ کی مخالفت کی۔

قائداعظمؒ کے چودہ نکات

مسلم لیگ کا اجلاس جو کلکتے میں نہرو رپورٹ پر غور و خوض کے لئے طلب کیا گیا تھا وہ ملتوی ہو گیا اور قائداعظمؒ نے پھر اسے 25 مارچ 1929ء کو دہلی میں طلب کیا جس میں سر شفیع گروپ نے بھی شرکت کی یہ اجلاس مسلمانوں کے اتحاد کا مظہر تھا جس میں مسٹر جناحؒ نے خطاب کرتے ہوئے کہا:

"اے مسلمانوں کے نمائندو! آپ حکومت ہند کے آئندہ دستور کے لئے اپنا کوئی جامع پروگرام وضع کریں گے یا نہیں؟ اگر آپ کو کوئی ذمہ داری اپنے کندھوں پر اٹھانی ہے اگر آپ

یہ جانتے ہیں کہ آپ کے فیصلوں میں کوئی وزن ہو' اگر آپ کی یہ خواہش ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی آواز سنی جائے تو یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہو سکتا ہے کہ آپ متحد ہو کر فیصلہ کریں"۔ اس تقریر کے بعد آپ نے تمام گروہوں کے لوگوں کے خیالات و نظریات کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایک قرارداد اجلاس میں پیش کی جو منظور کر لی گئی یہ قرارداد قائداعظم کے چودہ نکات کے نام سے تحریک پاکستان میں مشہور ہوئی۔ یہ نکات درج ذیل ہیں:

1- ملک کا آئندہ دستور وفاقی طرز کا ہو۔ اور تمام غیر معینہ' یا اضافی یا باقی ماندہ اختیارات صوبوں کے سپرد کئے جائیں۔

2- ہندوستان کے تمام صوبے اندرونی طور پر مکمل خود مختاری کے حامل ہوں اور ان کی آئینی حیثیت یکساں ہو۔

3- مرکزی قانون ساز ادارے میں مسلمانوں کی نمائندگی کم از کم ایک تہائی ہو۔

4- جداگانہ طریق انتخاب کو قائم رکھا جائے البتہ اگر کوئی قوم یا فرقہ اس سے دستبردار ہو کر مخلوط انتخابات کو پسند کرے تو اسے اس کی اجازت دے دی جائے۔

5- صوبوں کی حدود میں کوئی ایسی تبدیلی نہ کی جائے جس کا اثر صوبہ سرحد' پنجاب اور بنگال کی مسلم اکثریت پر پڑے۔

6- ملک کے تمام قانون ساز اداروں میں اقلیتوں کو موثر نمائندگی دی جائے۔

7- ہندوستان کی تمام قوموں کو مکمل مذہبی آزادی' آزادی ضمیر' آزادی عبادت و رسومات' آزادی تعلیم و تبلیغ اور آزادی اجتماع کی ضمانت دی جائے۔

8- کوئی ایسا مسودہ قانون' قرارداد' تحریک یا اس قسم کی کوئی ایسی دوسری چیز کسی قانون ساز ادارے سے پاس نہ ہو جس کی زد کسی خاص قوم پر پڑتی ہو اور اس قوم کے 3/4 ارکان مخالفت کریں۔

9- سندھ کو بمبئی سے الگ کر کے نیا صوبہ بنایا جائے۔

10- بلوچستان اور سرحد میں بھی دوسرے صوبوں کے مساوی اصلاحات نافذ کی جائیں۔

11- قابلیت کا لحاظ رکھتے ہوئے سرکاری ملازمتوں اور دیگر خود مختار اداروں میں مسلمانوں کو تسلی بخش حصہ ملے۔

12- مسلمانوں کو تہذیب و تمدن' زبان و ثقافت' تعلیم' مذہب' اوقاف اور پرسنل لاء وغیرہ کو تحفظ حاصل ہو' نیز خود مختار تعلیمی اداروں کو سرکاری امداد دی جائے۔

13- مرکزی اور صوبائی وزارتوں میں کم از کم 1/3 حصہ مسلمان ضرور ہوں۔

14- تمام وفاقی اکائیوں کی منظوری کے بغیر وفاقی دستور میں کوئی ترمیم نہ کی جائے۔

مقام حیرت ہے کہ ہندو ذہنیت ان چودہ نکات کو قبول کرنے پر آمادہ نہ ہو سکی نہ جانے ہندو کن غلط فہمیوں میں مبتلا ہو چکے تھے۔ غالباً" ہندو مسلم اتحاد کا ان کے نزدیک صرف یہی مقصد تھا کہ مسلمان ہندو اکثریت کے قدموں میں غلامانہ طور پر پڑے رہیں یا ہندوؤں کی ضد اور ہٹ دھرمی اس بنا پر تھی کہ اللہ تعالیٰ پاکستان کو معرض وجود میں لانا چاہتا تھا اور ان کی عقلوں پر پردے ڈال دیئے گئے تھے۔ چوہدری محمد علی نے "ظہور پاکستان" میں ان مطالبات پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر کیا ہے:

"ماضی پر تبصرہ کرتے ہوئے ہر صاحب فکر ہندو حیرت زدہ ہو گا کہ اس قدر معقول اور معتدل مطالبات بھی ہندو لیڈروں نے مسترد کر دیئے تھے۔"

حقیقت یہی ہے کہ تقسیم ہند جیسے اہم ترین فیصلہ تک مسلمانوں کو پہنچانے میں سب سے اہم کردار ہندو لیڈروں کی ہٹ دھرمی' تعصب اور کوتاہ نظری نے ادا کیا ہے ورنہ مسلمان بنیادی طور پر متحدہ ہندوستان چاہتے تھے۔

سائمن کمیشن کی سفارشات

سائمن کمیشن کی ہندوستان میں آمد اور اس کے اغراض و مقاصد کے بارے میں بتایا جا چکا ہے۔ کمیشن نے مخالفت کے باوجود کام جاری رکھا اور 1930ء میں دو جلدوں پر مشتمل اپنی رپورٹ شائع کر دی جس کی اہم سفارشات درج ذیل تھیں:

1- صوبوں میں نظام دو عملی کو ختم کر دیا گیا۔ تمام محکمے وزراء کے سپرد کر دیئے جائیں جو اپنے صوبائی قانون ساز ادارے کے سامنے جوابدہ ہوں۔ مرکزی حکومت اور صوبائی گورنر وزیروں کے کاموں میں اس وقت تک مداخلت نہ کریں جب تک کہ کسی اقلیت کے حقوق کے تحفظ کے لئے یا صوبائی امور کو حد درجہ بد نظمی اور خرابی سے بچانے کے لئے ایسا کرنا ضروری نہ ہو جائے۔

2- حق رائے دہی کا دائرہ مزید وسیع کیا جائے (یہاں پر یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اس سے قبل وہی لوگ ووٹ دینے کا حق رکھتے تھے جو ملکیت کی مقررہ شرائط پوری کرتے تھے۔ یعنی غریب اور غیر زراعت پیشہ لوگوں کو ووٹ کا حق حاصل نہ تھا۔)

3- سندھ اور اڑیسہ کو علیحدہ صوبہ بنانے کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی جائے جو اس کے مالی پہلوؤں پر غور کر کے اپنی رپورٹ پیش کرے۔ صوبہ سرحد میں دستوری اصلاحات نافذ کی جائیں۔ دستور ساز ادارہ قائم کیا جائے اور مرکزی قانون ساز ادارے میں اس صوبے کو مزید نمائندگی دی جائے۔

4- مرکز میں وفاقی حکومت کا نظام قائم کیا جائے جس کی مقننہ دو ایوانوں پر مشتمل ہو۔ ایوان بالا میں ہر صوبے سے تین تین نمائندے لئے جائیں ایوان زیریں میں آبادی کے تناسب کے پیش نظر نمائندگی دی جائے۔

تاج برطانیہ نے سائمن کمیشن کے ذریعے یہ تاثر دینے کی کوشش کی تھی کہ ہندوستان میں اصلاحات نافذ کی جائیں گی۔ لیکن جب یہ رپورٹ منظر عام پر آئی تو ہندوستانیوں کے تمام مطالبات پر پانی پھیر دیا گیا اس زمانے میں کانگریس درجہ نو آبادیات کا مطالبہ کر رہی تھی۔ لیکن جب یہ رپورٹ منظر عام پر آئی تو ان کی امیدوں پر پانی پھر گیا اور وہ لوگ جو کامل آزادی کی بات کرتے تھے وہ اس کو کس طرح قبول کر لیتے نیز مسلم لیگ کے نقطہ نظر سے یہ نہایت گھٹیا اور مایوس کن تھی۔ چونکہ مسلمان جداگانہ انتخابات کے ذریعے مرکز میں 1/3 حصہ نمائندگی کا

مطالبہ کر رہے تھے۔ جو کانگریس لکھنؤ پیکٹ میں تسلیم کر چکی تھی۔ لیکن بعد میں اپنے عہد سے پھر گئی۔ اس صورت میں یہ رپورٹ مسلمانان ہند کے لئے سخت خطرناک تھی کیونکہ ایسی صورت میں ہندو راج کے قائم ہونے کا خطرہ موجود تھا۔

سائمن کمیشن کے خلاف برصغیر میں نفرت پیدا ہو چکی تھی۔ ہندوستانیوں نے اس کا بائیکاٹ کر دیا تھا اس لئے اس رپورٹ کی طرف کسی نے دیکھنا بھی گوارہ نہ کیا چنانچہ سب لوگوں نے اس رپورٹ کو ناپسندیدہ قرار دے کر رد کر دیا۔

مسلم سیاست میں انتشار

اتفاق میں برکت ہے اور انتشار میں تباہی ہے۔ یہ فقرہ ہم بچپن سے پڑھتے آئے ہیں لیکن قومی و ملی تاریخ میں ہمیں اکثر انتشار سے ہی واسطہ پڑا ہے۔ لوگوں کے ذاتی مفادات نے ہمیشہ اتفاق کی بجائے انتشار کو تقویت دی ہے۔ جس نے ہمیں ہمیشہ نقصان دیا۔ گول میز کانفرنسوں میں انگریز اور ہندو کی چال بازیوں کی بنا پر مسلمان کسی قائد پر متفق نظر نہ آئے اور لوگوں نے قومی مفادات پر اکثر ذاتی مفادات کو ترجیح دی جس کی بنا پر مسلمانوں کو آئندہ سالوں میں سیاسی طور پر نقصان ہوا۔ یہ سچ ہے کہ گول میز کانفرنسوں کے ذریعے مسلمانوں کو جو کچھ حاصل ہوا اس کے حصول میں سر فضل حسین نے اہم کردار ادا کیا مگر اس کے باوجود مسلم لیگ کے سیاست بدر ہونے سے پیدا ہونے والے خلا کو پر کرنے کے لئے انہوں نے مسلم کانفرنس کو فعال نہ ہونے دیا۔ ہم جانتے ہیں کہ قائداعظمؒ کی گول میز کانفرنس میں شرکت کی بنا پر دسمبر 1930ء میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کی صدارت علامہ اقبال نے کی مگر اس سے اگلے سال سر فضل حسین نے سر شفیع' ملک فیروز خان نون اور سر ظفر اللہ خان کو استعمال کرتے ہوئے مسلم لیگ پر قبضہ جمانے کا پروگرام بنایا گیا۔ چنانچہ سر ظفر اللہ خان کو لیگ کا صدر بنوایا گیا وہ جلد واپس لوٹا کہ اجلاس کی صدارت کر سکے لیکن عوام نے اس کی قیادت قبول کرنے سے انکار کر دیا اور جلسہ نہ ہونے دیا تو ظفر اللہ خان چند حواریوں کو لے کر خان صاحب نواب علی کے گھر جاپناہ گزیں ہوئے اور جلسہ کی رسمی کارروائی پوری کی لیکن عوام نے میدان میں مسلم لیگ کا جلسہ کیا پشاور کے ایک بیرسٹر عبدالعزیز کو اپنا صدر بنا لیا اس طرح مسلم لیگ پھر دو گروہوں میں تقسیم ہو گئی لیکن سر ظفر اللہ خان نے جب حالات کو اپنے خلاف جاتے ہوئے دیکھا تو وہ پسپا ہو

گیا اس سازش میں ناکام ہونے پر سر فضل حسین نے لیگ پر ایک اور بھرپور وار کرنے کا پروگرام بنایا اور وہ یہ کہ بیرسٹر عبدالعزیز نے لیگ کا اجلاس طلب کرنا چاہا تو اس شریف آدمی نے ملک فیروز خان نون کے ذریعے اس مضمون کی قرارداد پیش کروا دینا چاہی کہ مسلم لیگ کو سرے سے ہی ختم کر دیا جائے لیکن بیرسٹر عبدالعزیز تک یہ بات پہلے ہی پہنچ گئی انہوں نے اس صورت حال سے نبٹنے کے لئے پہلے ہی تیاری کر لی اور اس کے منصوبے کو ناکام بنا دیا بے شک ان لوگوں نے متوازی مسلم لیگ قائم رکھنے کی بھرپور کوششیں کیں لیکن بیرسٹر عبدالعزیز نے بکمال دانش مسلم لیگ کے جلسوں کا تواتر قائم رکھا اور یہ صورت حال مسٹر محمد علی جناحؒ کے انگلستان سے واپس آنے تک جاری رہی۔

یہاں پر ایک اور چیز کی وضاحت کر دی جانی چاہئے کہ مسلم لیگ نے زندگی اور موت کی اس کشمکش میں مبتلا ہونے کے باوجود کمیونل ایوارڈ پر اور دیگر چیزوں پر اپنے ردعمل کا اظہار کیا لیکن مسلم کانفرنس نے تمام وسائل اور اعلیٰ سرپرستی کے باوجود کیوں خاموشی اختیار کئے رکھی اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ سر فضل حسین اینڈ کو کو ذاتی مفادات عزیز تھے۔ قومی اور عوامی مفادات کی انہیں کچھ پرواہ نہ تھی۔ جب جولائی 1934ء کو سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کو 25 فیصد حصہ دینے کا فیصلہ کیا گیا تو مسلم کانفرنس نے احتجاج کیا کہ یہ حصہ 1/3 ہونا چاہئے۔ دراصل سر فضل حسین انگریز بہادر کو خوش رکھنا چاہتے تھے اور اسے باور کرانا چاہتے تھے کہ تحریک خلافت قسم کا کوئی احتجاج مسلمانوں میں نہیں ہو گا۔ اب انگریزوں کی راتوں کی نیند حرام نہیں ہوں گی۔ مقام غور ہے کیا واقعی انگریز ڈپلومیسی اتنی بے مغز تھی کہ سر فضل حسین اکیلا پہلے اسے گیارہ سال تک پنجاب کی سطح پر اور پھر 35-1930ء تک مرکزی سطح پر اپنی انگلیوں پر نچاتا رہا یا خود انگریز اتنا زیرک اور دانا تھا کہ وہ سر فضل حسین کو اپنے اشاروں پر نچاتا رہا۔ بہرکیف بعد کے تاریخی شواہد سر فضل حسین کی اس غلامانہ سوچ کو آئینہ کرتے ہیں۔ مقام افسوس ہے کہ سرحد کو کانگرس کی آغوش میں دھکیل دیا گیا وہاں انگریز نے اپنی بربریت اور حیوانیت کا بھرپور مظاہرہ کیا لیکن مسلم کانفرنس خاموش تماشائی بنی رہی اور کوشش یہ رہی کہ پنجاب کا کوئی لیڈر ان کی مدد نہ کر سکے۔ پنجاب میں صرف اپنے اقتدار کو محفوظ رکھنے کے لئے دیہاتی اور شہری کا امتیاز پیدا کیا گیا جسے اڈوائر نے جنم دیا تھا۔ یہ گویا انگریز کی حمایت و تائید ہی

تھی نیز پنجاب میں کسی مسلم قیادت کو ابھرنے نہ دیا گیا۔ پنجاب میں یونی نیسٹ پارٹی کے برسراقتدار رہنے کے لئے ہندوؤں اور دیگر غیرمذاہب کی حمایت اور تعاون کی ضرورت تھی گویا مرکزی سطح پر ہندو قوم پرستی کے لئے جو کام ابوالکلام آزاد کرتے رہے پنجاب میں وہی کردار سر فضل حسین کرتے رہے۔ ان حالات سے تنگ آکر گول میز کانفرنس کے بعد مسٹر جناح نے جلاوطنی اختیار کر لی۔ مولانا شوکت علی میں بے شک تنظیمی صلاحیتیں موجود تھیں لیکن وہ آزادانہ طور پر بحیثیت قائد مفید نہ تھے۔ مولانا حسرت موہانیؒ ڈپلومیٹ ہونے کی بجائے صرف حق گو اور بیباک تھے مولانا ظفرعلی خان کی سرفضل حسین کے سامنے کچھ نہ چلتی تھی جب احرار فضل حسین کے لئے چیلنج بنے تو اس نے انہیں بھی جلد ہی بری طرح زچ کر کے مسلم سیاست میں نیم جان لاشے بنا دیا۔ یہ وہ شخص ہے جس نے احراروں کو رسوا کرنے کے لئے مسجد شہید گنج کا شہید ہونا اور ہزاروں مسلمانوں کے سینے چھلنی ہونا گوارا کر لیا۔ لیکن جب وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل سے اپریل 1935ء کو سبکدوش کر دیئے گئے تو وہ لاہور میں یوں کہنے پر مجبور ہوا۔

"آج قوم میں کوئی لیڈر نہیں ہے اور اس تہی دامنی کی ذمہ داری حکومت کی پالیسی پر عائد ہوتی ہے۔ حکومت کے کارندے جونہی دیکھتے ہیں کہ کسی ہندوستانی کا اپنی قوم میں اثر ورسوخ بڑھتا جا رہا ہے تو فوراً" اس کی بیخ کنی پر آمادہ ہو جاتے ہیں.......... مسلمانوں کے متعلق حکومت نے یہ رویہ اختیار کر رکھا ہے کہ ان میں پھوٹ ڈالنے کے لئے اندر ہی اندر بڑی ہوشیاری سے پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے۔ ذاتی رقابتوں کو زور و شور سے ہوا دی جاتی ہے۔ فرقہ واریت اور جماعت سازی کے جذبے کو ابھارا جاتا ہے........ ان حالات میں صوبائی وزیروں کی حیثیت اور کیا رہ جاتی ہے کہ وہ معمولی تحصیل داروں کی طرح گورنروں کے اشارے پر ناچتے پھریں۔" (فضل حسین 'ایک سیاسی سوانح' از عظیم حسین۔ صفحہ 274)

محرم راز نے آخر وہ راز عوام کے سامنے لا رکھا جسے وہ سولہ سال سے اپنے سینے سے لگائے ہوا تھا اور پورے خلوص کے ساتھ اس پر عمل کر رہا تھا۔ کیا فضل حسین کی زندگی میں ہی سر سکندر جیسا لیڈر پیدا نہ ہوا جس کا قومی خدمت میں کردار اور حصہ جو ہے وہ سب پہ عیاں ہے۔ یعنی پنجاب سے مسلم لیگ کی بیدخلی اور خاکسار جیسی تحریک کی تباہی؟ کیا یہ انگریز بہادر کی

خوشنودی کے لئے نہ تھا۔ فضل حسین نے کیا وجہ ہے کہ کسی عوامی لیڈر کو پیدا ہی نہ ہونے دیا۔ ان کی پارٹی کا ہر اقدام انگریزی مفاد کے تحفظ اور مسلم مفاد کے خلاف آخر کیوں رہا۔ کیا اس پارٹی نے اپنی پوری تاریخ میں کبھی مسلم مفادات کے لئے کوئی قربانی دی؟ آخر اس پارٹی میں سبھی خان بہادر' بڑے زمیندار اور جاگیردار کیوں رہے؟ کیا یہ سب انگریزوں کا پروردہ طبقہ نہیں ہے۔ جو آج بھی انگریزی تہذیب و تمدن اور زبان کے لئے سب کچھ کر رہا ہے۔ اور مسلم عوام کی آواز کو دبا رہا ہے۔ فضل حسین کے اس گھناؤنے اور برے کردار پر تنقید کرتے ہوئے علامہ محمد اقبالؒ نے انہی دنوں انجمن حمایت الاسلام کے سالانہ جلسے میں تقریر کرتے ہوئے یوں اظہار کیا

"یہ کس قدر افسوسناک امر ہے کہ پنجاب میں شہری اور دیہاتی کا جو جھگڑا چل رہا ہے اسے سر فضل حسین کی امداد حاصل ہے۔ فضل حسین کو ابتداء میں قیادت کا منصب اس لئے حاصل نہیں ہوا تھا کہ وہ دیہاتی تھے بلکہ اس لئے کہ وہ صوبے کے مسلمانوں کے قائد تھے۔ لیکن انہوں نے قیادت حاصل کرنے کے بعد جان بوجھ کر شہری' دیہاتی جھگڑے کو تیز کرنا شروع کر دیا تاکہ اس طرح ان کا منصب بحال رہے اس جھگڑے سے فائدہ اٹھا کر انہوں نے بعض ایسے ناکارہ اور تیسرے درجے کے آدمیوں کو اپنا رفیق منتخب کیا جو حکومت کے قطعاً" اہل نہ تھے اور جن میں اتنی صلاحیت بھی نہ تھی کہ اس اقتدار اور وقار کو بحال رکھ سکیں۔ جو وزارت کا لازمہ ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ۔ تیسرے درجے کے لوگ جو اپنے عروج کے لئے فضل حسین کے ممنون ہیں خود ادنیٰ حیثیت کے مالک ہونے کے باعث فضل حسین کو گویا ایک فوق البشر سمجھنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ حکومت کے بعض کارندوں نے بھی اس پالیسی کی حمایت کی ان تمام اسباب و محرکات کا نتیجہ یہ نکلا کہ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ان میں صحیح لیڈر شپ مفقود ہو چکی ہے اور سیاسی میدان چند حد درجہ نالائق مقدر آزماؤں کے قبضے میں چلا گیا ہے۔"

(اقبال کے آخری دو سال، صفحہ نمبر 277-272)

علامہ اقبالؒ جیسے انسان سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ جوش میں آ کر کوئی بیان داغ دیں اور بعد میں اس کی تردید کرنے لگیں جیسا کہ فی زمانہ ہو رہا ہے بلکہ وہ عمر کی آخری منزل میں ہیں اور ان کے بیان کو حقیقت کا آئینہ دار ہونا چاہئے مزید یہ کہ ان کے فضل حسین سے ذاتی

دیرینہ تعلقات ہیں ان کی مشہور نظم "فلسفہ غم" انہی کے نام ہے۔ دوسری گول میز کانفرنس میں ان کی شرکت بھی اسی فضل حسین کی کوششوں کا نتیجہ ہے اس لئے یہ کہنا بھی بے جا ہے کہ یہ بیان کسی ذاتی عناد کا نتیجہ ہے۔ اس سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ فضل حسین نے ذاتی مفادات کی بنا پر پنجاب میں مسلم عوامی قیادت کو ابھرنے نہ دیا جس کا خمیازہ ہم آج بھی بھگت رہے ہیں۔

مجلس احرار

مسلم قیادت کے اس خلا کو پر کرنے کے لئے 1931ء میں ایک جماعت وجود میں آئی جسے مجلس احرار کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ بتایا جا چکا ہے کہ نہرو رپورٹ نے مسلمانوں کو بکھیر کے رکھ دیا تھا جس کو جہاں جگہ ملی اس نے اسی کو غنیمت جانا۔ مولانا ابو الکلام آزاد اور ڈاکٹر انصاری کا گروہ تو پہلے ہی کانگرس کی زلف گرہ گیر کا اسیر ہو چکا تھا اب جو تو گرفتار ہوئے ان میں نمایاں شخصیات سید عطاء اللہ شاہ بخاری، چوہدری فضل حق، مولوی مظہر علی اظہر، مولوی حبیب الرحمان لودھیانوی، ڈاکٹر محمد عالم، شیخ حسام الدین وغیرہ تھیں۔ ان لوگوں نے کانگرس کی تحریک سول نافرمانی میں دل و جان سے حصہ لیا اور گرفتار بھی ہوئے۔ گاندھی ارون معاہدہ کے تحت رہا ہونے پر کانگرس کے مارچ 1931ء کے اجلاس میں حصہ بھی لیا لیکن وہاں انہیں مایوسی کے سوا کچھ بھی ہاتھ نہ آیا۔ وہاں اجلاس کی کارروائی کے دوران مولانا ظفر علی خان نے نماز عصر کے لئے پندرہ منٹ کا وقفہ چاہا تو گاندھی نے انکار کر دیا حالانکہ وہ خود ہر جلسہ میں پرارتھنا کیا کرتے تھے۔ بلکہ بقول پروفیسر مکرجی "ہند میں گاندھی سے بڑھ کر سیاست اور مذہب کو خلط ملط کرنے والا کوئی دوسرا لیڈر نہ تھا۔" مولانا ظفر علی خان اسی وقت شدید احتجاج کر کے کانگرس سے لاتعلق ہو گئے۔

ان لوگوں نے جب حالات کو اپنے مفاد میں نہ پایا تو لاہور میں جمع ہو کر 4 مئی 1931ء کو "مجلس احرار اسلام" کے نام سے ایک الگ تنظیم قائم کر لی اور جداگانہ انتخابات کے مسلم مطالبہ کی حمایت کا اعلان کر دیا اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ گروہ نہایت مخلص، ایثار پیشہ اور فعال تھا۔ یہ تمام قائدین آبادی کے متوسط اور نچلے طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان لوگوں نے عوام

کے بنیادی اور اہم مسائل کے حل کو اپنے منشور میں جگہ دی تھی اس کے قائدین اعلیٰ درجہ کے مقرر اور خطیب تھے لہٰذا یہ تحریک بہت جلد عوامی تحریک بن گئی اور یہ بات بلاخوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ ہندوپاکستان میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے جوڑ کا کوئی دوسرا مقرر پیدا نہ ہوا۔ مولانا ابو الکلام آزاد ایک بہترین مقرر تھے مگر انہوں نے کبھی اس جلسے میں تقریر نہیں کی جہاں بخاری بول رہے ہوں۔ مولانا جوہر کا قول ہے کہ نہ تو کوئی اس ظالم سے پہلے تقریر کر سکتا ہے اور نہ بعد' چونکہ جو پہلے تقریر کرے گا اس کا رنگ اڑ جائے گا اور جو بعد میں تقریر کرے گا اس کا رنگ جمنے ہی نہ پائے گا۔ سر فضل حسین کو اس تحریک کے عوامی ہو جانے کا سخت خوف تھا نیز اس تحریک کو جلد ہی عوامی ہونے کا موقع مل گیا۔ ہوا یوں کہ کشمیر میں ڈوگرہ حکمرانوں نے وہاں کی مسلم آبادی پر ظلم و ستم ڈھانے شروع کر دیئے جس پر احتجاج کی لہر اٹھی اس پر جبر و تشدد اور بڑھ گیا۔ ان حالات پر غور و فکر کے لئے جولائی 1931ء میں شملہ کے مقام پر مسلم قائدین کی ایک میٹنگ نواب ذوالفقار علی خان کی کوٹھی پر منعقد ہوئی جس میں "آل انڈیا کشمیر کمیٹی" کا قیام عمل میں آیا اس کے صدر مرزا بشیر الدین محمود امیر جماعت احمدیہ اور سیکرٹری عبدالرحیم مقرر ہوئے۔ بدقسمتی سے یہ بھی احمدی نکلے ان لوگوں نے کشمیریوں کے مفادات کی حفاظت کی بجائے اپنے مسلک کی تبلیغ کا کام شروع کر دیا اس پر احرار میدان میں کود پڑے انہوں نے اپنی کشمیر کمیٹی تشکیل دی اور پروگرام شروع کر دیا اب ہزاروں کی تعداد میں لوگ راولپنڈی اور سیالکوٹ کے راستے جموں اور کشمیر میں داخل ہونے لگے اور اپنے آپ کو گرفتاری کے لئے پیش کرنے لگے۔ ان گرفتار شدگان کی تعداد پچاس ہزار سے تجاوز کر گئی جس پر ڈوگرہ حکمران مجبور اور بے بس ہو گئے۔ انہوں نے احرار کے آگے ہتھیار ڈال دیئے اور آبرومندانہ طور پر معاہدہ طے پایا اور یہ تحریک کامیابی کی سند لے کر ختم ہوئی۔ اب احرار کو کپورتھلہ میں محاذ کھولنا پڑا جہاں انہیں کامیابی ہوئی۔

کشمیر مہم کے دوران ہی احرار قائدین کو علم ہو گیا تھا کہ سر فضل حسین ان سے خار کھاتے ہیں چنانچہ انہوں نے جب ان حالات سے فراغت پائی تو انہوں نے قادیانیت کے خلاف محاذ گرم کر دیا۔ یہ محاذ دراصل بالواسطہ طور پر فضل حسین کے خلاف تھا چونکہ یہ شخص قادیانیت کی سرپرستی کر رہا تھا اور اسی کی کوششوں سے سر ظفر اللہ خان وائسرائے کی کونسل میں گیا تھا

اور اسی کے کہنے پر سر ظفراللہ خان نے مسلم لیگ پر قبضہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ احرار اس محاذ پر بھی کامیاب رہے۔

مسجد شہید گنج کا سانحہ

نولکھا اور لنڈا بازار لاہور کے درمیان گوردوارہ شہید گنج کے احاطے میں ایک شاہجہانی عہد کی مسجد، رنجیت سنگھ کے عہد سے سکھوں کی تحویل میں تھی۔ انگریزی حکومت کے قیام کے پچاس ساٹھ سال بعد ایک شخص نے مسجد کا متولی ہونے کی حیثیت سے قبضہ کا دعویٰ کر دیا جو ایک صدی سے زائد پرانا قبضہ ہونے کی وجہ سے خارج ہو گیا۔ 1925ء کے گوردوارہ ایکٹ کے تحت گوردوارہ کا انتظام سکھوں کو ملا۔ تو انجمن حمایت الاسلام کے صدر محسن شاہ نے پھر مقدمہ دائر کر دیا کہ مسجد گوردوارہ کی ہے نہ سکھوں کی بلکہ مسلمانوں کی ہے۔ اس لئے انجمن کو دے دی جائے مگر مقدمہ 1934ء میں خارج کر دیا گیا قبضہ ملنے پر سکھوں نے اردگرد کی عمارتوں کو گرانا شروع کر دیا وہ جون 1935ء تک مسجد تک پہنچ گئے مسلمانوں نے احتجاج کیا فسادات کا خطرہ بڑھا تو حکومت نے 28 جون کو وہاں فوج اور پولیس کا پہرہ لگا دیا اور سکھوں کو مسجد کو چھیڑنے سے روک دیا گیا۔ گورنر سے بات چیت ہوئی تو اس نے وعدہ کیا کہ وہ معاملے پر غور کرے گا لیکن 7/8 جولائی کی درمیانی رات کو سرکاری کرینوں کی مدد سے مسجد کو شہید کر کے ملبہ کا ڈھیر بنا دیا گیا اس پر مسلمان مشتعل ہو گئے اور ان کے اشتعال میں روز بروز اضافہ ہونے لگا 14 جولائی سہ پہر کو مولانا ظفر علی خان نے ایک عظیم الشان اجلاس سے خطاب کیا اور کہا کہ لاہور کے عوام احرار سے قیادت کی بجا طور پر توقع کرتے تھے ہم نے احرار کو یہاں تک لانے کی پوری کوشش کی ہے مگر انہوں نے انکار کر دیا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے دس ہزار رضاکاروں کی بھرتی کا اعلان کیا جو تاریخ میں "نیلی پوش" کے نام سے مشہور ہیں۔ مولانا کی پارٹی "اتحاد ملت پارٹی" کہلائی۔ اسی رات مولانا ظفر علی خان، سید حبیب، ملک لال خان اور میاں فیروز الدین کو گرفتار کر لیا گیا۔ اس پر عوام اور زیادہ جذباتی اور مشتعل ہونے لگے۔ لاٹھی چارج ہوتے رہے، گولیاں چلتی رہیں اور معاملہ مزید بڑھتا گیا۔ 19 جولائی کو نماز جمعہ کے بعد مولانا کے صاحبزادے اختر علی کی تقریر نے جلتی پہ تیل کا کام کیا چنانچہ لوگ مسجد کی طرف قافلہ

در قافلہ جانے لگے۔ گورا فوج نے دہلی دروازہ کے قریب ہی ان کا راستہ روک رکھا تھا۔ رات کو کرفیو نافذ کر دیا گیا' مگر رات بھر بازاروں میں چہل پہل رہی اور رضاکار مجاہدین نے رات بھر وہیں سڑک پر قیام کیا۔ آخر ہفتہ کو وہ خونیں حادثہ رونما ہو گیا جو اب تک ٹلتا آ رہا تھا۔ فوج نے فائرنگ شروع کر دی تو دین اسلام کی حرمت پہ کٹ مرنے والے مجاہدین نے اپنے سینے کھول کر گولیوں کے سامنے پیش کر دیئے۔ ہزاروں اسلام کے شیدائی شہید ہوئے' اس کے باوجود مسلمانان نیک خصال اور فدایان اسلام نے محاذ نہ چھوڑا۔ دوسرے دن بھی اختر علی خان کو حکومت نے استعمال کیا اور انہوں نے حلفاً" مولانا ظفر علی خان کی طرف سے پیغام سنایا کہ مسلمانوں کا یوں مورچہ لگانا ٹھیک نہیں' بہتر ہے کہ لوگ اس وقت اٹھ جائیں۔ چنانچہ مسلمان بادل نخواستہ وہ محاذ چھوڑنے لگے۔ لطف یہ کہ اتنے بڑے جوش و خروش کے باوجود فرقہ وارانہ فسادات نہ ہوئے اور یہ ثابت کر دیا کہ فرقہ وارانہ فسادات کی ابتداء ہندوؤں کی طرف سے ہوا کرتی تھی۔

اتنے خون کے باوجود معاملہ سرد نہ پڑا بلکہ مدت تک لوگ ٹولیوں میں جا جا کر گرفتاریاں پیش کرتے رہے۔ 21 فروری 1936ء کو مسٹر جناح لاہور آئے۔ انہوں نے نہایت خوش اسلوبی سے فریقین سے گفتگو کر کے سکھوں اور مسلمانوں کے تین تین آدمیوں پر مشتمل ایک مشترکہ بورڈ بنایا کہ یہ لوگ باہم مل کر کوئی فیصلہ کریں۔ اس فیصلے سے مسلمان مطمئن ہو گئے۔ نیز سکھوں نے بھی اس پر اپنی خوشنودی کا اظہار کیا۔ اسی اثنا میں ڈاکٹر عالم نے مقدمہ دائر کر دیا جس کو 25 مئی 1936ء کو خارج کر دیا گیا جس پر ملک برکت علی نے ہائی کورٹ میں اپیل کر دی۔ اکتوبر 1937ء کو مسلم لیگ نے اپنے لکھنؤ اجلاس میں ایک خاص قرارداد پیش کی جس میں کہا گیا کہ اگر اس قضیے کا کوئی مناسب حل تلاش نہ کیا گیا تو مسلم لیگ اس کے کل ہند مسئلہ ہونے کی بنا پر ایک خاص اجلاس بلائے گی۔ 25 مئی 1938ء کو مذکورہ اپیل بھی خارج کر دی گئی۔ تو لوگوں میں اس کے خلاف شدید ہیجان اور اضطراب پیدا ہو گیا اب پھر احتجاج کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ اب حرار بھی میدان میں آ گئے انہوں نے بھی اپنے آپ کو گرفتاری کے لئے پیش کر دیا گرفتاریاں ہونے لگیں جو ایک ہزار سے تجاوز کر گئیں۔ 31 جنوری 1938ء کو دہلی میں مسلم لیگ نے اپنا خاص اجلاس طلب کیا اور اس کی اپیل پر 18 فروری کو ملک گیر پیمانے پر مسجد شہید

گنج منایا گیا جس سے مسلم لیگ کے اثر و رسوخ میں اضافہ ہوا۔

سر فضل حسین کے بعد سر سکندر اس کے جانشین بنے جو صحیح معنوں میں ان کے جانشیں تھے۔ وہی امیرانہ و جاگیردارانہ فکر و انداز' دولت انگریزی کی وفاداری' ہندو کی ناز برداری اور مفاد پرستی یہ وہ اوصاف تھے جن کی بنا پر پنجاب میں مسلمانوں کو بہت بڑا نقصان ہوا۔ انہوں نے بھی وہی جاگیردارانہ اور انگریز کی وفادارانہ پالیسی کو اپناتے ہوئے صورت حال کو بدلنے کی کوشش کی۔ انہوں نے قطعاً" یہ کوشش نہ کی کہ معاملہ خوش اسلوبی سے طے ہو۔ مسلمانوں کا منہ بند کرنے کے لئے علامہ اقبالؒ سے بیان دلوانے کی کوشش کی کہ ابھی پریوی کونسل میں اپیل کی گنجائش ہے لیکن وہ ان کے آلۂ کار نہ بنے۔ اس کے بعد ملک برکت علی نے پنجاب اسمبلی میں تحفظ مساجد کا بل پیش کرنے کا پروگرام بنایا اور کہا اس کا اطلاق موثر بہ ماضی بھی ہو۔ انہیں اس صورت حال میں یونینسٹ پارٹی کے چوبیس مسلم ارکان اسمبلی کی حمایت بھی حاصل تھی۔ سر سکندر کے لئے یہ بڑے کڑے امتحان کا وقت تھا ایک طرف مسلمانوں کے جذبات واحساسات اور دینی غیرت تھی اور دوسری طرف غیر مسلموں کے بگڑ جانے کی صورت میں وزارت چھن جانے کا خطرہ تھا۔ انہوں نے دینی غیرت اور مسلمانوں کے جذبات کی پرواہ کئے بغیر وزارت کو بچانے کی تدبیر کی اور گورنر کو کہہ کر اس کے خصوصی اختیارات کے ذریعے اس بل کو اسمبلی میں پیش ہونے سے روک دیا۔

اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

بہرحال مسجد شہید گنج کے حادثہ نے جہاں سر فضل حسین اور سر سکندر کی غیرت ایمانی کا پول کھول دیا وہاں احرار کے سیاسی کردار کا دیوالیہ پن واضح کر دیا۔ عوام کو احرار سے بہت بڑی امید تھی کہ وہ اس نازک گھڑی میں قوم کی قیادت کرے گی اور حقیقی جذبہ ایمانی کی مثال قائم کرتے ہوئے خود بھی قربانی دے گی اور عوام سے بھی بڑھ چڑھ کر قربانی دلوائے گی لیکن وہ ایسے منقار زیرپا ہوئے کہ سب امیدیں خاک میں مل گئیں۔

گفتار کا یہ غازی تو بنا　　　کردار کا غازی بن نہ سکا

عوام کا اس جماعت پر سے اعتماد اٹھ گیا جس کی بنا پر یہ رفتہ رفتہ اپنی قوت کھو بیٹھی۔

خطبہ الہ آباد

یہ خطبہ علامہ اقبال کی اعلی بصیرت اور دور بینی کا مظہر ہے۔ 1930ء میں مسلم لیگ کا اجلاس الہ آباد میں ہونا تھا لیکن اکثر قائدین گول میز کانفرنس کے لئے لندن چلے گئے تھے اس لئے منتظمین جلسہ نے صدارت کے لئے علامہ اقبال کا انتخاب کیا جس کے لئے وہ رضامند ہو گئے۔ یہی وہ خطبہ ہے جو تاریخی لحاظ سے پاکستان کے دو قومی نظریے کی بنیاد بنا۔ اس میں آپ نے دو قومی نظریہ کو صاف اور واضح الفاظ میں بیان کیا جس نے ہندوستان میں ملت اسلامیہ کے لئے راہیں متعین کردیں آج تک مسلمان آئینی تحفظات کا مطالبہ کرتے آرہے تھے لیکن ہندو اپنی اکثریت کی بنا پر تحفظات دینا نہیں چاہتے تھے اور مسلمانوں کو اپنا غلام رکھنا چاہتے تھے جیسا کہ نہرو رپورٹ سے ظاہر ہو رہا ہے۔ اس خطبہ نے مسلمانوں کو ایک نئی اور واضح سوچ عطا کی آپ نے اس خطبہ میں مسلم ریاست کا واضح نصب العین عطا کیا۔ آپ نے ہندوؤں کے متحدہ قومیت کے تصور کی نفی کی اور مسلمانوں کے لئے الگ وطن کا مطالبہ کیا۔ یوں تو ہم نے اس کا مکمل متن کتاب کے آخر میں پیش کر دیا ہے یہاں پر ہم اس کے چند اہم نکات پیش کر رہے ہیں تاکہ قاری کو تبدیل ہوتے ہوئے حالات کا صحیح ادراک ہو سکے۔

1- اسلام ایک عالمگیر دین ہے اور اگر اس قیاس پر بنیاد رکھ لی جائے کہ ہندوستان کے مسلمان ہر حال میں اسلامی روح کو قائم رکھنا چاہتے ہیں تو میں اس روشنی میں اپنی بصیرت کی راہنمائی میں اس قیاس کی بنیاد پر آپ کو کچھ احساس دلانے کی سعی کروں گا میری رائے یہ ہے کہ اسی کو ہمارے تمام فیصلوں کی اساس ہونا چاہیے۔

2- میں اسلام کو ایک زندہ حقیقت' طاقت سمجھتا ہوں وہ طاقت جو انسانوں کے ذہن کو وطن

اور نسل کے تصور کی قید سے آزادی دلا سکتی ہے۔ اسلام ریاست اور فرد کی زندگی میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے یہ ایک دستور حیات ہے' ایک نظام ہے بس یہی وہ بات ہے کہ ہم اگر اسے پالیں تو مستقبل میں ہندوستان کی ایک نمایاں تہذیب کے علمبردار بن سکتے ہیں۔

3- ہندوستان ہی وہ ملک ہے جس میں اسلامی وحدت کی بے پناہ طاقت ایک نمونہ بن کر سامنے آئی ہے۔ جمعیت اسلام کی ترکیب بھی اسلامی روح کا نتیجہ ہے اس لئے ہمارے تمدن یعنی اسلامی تمدن میں مخصوص اخلاقی شعور موجود ہے۔

4- ہندوستان مسلمانوں کا سب سے بڑا ملک ہے اسلام کو بطور ایک متمدن قوت کے زندہ رہنے کے لئے ضروری ہے کہ ایک مخصوص علاقہ میں اس کی مرکزیت قائم ہو۔

5- آپ نے مغربی ممالک اور ہندوستان کا تقابل کرتے ہوئے واضح کیا کہ یہاں ایک سے زیادہ قومیں آباد ہیں جب کہ مغربی ممالک میں ہر ایک ملک میں بالعموم ایک ہی قوم آباد ہے لیکن یہاں پر ایک قوم نہیں بلکہ کئی قومیں آباد ہیں اس لئے یہاں مختلف علاقوں میں مختلف نسلیں ہیں اور مختلف مذاہب ہیں ان کے افعال یکساں کیسے ہو سکتے ہیں۔ جہاں تک خود ہندو ایک قوم نہیں ہیں ان حالات میں ہندوستان کے اندر مغربی انداز جمہوریت کیسے ممکن ہے اس لئے آج مسلمان یہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ ہندوستان کے اندر ہی ایک اسلامی ہندوستان کا قیام عمل میں لایا جائے۔

6- یہ تجویز انگریز اور ہندوؤں کے لئے پریشانی کا باعث نہیں ہونا چاہیے ہندوستان میں مسلمان دنیا بھر کے مقابلے میں اکثریت میں ہیں لہٰذا ہماری خواہش ہے کہ ہندوستان میں اسلام کو تمدنی طاقت بن کر زندہ رہنا چاہیے اور اس مقصد کے لئے اسے مرکزیت قائم کرنا ہو گی۔

7- ہندوؤں کے اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے آپ نے فرمایا "میں سمجھتا ہوں کہ اب یہ بات واضح ہے کہ ہندوستان کی مختلف زبانیں' عقائد اور معاشرت میں جو اختلافات کی خلیج حائل ہے اس کے پیش نظر مستقل اور مستحکم حکومت کے قیام کی ایک ہی صورت ہے کہ ہندوستان میں مختلف آزاد ریاستیں قائم کر دی جائیں جو تاریخ' زبان' مذہب' نسل اور اشتراک پر مبنی ہوں۔

8- میری خواہش ہے کہ پنجاب' صوبہ سرحد' سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک ریاست بن دیا جائے جہاں مسلمان اپنا نصب العین سلطنت برطانیہ کے تحت رہ کر خود مختاری حاصل کرے یا پھر انگریزی اقتدار سے علیحدہ رہ کر۔

9- مسلم مملکت کا میرا یہ مطالبہ ہندوستان اور اسلام دونوں کے لئے فائدہ مند ہوگا۔ ہندوستان کو اس سے امن و سلامتی کی ضمانت مل جائے گی۔ اسلام کو اس سے ایسا موقع میسر آئے گا جس سے یہ اس دھبہ کو مٹا سکے گا جو عرب ملوکیت نے اس پر زبردستی لگا رکھا ہے اور اس قابل ہو سکے گا کہ یہ اپنے قوانین' تعلیم و ثقافت کو پھر سے زندگی اور حرکت عطا کر سکے گا اور انہیں عصر حاضر کی روح کے قریب لانے کے قابل ہو سکے۔

تبصرہ

یہ خطبہ اپنے اندر ایک بہت بڑی حقیقت کو سموئے ہوئے تھا اس نے مسلمانوں کے لئے جو اب تک آئینی و دستوری تحفظات کی بات کر رہے تھے ان کو ایک نئی راہ دکھادی ہندوؤں نے اس خطرے کو بھانپ لیا۔ انہوں نے اس کی قدر و قیمت کم کرنے کے لئے اس پر بھرپور تنقید کرنا شروع کر دی۔ اس کو دیوانے کا خواب کہا۔ شاعر کی تعلی قرار دیا۔ غرض ہندو پریس نے اسے خوب اچھالا جس کی آواز انگلستان تک پہنچ گئی۔ وہاں مسلمان طالب علم زیر تعلیم تھے ان میں ایک لڑکا رحمت علی بھی تھا اس نے علامہ اقبال کی اس سکیم کو سامنے رکھتے ہوئے ہندوستان کے جن علاقوں میں مسلمان موجود تھے ان کو سامنے رکھتے ہوئے اپنے ایک مضمون "اب یا کبھی نہیں" (Now Or Never) میں ہندوستان کے بہت سے حصے بخرے کر دیئے جن میں شمال مغربی ہندوستان کو کشمیر سمیت "پاکستان" کا نام دیا۔ کس کو خبر تھی کہ کسی دن اس نام کا ملک دنیا کے نقشے پر ابھر آئے گا۔

نہ صرف یہ بلکہ بعد کے بہت سے لوگوں نے بھی ہندوستان کے مسئلے کا حل تقسیم ہند کو قرار دیا۔ ان میں مولانا مودودی اور اس قبیل کے دوسرے لوگ شامل تھے۔

گول میز کانفرنسیں

دستوری معاملات کے معاملے میں ہندوستانیوں کا متفق نہ ہونا ایسا امر تھا جس پر برطانوی حکومت خاموش تماشائی نہ بن سکتی تھی۔ ادھر 1929ء کے انتخابات کے نتیجے میں برطانیہ کی لیبر پارٹی برسراقتدار آئی جس کے قائدین کے ہندو کانگریس کے لیڈروں سے قدیم تعلقات تھے۔ اس لئے کانگریس پر امید تھی کہ مسلمانوں کو نظرانداز کر کے ان کے مطالبات کو تسلیم کرلیا جائے گا لیکن اس کو بہت جلد مختلف حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ 27 جون 1929ء کو مسٹر جناح نے برطانوی وزیر اعظم ریمزے میکڈونلڈ کو ایک خط لکھا جس میں برصغیر کے حالات کا تجزیہ کر کے یہ تجویز پیش کی کہ تمام قوموں کے لیڈروں کو ایک کانفرنس میں جمع کیا جائے اور وہ برطانوی ذمہ داران حکومت کے سامنے اپنا موقف پیش کریں اور وزیر اعظم خود ان کے درمیان کسی فارمولے پر اتفاق کروانے کی کوشش کریں۔ اس قسم کا ایک خط سائمن نے بھی لکھا تھا چنانچہ لارڈ ارون وائسرائے ہند کو انگلستان بلایا گیا جس نے واپس آکر 31 اکتوبر 1929ء کو اعلان کیا کہ برطانوی حکومت ہندوستانی لیڈروں کو مشاورت کے لئے لندن بلائے گی۔

اس مرحلے پر گاندھی جی نے مکمل خودمختاری کا مطالبہ کردیا۔ چونکہ کانگریس پہلے ہی اعلان کرچکی تھی کہ اگر 31 اکتوبر تک نہرو رپورٹ کی بنا پر دستوری خاکہ تیار نہ کیا گیا تو کانگریس مکمل آزادی کے لئے سول نافرمانی کی تحریک شروع کرے گی۔ اب جب مشاورت کا اعلان ہوا تو ہندو قیادت کو احساس ہوگیا کہ ایک ہی جگہ بیٹھ کر بحث و تمحیص میں دلائل کا وزن ہوگا۔ اور ہندو قیادت جو چانکیہ طرز عمل سے مسلمانوں کو دھوکہ دے رہی تھی اس کی بنا پر دلائل دینے سے قاصر رہ گئی کیونکہ دھوکے اور جھوٹ کے دلائل وزنی نہیں ہوتے اس لئے گاندھی نے 2

جنوری 1930ء کو یوم آزادی منانے کا فیصلہ کیا' ساتھ ہی گول میز کانفرنس کے بائیکاٹ اور سول نافرمانی شروع کرنے کا اعلان کر دیا۔

اب ہندوؤں نے پھر دوہری چال چلنی شروع کی ہندو مہاسبھا اور دیگر جماعتوں کو کہا گیا کہ وہ کانفرنس میں شریک ہوں اور کانگریس خود تحریک کے ذریعے دباؤ ڈالنے لگی۔ کانگریس اراکین مجالس قانون ساز کو ہدایت کی کہ وہ استعفے دیں اور سرکاری محصولوں کی ادائیگی سے انکار کی تحریک چلائیں۔ گاندھی اس تحریک کے قائد مقرر ہوئے انہوں نے نمک کی ستیہ گرہ سے تحریک کا آغاز کیا۔ محمد علی جوہر نے مسلمانوں کی نمائندگی ان الفاظ میں کی:

"ہم مسٹر گاندھی کا ساتھ دینے سے انکار کرتے ہیں کیونکہ ان کی تحریک ہند کی مکمل آزادی کی تحریک نہیں بلکہ اس کا مقصد سات کروڑ مسلمانوں کو ہندو مہاسبھا کا غلام بنانا ہے۔"

اس اہنسائی ستیہ گرہ میں ہندو مسلم فسادات اور پولیس کے ساتھ تصادم کے بے شمار واقعات ہوئے جن میں سرکاری بیان کے مطابق مئی تک 115 آدمی گولی کا نشانہ بنے' 420 آدمی زخمی ہوئے۔ (تحریک کانگریس' از پروفیسر پریتم سنگھ' 187) چونکہ مسلمان اس میں شریک نہ ہوئے اور ہندو بذات خود ایک قوم نہ ہونے کی بنا پر تحریک چلانے کے قابل نہیں ہوتے جس کی وجہ سے ان کی ہر تحریک بعد میں ناکامیوں کا شکار ہوئی۔ یہ تحریک بھی جلد دم توڑ گئی۔ گاندھی قید ہوئے اور مارچ 1938ء کو گاندھی اروِن پیکٹ کے تحت رہا ہوئے اور گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے تیار ہو گئے۔

گاندھی اروِن پیکٹ

پہلی گول میز کانفرنس کی عدم شرکت سے یہ محسوس کیا گیا کہ اگر ہندوؤں کی یہ جماعت آئندہ کے گول میز اجلاس میں بھی شامل نہ ہوئی تو وہاں طے ہونے والے اصولوں کی اہمیت کم ہو جائے گی اور وہ مقاصد حاصل نہ ہو سکیں گے جن کے لئے گول میز کانفرنس کے انعقاد کی ضرورت محسوس کی گئی تھی لہٰذا دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے وائسرائے ہند لارڈ اروِن اور کانگریسی راہنماؤں میں بات چیت ہوئی جس کے نتیجے میں ایک معاہدہ ہوا جو عموماً "گاندھی اروِن معاہدہ کہلاتا ہے۔ جس کی رو سے کانگریس نے سول نافرمانی اور قانون شکنی

کی تحریک واپس لے لی اور حکومت نے تمام سیاسی قیدیوں کو رہا کر دیا سوائے ان قیدیوں کے جن پر تشدد کے الزامات عائد ہوئے تھے۔ حکومت نے یہ رعایت بھی دی کہ جو جرمانے ابھی تک وصول نہیں ہوئے وہ معاف کر دیئے جائیں گے۔ ہندوؤں کی اس تحریک کے دوران کئی لوگوں نے سرکاری ملازمت چھوڑ دی تھی حکومت نے وعدہ کیا کہ جن خالی ہونے والی جگہوں کو ابھی تک پر نہیں کیا گیا وہاں استعفی دینے والوں کو واپس لے لیا جائے گا۔

یہ معاہدہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے بڑا عجیب تھا ایسے معلوم ہوتا ہے کہ دو مساوی الحیثیت شخصیات کے درمیان معاہدہ طے پا رہا ہے اس سے حکومت کے وقار کو سخت دھچکا لگا کہ کل تک جو لوگ حکومت کے لئے درد سر بنے ہوئے تھے آج ان کی ہر بات مانی جا رہی ہے۔ اور ہندو بنیا اپنی معیشت کی بحالی کے لئے ہر جگہ ڈنڈی مار رہا ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کوئی گروہ بھی اپنی قوت کے ذریعے حکومت سے اپنی من مانی منوا سکتا ہے۔

گول میز کانفرنس کا پہلا دور:

یہ کانفرنس 12 نومبر 1930ء سے 19 جنوری 1931ء تک جاری رہی کانگریس نے اس اجلاس کا بائیکاٹ کیا لیکن ہندوؤں کے مہاسبھائی ذہنیت کے لوگ کانفرنس میں شریک ہوئے اور مسلم نمائندگان میں سے سر آغا خان' سر شاہ نواز' نواب سعید احمد چھتاری' مولانا محمد علی جوہر' مولوی فضل حق' اے کے غزنوی' غلام حسین ہدایت اللہ' راجہ شیر محمد' نواب عبدالقیوم' سر سلطان احمد' حافظ ہدایت حسین' بیگم شاہ نواز' مسٹر محمد علی جناح' میاں سر محمد شفیع' چوہدری سر ظفر اللہ خان' ڈاکٹر شفاعت احمد خان کانفرنس میں شریک ہوئے۔ کانفرنس میں یہ طے پایا کہ آئندہ آئین وفاقی پارلیمانی ہو گا' صوبوں کی حکومتیں کاملا" اسمبلیوں کے سامنے جواب دہ ہوں گی۔ سندھ کو الگ صوبہ بنا دیا گیا جس پر مونجے نے اختلافی نوٹ لکھا۔ اقلیتی امور پر صرف اس حد تک اتفاق ہو سکا کہ اقلیتوں کا تحفظ ضروری ہے۔

کانفرنس نے اپنے کام کو تیز کرنے کے لئے آٹھ سب کمیٹیاں قائم کیں جن میں سے وفاقی امور اور اقلیتی امور کی کمیٹیاں اہم تھیں۔ سر محمد شفیع اور مسٹر محمد علی جناح دونوں وفاقی امور کی کمیٹی میں شامل تھے اور سر شفیع نے اعلان کر دیا کہ وفاقی امور کی کمیٹی اس وقت تک کوئی

فیصلہ نہ کرے گی جب تک کہ اقلیتی امور طے نہ ہو جائیں اقلیتی امور پر کوئی فارمولا طے نہ ہو سکا۔

وزیر اعظم کا اعلان

کانفرنس کا اجلاس جاری تھا کہ 19 جنوری 1931ء کو وزیر اعظم نے اعلان جاری کر دیا جس میں انہوں نے جن باتوں پر کانفرنس میں اتفاق رائے ہو گیا تھا ان کو قبول کر لینے کا اعلان کیا وزیر اعظم نے مرکز اور صوبوں میں ذمہ دار حکومتوں کے قیام' دفاع' امن عامہ اور خارجہ کے علاوہ تمام محکمے مقامی وزراء کے حوالے کرنے' اور وفاقی طرز حکومت میں صوبوں کو زیادہ سے زیادہ خود مختاری دینے کا اعلان کیا۔ اس اعلان کی تائید میں دونوں ایوانوں نے قرار دادیں منظور کیں۔ عملی طور پر کانگریس کے مطالبات پورے ہو رہے تھے لیکن مسلمانوں کے مسائل ابھی تک معلق ہی تھے۔ اس پر کانگریس خوش ہو گئی۔ گاندھی نے ستیہ گرہ کی تحریک ختم کی اور کانفرنس میں شرکت پر رضامند ہو گئے۔

مولانا محمد علی جوہر کی وفات

مولانا محمد علی جوہر کانفرنس میں شرکت کے لئے بیماری کی حالت میں گئے تھے وہ اقلیتوں کے حقوق کی کمیٹی کے رکن تھے۔ وہ 4 جنوری 1931ء کو وفات پا گئے (ان کے مکمل حالات زندگی آخر میں دیئے گئے ہیں) انہوں نے وفات سے دو دن پہلے وزیر اعظم کے لئے درج ذیل یادداشت لکھوائی:

"میں شاید ہر ہندوستانی سے زیادہ اس کا خواہش مند ہوں کہ غیر ملکی اقتدار ختم ہو جائے ...... یعنی وہ اقتدار ختم ہو جائے جو ایک "دکانداروں کی قوم" نے ہماری قسمتوں پر حاصل کر لیا ہے۔ لیکن میں یہ ہرگز نہیں چاہتا کہ غیر ملکی دکانداروں کی بجائے خود اپنے ملک میں دکانداروں کے ایک ملکی فرقہ کو اپنی قسمت پر حاوی کر دیا جائے۔" .... انہوں نے مسلمانوں کے لئے جداگانہ انتخابات پر اصرار کیا۔ مسلمانوں کی نشستوں کے تعین پر زور دیا اور مسلمانوں کی ثقافت اور مذہب کے لئے دستوری تحفظات کا تقاضا کیا۔

انہوں نے گول میز کانفرنس کے دوران ایک تقریب میں اعلان کیا تھا کہ میں اب غلام

ملک میں نہیں جاؤں گا ان کے یہ الفاظ صحیح پیشین گوئی ثابت ہوئے وفات کے بعد ان کو بیت المقدس میں دفن کیا گیا جہاں ان کو "مجاہد ہندی" کہا جاتا ہے۔

گول میز کانفرنس کا دوسرا دور

یہ دور 7 ستمبر1931ء سے یکم دسمبر تک جاری رہا اور گاندھی' کانگریس کے واحد نمائندہ کی حیثیت سے شریک ہوئے اور ان کی خواہش کے باوجود ابوالکلام آزاد اور ڈاکٹر مختار احمد انصاری کو ان کے ساتھ نہ بھیجا گیا۔ مسلم وفد میں مولانا شوکت علی' علامہ اقبال' مولانا شفیع داؤدی اور سر علی امام کو بھی شامل کر لیا گیا۔ گاندھی نے انگلستان روانہ ہونے سے پہلے ہی نامعقولیت کا مظاہرہ کرنا شروع کر دیا۔ انہوں نے کراچی میں ہی اقلیتی امور کے بارے میں ایک فارمولا پیش کر دیا جس میں تین نکات تھے' مخلوط انتخابات' نشستوں کا تعین اور پچیس فیصد سے کم آبادی والی اقلیت کے لئے عمومی نشستوں سے انتخابات لڑنے کا حق۔ یہ نہرو رپورٹ کی ترجمانی تھی جس کو مسلمان رد کر چکے تھے کانفرنس کا جب اجلاس شروع ہوا تو گاندھی نے اپنے علاوہ کسی اور کو ہندوستان کا نمائندہ ماننے سے انکار کر دیا اور اعلان کیا "کانگریس ہندوستان کی واحد نمائندہ جماعت ہے اور میں اس جماعت کا واحد نمائندہ ہوں" لیکن جب ان سے کہا گیا کہ جو کچھ کانفرنس میں طے پائے گا وہ کانگریس سے منوالیں گے تو انہوں نے کہا کہ وہ کانگریس کے دونی کے ممبر بھی نہیں ہیں۔ ظاہر ہے ایسے تضادات کے پتلے "عجیب وغریب انسان" اور "نامعقول شخصیت" سے کیا بات چیت ہوتی۔ وہ تو بنیادی طور پر کانفرنس کو سبوتاژ کرنے گیا تھا۔ جب اس سے کہا گیا کہ اقلیتی مسئلے کا کوئی حل پیش کریں تو انہوں نے رٹی رٹائی نہرو رپورٹ کا ذکر کر دیا جسے سب فرقے مسترد کر چکے تھے۔ دراصل گاندھی اقلیت کو دھوکہ دینے اور کانفرنس کو ناکام کرنے آئے تھے جس میں وہ کامیاب رہے۔ اس پر وزیر اعظم نے اعلان کیا:

"اگر ایک معقول مدت کے اندر آپ لوگ اپنے مسائل طے نہ کر سکے تو ہمیں عدل وانصاف کے تقاضوں کے تحت فیصلہ کرنا ہو گا کہ اقلیتوں کو اکثریت کے ظلم سے بچانے کے لئے کیا تحفظات دینے چاہیں۔"

گاندھی نے واپس آکر پھر ستیہ گرہ کی تحریک چلانے کی کوشش کی لیکن اب اس کا واسطہ

لارڈ اروِن کی بجائے لارڈ ولنگڈن سے تھا جو سخت گیر تھا۔ نیز مسلمانوں کے سامنے کانگریس اور گاندھی کا اصلی چہرہ آچکا تھا وہ اس میں شریک ہی نہ ہوئے بلکہ وہ اس کے مخالف تھے۔ تو گاندھی جی اپنی تمام اندرونی آواز اور ہندوستان کا نمائندہ ہونے کے باوجود سخت ناکام ہوئے۔ عوام نے اس کی ایک نہ سنی اور تحریک بری طرح ناکام ہوئی۔ البتہ کافی کانگرسیوں کو جیل کی ہوا کھانا پڑی اور خود گاندھی بھی باوجودیکہ اس نے وائسرائے کو دوستانہ تعلقات کی بحالی کا پیغام دیا تھا جیل بھیج دیئے گئے۔ یوں گاندھی اپنی نامعقولیت کی بنا پر جیل چلے گئے۔

کمیونل ایوارڈ

ریمزے میکڈونلڈ کانگریسی لیڈروں کا اس حد تک مداح تھا کہ مولانا محمد علی جوہر اسے رام جی گمنداس کہا کرتے تھے یعنی انہیں ایک ہندو ہی قرار دیتے تھے۔ اسے اقلیتی امور کا فیصلہ کرنا تھا اور مسلمان اس سے کوئی اچھی توقعات نہ رکھتے تھے۔ فیصلے میں تاخیر ہوئی تو علامہ اقبال کی مسلم کانفرنس میں راست اقدام کا فیصلہ کر لیا لیکن حکومت کی یقین دہانی پر کہ ایوارڈ بہت جلد آنے والا ہے فیصلہ واپس لے لیا گیا۔ ریمزے نے 14 اگست 1932ء کو اپنا فیصلہ سنایا جس کے اہم نکات درج ذیل تھے:

1- جداگانہ انتخابات کا حق صرف مسلمانوں کو ہی نہیں بلکہ سب اقلیتوں کو دے دیا گیا۔
2- مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں کو 1/3 حصہ نشستیں دی گئیں۔
3- صوبائی مجالس میں اقلیتوں کو اپنے تناسب سے قدرے زیادہ نشستیں دی گئیں۔

مختلف صوبوں میں مسلمانوں کی نمائندگی کا گوشوارہ درج ذیل ہے۔

صوبہ	تناسب آبادی	نشستوں کی تعداد	مسلم نشستیں	فیصد
سرحد	91.8	50	36	72
سندھ	70.7	60	34	57
پنجاب	57.5	175	86	49
یوپی	15.3	228	66	29
بہار واڑیسہ	10.8	175	42	24

سی پی	4.7	112	14	14
بنگال	54.7	250	119	48
بمبئی	9.3	175	20	17
مدراس	7.9	215	29	13

اس طرح مسلمانوں کو پنجاب اور بنگال میں اکثریتی نشستوں سے محروم ہونا پڑا متحدہ ہندوستان میں تو اس تقسیم کا فائدہ تھا لیکن تقسیم ہند کے وقت اس تناسب نے مسلمانوں کو بہت نقصان پہنچایا۔

پونا پیکٹ

مہاتما گاندھی جیل میں تھا کہ کمیونل ایوارڈ کا اعلان ہوا جس کے ذریعے مسلمانوں کے علاوہ باقی اقلیتوں کے لئے بھی جداگانہ انتخابات کا حق مل گیا جس پر گاندھی تلملا اٹھا اس نے فوراً" وزیر ہند کو لکھا یہ چیز ہند کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے مترادف ہے میں اچھوتوں کی نمائندگی کے خلاف ہوں - اس نے مطالبہ تسلیم نہ ہونے کی صورت میں 20 ستمبر سے مرن بھرت رکھنے کی دھمکی دے دی - بھلا یہ انسانیت کا علمبردار کیسے گوارہ کر سکتا تھا کہ شودر بھی برہمنوں کے ساتھ آ بیٹھیں جب کہ وہ انہیں مندروں میں بھی داخل ہونے نہیں دیتے۔ ہندو لیڈر گاندھی کی جان بچانے کا ڈھونگ رچا کر دوڑ کھڑے ہوئے انہوں نے اچھوت لیڈر ڈاکٹر امبیڈکر کو ہموار کر لیا۔ وہ آخر اچھوت ہی نکلا' ہندو مذہب اسے لے ڈوبا۔ وہ برہمن کی موت سے ڈر گیا اور اچھوتوں کے حقوق سے دستبردار ہو گیا چنانچہ 25 ستمبر 1932ء کو پونا میں معاہدہ ہوا اور اچھوتوں نے ہندو غلامی کے پروانے پر دستخط کر دیئے۔ جس کا خمیازہ وہ آج تک بھگت رہے ہیں حالانکہ کا شاگرد گاندھی' ڈاکٹر امبیڈکر کو جل دینے میں کامیاب ہو گیا۔

دراصل ہندو ایک قوم نہیں ہیں اور نہ ہی کانگریس ان کی نمائندہ جماعت ہے۔ یہ تو چند سرمایہ داروں اور برہمنوں کی نمائندہ جماعت ہے جو اپنی چودھراہٹ کو ہندوؤں پر قائم رکھنا چاہتی ہے۔ خواہ یہ مذہبی ہو یا سیاسی۔ اس ترقی یافتہ دور میں بھی یہ لوگ ذات پات کے اسیر ہیں۔ جو کسی حالت میں نیچ ذات کو اپنے برابر دیکھنے کو تیار نہیں ہیں۔

گول میز کانفرنس کا تیسرا دور

یہ کانفرنس 10 نومبر تا 24 دسمبر 1932ء جاری رہی۔ اس میں بقیہ دستوری مسائل کا حل تلاش کیا گیا۔ متنازعہ مسائل طے ہو چکے تھے۔ اس وجہ سے اس میں گہما گہمی کم تھی۔ مسٹر محمد علی جناح لندن میں ہونے کے باوجود اس میں شریک نہ ہوئے۔ انہیں کانگرس سے اتحاد بڑا عزیز تھا۔ لیکن اب اس کی کوئی امید نہ رہی تھی۔ اس پر انہوں نے فرمایا:

"عین خطرے کے سامنے ہندو جذبات' ہندو ذہن اور ہندو رویئے نے مجھے اتحاد سے بالکل مایوس کر دیا ہے۔"

صوبہ سندھ کی علیحدگی اور سرحد میں اصلاحات

کمیونل ایوارڈ کا مطالعہ کریں تو یہ عیاں ہوتا ہے کہ انگریزوں نے اس کے ذریعے کانگرس یا ہندوؤں کی کافی حد تک حمایت کی تھی۔ اب انہوں نے مسلمانوں کی دل جوئی کے لئے سندھ کو بمبئی سے الگ کر کے ایک صوبہ بنا دیا۔ اور مسلمانوں کے دیرینہ مطالبہ کو مان لیا۔

شمال مغربی سرحد صوبہ 1901ء میں الگ صوبہ قرار پایا۔ لیکن فوجی خطرات کے پیش نظر اس میں نیم فوجی اور ظالمانہ قوانین نافذ کر دیئے گئے۔ مسلمانوں نے ہمیشہ یہ کوشش کی کہ اس صوبے کو دوسرے صوبوں کے برابر درجہ دیا جائے۔ لیکن کانگرسی لیڈروں کی عدم دلچسپی کی بنا پر کامیابی نہ ہو سکی۔ تیسری افغان جنگ کے بعد اس طرف سے حملہ کا خطرہ ٹل گیا۔ 1919ء کی اصلاحات کے بعد اس صوبہ کے عوام کے ساتھ انسانی برتاؤ کرنے کا مطالبہ زور پکڑ گیا۔ اس کا بھرپور احساس اس وقت ہوا جب سرخپوشوں کی تحریک کو جو کانگرس کی حمایت میں چل رہی تھی سختی سے کچل دیا گیا۔ اس سلسلہ میں پولیس اور فوج نے ظالمانہ قوانین کی آڑ میں نہایت وحشیانہ مظالم کئے۔ تو انسانی ضمیر چلا اٹھا۔ لہٰذا اب 1935ء کی اصلاحات کو اس صوبہ میں بھی نافذ کر دیا گیا۔ جیسا کہ دوسرے صوبوں میں کیا گیا۔ البتہ قبائلی علاقوں کے عوام اس انصاف سے محروم رہے۔

قانون ہند 1935ء

جہاں گورنمنٹ انڈیا ایکٹ 1919ء میں دی گئی اصلاحات ناکافی، غیر تسلی بخش اور مایوس کن تھیں وہاں یہ وعدہ امید افزا تھا۔ کہ بتدریج جوابدہ حکومت کے قیام کے لئے اقدامات کئے جائیں گے۔ لہٰذا 1919ء کی اصلاحات کے ساتھ ہی نئی اصلاحات کے لئے تجاویز آنی شروع ہو گئیں۔ نیز تحریک خلافت نے حکومت برطانیہ پر زبردست دباؤ ڈالنا شروع کر دیا۔ حکومت برطانیہ نے اسی مقصد کے حصول کے لئے سائمن کمیشن مقرر کیا۔ جس کا مسلم لیگ اور کانگرس نے بائیکاٹ کیا۔ خود ہندوستانی کانگرسی لیڈروں کی ہٹ دھرمی کی بنا پر کوئی مشترکہ فارمولا پیش نہ کر سکے۔ آخر حکومت نے متنازعہ مسائل کے حل کے لئے گول میز کانفرنس بلائیں۔ جو بہت حد تک ناکام رہیں آخر وزیر اعظم ریمزے نے فرقہ وارانہ مسئلہ کے حل کے لئے کمیونل ایوارڈ کا اعلان کیا۔ جس کے تحت ایک حد تک دستوری مسائل حل ہو گئے۔ اور قانون حکومت ہند 1935ء کے لئے راہ ہموار ہو گئی۔

الف۔۔ مرکزی حکومت

وفاق

اس قانون ہند کی رو سے مرکزی حکومت کو ایک ایسے وفاق کی شکل دی گئی جس میں برطانوی حکومت میں شامل تمام صوبے اور خواہش مند ریاستیں شامل تھیں خواہش مند دیسی حکمرانوں کو ایک معاہدے کے تحت اس میں شمولیت کا حق دیا گیا۔ اس معاہدے کے تحت ایک

دفعہ ریاست کے دیئے گئے اختیارات واپس نہیں ہو سکتے تھے البتہ وہ ریاست مزید اختیارات وفاق کو دے سکتی تھی۔

وفاقی مقننہ

وفاقی مقننہ دو ایوانوں پر مشتمل تھی۔

کونسل آف سٹیٹ

اس کے ارکان کی کل تعداد 260 تھی جن میں سے 156 برطانوی حکومت کے صوبوں کے نمائندے تھے اور باقی 104 دیسی ریاستوں کے۔ ان کا انتخابات دو سال کیئے لئے ہوتا تھا اور اس کے 1/3 حصہ ارکان ہر سال ریٹائر ہو جاتے تھے۔ جن کی خالی نشستوں کو انتخابات کے ذریعے پر کیا جاتا تھا۔

فیڈرل اسمبلی

اس کے ارکان کل تعداد 375 مقرر ہوئی جن میں سے 250 برطانوی ہند کے صوبوں اور 125 دیسی ریاستوں سے منتخب ہوتے تھے۔ ان کا انتخاب پانچ سال کے لئے ہوتا تھا۔ اس کی میعاد پانچ سال تھی۔ البتہ گورنر جنرل خاص وجوہ پر اسے برطرف کر سکتا تھا۔

قانون کے لئے کسی بل کو دونوں ایوانوں سے پاس ہونا ضروری تھا۔ اس کے بعد گورنر جنرل کے پاس منظوری کے لئے بھیج دیا جاتا جو اسے بادشاہ سلامت کی طرف سے منظور یا مسترد کر سکتا تھا۔ یا برطانوی حکومت سے مشورہ کے لئے محفوظ کر سکتا تھا۔ وہ بل میں بعض ترمیمات کر کے دونوں ایوانوں کو بل واپس کر سکتا تھا۔ ایسے بل جن کو گورنر جنرل برطانوی حکومت کے لئے محفوظ کر لیتا اگر برطانوی حکومت 12 ماہ کے اندر اندر اس کی توثیق کر دیتی تو وہ قانون بن جاتا ورنہ اس کی قانونی حیثیت خود بخود ختم ہو جاتی۔

رائے دہندگان میں توسیع

1919ء کی اصلاحات کے تحت صرف 2 فیصد آبادی ووٹ کا حق رکھتی تھی۔ اب مالیہ کی ادائیگی، کرایہ مکان اور انکم ٹیکس کی رقم میں کمی کر کے ووٹ کا حق زیادہ لوگوں کو دیا گیا۔ نیز ایک خاص معیار تعلیم حاصل کر لینے پر بھی ووٹ کا حق دے دیا گیا۔ جس کی وجہ سے ووٹروں کی

تعداد آبادی تین فیصد سے بڑھ گئی۔

مرکزی بجٹ

گورنر جنرل بجٹ کا سالانہ تخمینہ (آمدن و خرچ) مقننہ کے دونوں ایوانوں کے سامنے رکھتا۔ بجٹ کے دو حصے ہوتے تھے ایک حصہ 80 فیصد اور دوسرا 20 فیصد' پہلے حصے پر کوئی بحث یا کمی نہیں ہو سکتی تھی۔ دوسرے حصے پر البتہ بحث ہو سکتی تھی۔ اس کی درج ذیل شقیں تھیں:

1- گورنر جنرل کی تنخواہ' الاؤنس نیز اس کے دفتر پر اٹھنے والے اخراجات
2- قرضہ جات اور ان کی ادائیگی
3- کونسلروں' وزراء' مشیر مالیات' ایڈووکیٹ جنرل اور چیف کمشنروں کی تنخواہ
4- فیڈرل کورٹ اور دیگر کورٹس کے ججوں کی تنخواہ
5- گورنر جنرل کے خصوصی شعبہ جات کے اخراجات
6- برطانوی حکومت کے وہ اخراجات جو ہندی حکومت سے تعلقات قائم رکھنے کے لئے ضروری ہوں۔
7- صوبہ جات میں شامل کئے جانے والے علاقہ جات کے اخراجات
8- کسی عدالت یا ٹربیونل کے فیصلوں کے نفاذ کے لئے اخراجات

مرکزی انتظامیہ

اس قانون کے تحت نیم جوابدہ طرز کی حکومت مرکز میں قائم کی گئی۔ دفاع' خارجہ' مذہبی امور اور قبائلی علاقوں کا انتظام براہ راست گورنر جنرل کے قبضہ اقتدار میں تھا۔ اس مقصد کے لئے اسے تین وزراء کی کونسل بنانے کا اختیار دیا گیا۔ جو قانون ساز ادارے کے سامنے جوبدہ نہ تھے۔ ان کے علاوہ دیگر شعبہ جات کے لئے ایک کابینہ تشکیل دینے کا اختیار دیا گیا۔ جس میں دس وزراء تھے۔ یہ وزراء فیڈرل اسمبلی کے سامنے جوبدہ تھے۔ یہ اکثریتی پارٹی سے ہوتے تھے اور اس وقت تک اپنا منصب سنبھالے رہیں گے جب تک انہیں اسمبلی میں اکثریت کا اعتماد حاصل ہے۔

گورنر جنرل

گورنر جنرل تاج برطانیہ کا نمائندہ تھا یہ اپنی خصوصی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لئے ذاتی رائے سے اقدام کرنے کا حق رکھتا تھا۔ کابینہ یا مقننہ ان معاملات میں اس کے اقدامات میں رکاوٹ نہ ڈال سکتی تھیں۔ اس کی خصوصی ذمہ داریاں درج ذیل تھیں:

1- ہندوستان یا اس کے کسی حصہ میں امن عامہ کو درپیش خطرات کا سدباب

2- فیڈرل حکومت کے معاشی استحکام کا تحفظ

3- اقلیتوں کے جائز حقوق کا تحفظ

4- پبلک سروس کے ارکان اور ریٹائرڈ سرکاری ملازمین ' اور ان کی اولاد کے ان حقوق کا تحفظ جو اب تک انہیں دیئے جا چکے ہیں یا اس ایکٹ کی رو سے دیئے جا رہے ہیں۔

5- برما اور برطانیہ کے مال کے خلاف جو اس ملک میں درآمد ہوتا ہے اگر کوئی معاندانہ روش اختیار کی جائے تو اس کا انسداد۔

6- ہندوستانی ریاستوں اور ان کے حکمرانوں کے حقوق کا تحفظ

الف۔ وہ ان امور کی انجام دہی کے لئے صرف وزیر ہند کے سامنے جوابدہ تھا اور اس کے کسی اقدام کو اس وجہ سے خلاف قانون قرار نہیں دیا جا سکتا تھا کہ اس نے وزیر ہند کی رائے کے خلاف عمل کیا ہے۔

ب- کوئی مسودہ قانون اس وقت تک قانون نہیں بن سکتا تھا جب تک کہ گورنر جنرل اس کو منظور نہ کرے۔

ج- وہ فوری اقدامات کی خاطر آرڈیننس جاری کر سکتا تھا ایسا آرڈیننس قانون کا درجہ رکھتا تھا۔

د- اگر وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس ایکٹ کی رو سے حکومت چلانا ناممکن ہے تو وہ مزید اختیارات حاصل کر سکتا تھا۔ یا کسی ادارہ کو دیئے گئے اختیارات کو سلب کر کے خود حاصل کر سکتا تھا۔

ر- وہ فیڈرل کورٹ کے اختیارات حاصل کرنے یا فیڈرل کورٹ کے بارے میں کسی دفعہ کو معطل کرنے کا اختیار نہ رکھتا تھا۔

س- وہ تین سال تک ہنگامی صورت حال کا اعلان کر سکتا تھا۔ بشرطیکہ برطانوی پارلیمنٹ اس میں ترمیم یا توسیع نہ کرے۔

وزیر امور ہند اور اس کی کونسل

اس قانون کے ذریعے وزیر امور ہند کی کونسل توڑ دی گئی البتہ اسے مشیر رکھنے کا حق دیا گیا۔ یہ تاج برطانیہ کا نمائندہ تھا جسے برطانوی خزانہ سے تنخواہ ملتی تھی۔ یہ براہ راست یا گورنر جنرل کے ذریعے ہندوستانی معاملات پر اثر انداز ہو سکتا تھا۔

فیڈرل کورٹ

یہ عدالت ایک چیف جسٹس اور چھ دوسرے ججوں پر مشتمل تھی۔ جن کا تقرر تاج برطانیہ کرتا تھا ایک جج کی تقرری کے لئے ضروری تھا کہ وہ پانچ سال کے لئے کورٹ کا جج رہا ہو۔ یا دس سال تک ہائی کورٹ میں پریکٹس کر چکا ہو۔ چیف جسٹس کے لئے 15 سال کی پریکٹس ضروری تھی۔ دستور کی تشریح، تاویل اور حفاظت اس کی ذمہ داری تھی۔ گورنر جنرل دستوری معاملات میں اس کورٹ سے مشورہ لے سکتا تھا۔

یہ ہائی کورٹس کے خلاف اپیل سن سکتی تھی۔

ججوں کی ریٹائرمنٹ کی عمر 65 سال تھی۔ بددیانتی یا جسم و دماغ کی خرابی کی بنا پر اس سے پہلے بھی علیحدہ کئے جا سکتے تھے

ان کی تنخواہوں کا تعین تاج برطانیہ کی طرف سے ہوتا تھا۔

اس کے فیصلوں کے خلاف پریوی کونسل میں اپیل کی جا سکتی تھی۔

تقسیم شعبہ جات

اس قانون کے تحت شعبہ جات کی تین فہرستیں تیار کی گئیں:

1- مرکزی شعبہ جات
2- صوبائی شعبہ جات
3- مشترکہ فہرست

یہ طے کیا گیا کہ مرکزی شعبہ جات میں صوبائی حکومتیں یا قانون ساز ادارے' قانون بنانے یا مداخلت کرنے کے مجاز نہ ہوں گے۔ نہ ہی مرکز کو صوبائی فہرست میں ایسا کرنے کا حق ہو گا۔ البتہ مشترکہ فہرست میں دونوں آزاد تھے۔ صوبائی اور مرکزی قوانین میں تصادم کی صورت صوبے کا قانون کالعدم قرار پائے گا۔ یہ فہرستیں بڑی طویل تھیں۔ اور کوشش کی گئی تھی کہ کوئی شعبہ نہ رہ جائے۔ لیکن انسانی زندگی کو محیط کرنا انسان کے بس میں نہیں ہوتا لہٰذا گورنر جنرل کو اختیار دیا گیا۔ کہ ایسے حالات میں وہ جس فہرست میں اس کو چاہئے داخل کر دے۔

صوبائی حکومت

صوبائی گورنر

الف۔ یہ صوبے کے تمام انتظامی اختیارات کا مالک تھا جو وہ خود یا اپنے افسران کے ذریعے استعمال کرنے کا حق رکھتا تھا اس کے انتظامی اختیارات ان تمام امور پر حاوی تھے جو صوبائی مقننہ کے دائرہ اختیار میں دیئے گئے تھے۔

ب۔ گورنر صوبائی مقننہ سے اپنے وزارء مقرر کرتا۔ وہ ان کا اجلاس بلاتا۔ وہ اس وقت تک وزیر رہ سکتے تھے جب تک کہ گورنر راضی تھا۔

ج۔ اس کی درج ذیل خصوصی ذمہ داریاں تھیں:

1- صوبہ کے امن عامہ کا تحفظ
2- اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ
3- پبلک سروئس اور ان کے بچوں کے حقوق کا تحفظ
4- ان علاقوں کا انتظام جنہیں "جزوی طور پر غیر مشمولہ" قرار دیا گیا تھا۔
5- اس دیسی ریاست اور اس کے حاکم کی حفاظت جو صوبہ کے علاقے میں واقع ہو
6- صوبہ سندھ کے گورنر کو لائیڈ بیراج اور نہروں کا تحفظ بھی کرنا تھا۔
7- صوبائی مقننہ کے منظور کردہ بلوں کو منظور' مسترد یا ترمیم کرنا
8- ضروری حالات میں آرڈیننس جاری کرنا
9- اگر وہ محسوس کرتا کہ موجود صورت میں وہ اپنے فرائض ادا کرنے میں قاصر ہے تو وہ کسی

بھی ادارہ کے اختیارات اعلان کے ذریعے خود حاصل کر سکتا تھا۔

کابینہ:

صوبائی کابینہ کے وزراء کا تقرر گورنر کرتا تھا۔ ان کے لئے ضروری تھا کہ وہ مقننہ کے رکن ہوں یا چھ ماہ کے اندر رکن بن جائیں۔ یہ وزراء گورنر کے عطا کردہ محکموں کے انچارج ہوتے ان کی تنخواہ مقرر کرنے کا حق صوبائی مقننہ کو حاصل تھا۔

مقنّنہ

صوبائی مقنّنہ ایک یا دو ایوانوں پر مشتمل تھی۔ مدراس، بمبئی، بنگال، یوپی، بہار اور آسام میں دو ایوانی مقنّنہ تھی۔ باقی صوبوں میں ایک ایوانی تھی۔ ایوان بالا کو لیجسلیٹو کونسل اور ایوانِ زیریں کو لیجلیٹوا سمبلی کہا جاتا تھا۔ ایوان بالا کے 1/3 حصہ ممبران ہر سال ریٹائر ہو جاتے اور ان کی نشستیں دوبارہ انتخابات سے پر کی جاتیں۔ ان میں نامزد ممبران بھی ہوتے۔
قانون ساز اداروں کے ارکان کی تعداد کیمونل ایوارڈ کے مطابق تھی جن کی کم از کم تعداد 160 اور زیادہ سے زیادہ 250 تھی یہ صوبائی فہرست کے مطابق قانون سازی کر سکتے تھے۔ گورنر کسی بھی بل کو روک سکتا تھا دوران بحث بھی اس پر بحث بند کرا سکتا تھا۔

صوبائی بجٹ

گورنر اور اس کے وزراء ہر سال آمدن و خرچ کا تخمینہ مقنّنہ کے سامنے پیش کرتے۔ جس کے دو حصے تھے اس کا ساٹھ فیصد بجٹ ایسا تھا جس پر مقنّنہ بحث کر کے اس میں کمی بیشی کر سکتی تھی باقی چالیس فیصد پر وہ بحث کر سکتی تھی لیکن کمی کرنے کی مجاز نہ تھی۔ اس کے درج ذیل مدیں تھیں۔

1- گورنر کی تنخواہ اور اس کے دفتر کا خرچ۔
2- قرضہ جات، ان کی ادائیگی اور سود۔
3- وزراء اور ایڈووکیٹ جنرل کی تنخواہ۔
4- ہائیکورٹ کے ججوں کی تنخواہ اور الاؤنس

5- غیر مشمولہ علاقہ جات کا خرچ
6- ہائی کورٹ کے کسی فیصلے کو نافذ کرنے کے اخراجات

تنقیدی جائزہ

اس قانون کے تحت صہ ائی مرکزی خود مختاری کا ڈھونگ ضرور رچایا گیا ہے لیکن حقیقی اختیارات گورنر جنرل اور گورنروں کے پاس تھے۔ اسی لئے ایک ہندو لیڈر مدن موہن مالویہ نے کہا تھا "بظاہر یہ جمہوری شکل و شبہات رکھتا ہے لیکن اندر سے کھوکھلا ہے"۔ کانگریس نے مسلمانوں کے جداگانہ انتخابات کے حق کی بنا پر اس کو حدف تنقید بنایا۔ ریاستوں کی طرف سے ایوان بالا میں نامزدگیاں بھی شدید مخالفت کا باعث بنیں۔ پنڈت نہرو نے اسے ایسی مشین قرار دیا جس کی بریکیں مضبوط ہیں لیکن انجن نہیں ہے۔ مسلمانوں کے مطالبات بھی تسلیم نہ کیے گئے وہ چاہتے تھے کہ مرکزی حکومت کے پاس کم سے کم اختیارات ہوں اور صوبائی خودمختاری کے اصول کو پیش نظر رکھا جائے لیکن اس قانون کے تحت ایسا نہ کیا گیا اور مسلمانوں کو ہندو اکثریت کا غلام بنا دیا گیا۔ اسی لئے قائد اعظم نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا "یہ سکیم مکمل طور پر گندی' بنیادی طور پر بری اور قطعاً" ناقابل قبول ہے۔" اور مولوی فضل الحق نے اس پر تنقید کرتے ہوئے کہا:

"نہ ہندو راج ہو گا نہ مسلم راج ہو گا' بلکہ برطانوی راج قائم رہے گا۔"

دراصل اس قانون میں برطانیہ نے اپنی بیوروکریسی کو خوش کرنے اور مضبوط کرنے کی سعی کی ہے ان کو بھاری تنخواہیں دے کر مضبوط تر کیا گیا اور انگریزی راج کو مضبوط کیا گیا۔ ذمہ دار حکومت کے خواب کو پورا نہ کیا گیا بلکہ بندر اور بلیوں کی کہانی کو عملی صورت دی گئی اس قانون کے تحت ملک کو معاشی آزادی بھی حاصل نہ ہوئی۔ برطانوی تاجروں کو تحفظات دیئے گئے اور ان تاجروں کو مقننہ میں نشستیں بھی دی گئیں۔

مسلمانوں نے کمیونل ایوارڈ کو قبول کر لیا لیکن اس قانون کے صوبائی اور مرکزی حصوں کو قطعی غیر تسلی بخش قرار دیا۔

مسلم لیگ کا رابطہ عوام

انتخابات میں کانگریس کو بہت بڑی اکثریت حاصل ہوگئی تھی اور مسلمان اپنے اکثریتی صوبوں میں بھی بری طرح پٹ چکے تھے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کانگریس اپنے آپ کو کل ہند نمائندہ جماعت ثابت کرنے پر تل گئی۔ اور عملی طور پر ہندوستان میں رام راج کے نفاذ کے لئے کوشاں ہوگئی اس نے اس کامیابی کو سیکولرازم کی فتح قرار دیا اور مسلم قومیت کی گہری بنیادوں کو نظرانداز کرکے ہندوستانی قومیت کا زور شور سے پراپیگنڈہ شروع کردیا ہندو مسلم سوال کی واقعیت سے انکار کردیا۔ کہا گیا کہ عوام کے مسائل صرف اقتصادی ہیں مذہبی نہیں ہیں۔ مسلم حلقوں میں کانگریس کی ناکامی کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہاں کانگریس نے کام نہیں کیا۔ چنانچہ نہرو نے ابوالکلام آزاد' ڈاکٹر محمود انصاری اور جمعیت العلماء کے دیگر لوگوں سے کام لینا شروع کردیا اس نے اپنے گہرے تجربے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے علماء کو اپنے ساتھ گانٹھا اور ضمیر فروش لوگوں نے مسلمانوں کو کانگریس کا گرویدہ بنانا شروع کردیا۔ اور یہ حقیقت میں مذہبی کی بجائے سیاسی شدھی کی تحریک تھی۔ کانگریس نے اس پر بہت روپیہ خرچ کیا اس کے ساتھ ہی مسلم لیگ کے ٹکٹ پر منتخب ہونے والے ارکان کو بھی حرص و طمع کا فریب دے کر اپنے ساتھ ملانے کی کوشش شروع کردی۔ حرص و آز کے کچھ بندوں نے کانگریس میں شمولیت کا اعلان بھی کیا لیکن نہرو اور ابوالکلام آزاد کو اپنی پوری قادر الکلامی کے باوجود منہ کی کھانی پڑی اور یہ تحریک ناکام ہوگئی۔ ادھر جناب قائداعظم نے لیاقت علی خان اور دیگر احباب کو ساتھ ملایا اور مسلمانوں کو متحد کرنے کی جدوجہد شروع کردی۔ کانگریس نے جب یہ دیکھا کہ حالات اس کے حق میں ہیں کانگریسی علماء' احراری اور دیگر قوم پرست کانگریس کے لئے

کوشاں ہیں تو انہوں نے مسلم خالی نشستوں کے لئے ضمنی انتخابات میں اپنے امیدوار کھڑے کرنے کا اعلان کر دیا مگر بے شمار سرمایہ صرف کرنے کے باوجود کانگریس ایک بھی نشست نہ جیت سکی۔

البتہ سو فیصد یقینی ایک مسلم لیگی نشست پر کانگریس کے امیدوار رفیع احمد قدوائی کے خلاف چوہدری خلیق الزماں کے ایما پر مسلم لیگ نے اپنے نمائندہ کھڑا ہی نہ کیا اور یہ نشست مفت میں کانگریس کو مل گئی۔ دراصل مسلمانوں نے کانگریس اور اس کے حواریوں کو پہچاننا شروع کر دیا تھا اور ان کی غیرت ملی جاگ رہی تھی۔

جناح سکندر معاہدہ

سر فضل حسین انتخابات سے پہلے ہی فوت ہو گئے ان کی جگہ سکندر حیات خان نے لی۔ یہ اس وقت ریزرو بینک آف انڈیا میں ڈپٹی گورنر تھے۔ وہاں سے استعفیٰ دے کر وہ 30 ستمبر 1936ء کو لاہور پہنچے نواب مظفر نے بیماری کا بہانہ کر کے طویل چھٹی لے لی ان کی جگہ سکندر حیات خان ریونیو بورڈ کے ممبر بن گئے اور یہ سب کچھ گورنر کی ہدایات کے مطابق ہو رہا تھا۔ چنانچہ سکندر حیات نے انتخابات کے دوران اپنی پارٹی کی حمایت میں سرکاری وسائل بری طرح استعمال کیے اور انتخابات کے بعد وہ پنجاب کے وزیر اعظم بن گئے۔

یہ انتخابات مسلمانوں کو احساس زیاں دلانے کا کام کرنے لگے۔ کانگریس کی تیزی اور طوطا چشمی نے پنجاب پر بھی اثر ڈالنا شروع کر دیا۔ کانگریس سندھ اور سرحد میں مسلم وزارتوں کو تہہ و بالا کر چکی تھی اور پنجاب میں بھی یہ کھیل کھیلا جا سکتا تھا چونکہ سکندر کی وزارت کا انحصار غیر مسلم ممبران کی تائید پر تھا چنانچہ ان کی نظریں مسلم لیگ کی طرف اٹھیں پنجاب کے چیف پارلیمانی سیکریٹری میاں احمد یار دولتانہ نے ان خدشات کے پیش نظر مسٹر جناح سے یوں سلسلہ جنبانی شروع کیا:

"مسلمانان ہند نے اپنے لئے جو سیاسی تحفظات حاصل کئے ہیں انہیں اس وقت تک قائم رہنا چاہیے جب تک ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کوئی مستقل مفاہمت نہیں ہو جاتی۔ اس بارے میں تمام مسلمان متحد اور ہم خیال ہیں اس لئے کیا یونینسٹ اور غیر یونینسٹ

پنجاب کے تمام مسلمان آل انڈیا مسائل میں مسٹر جناح کے ساتھ اشتراک اور تعاون پر بالکل آمادہ ہیں۔"

اس کے ساتھ ہی سر فضل حسین کی وہ تجویز بھی موجود تھی کہ انتخابات کے بعد مسلم منتخب ارکان ایک نظم کے تحت جمع ہو جائیں گے اور مسلم لیگ اپنے قدم پنجاب میں جمانا چاہتی تھی اس لئے یہ موقع تھا کہ مسلم لیگی اور دوسرے حلقے لیگ کے اجلاس لکھنؤ اکتوبر 1937ء میں شرکت کے لئے روانہ ہوئے۔ لیگ کے وفد میں ملک برکت علی' بیرسٹر غلام رسول خان' خلیفہ شجاع الدین' مولانا ظفر علی خان اور حمید نظامی شریک ہوئے۔ جب کہ یونینسٹ پارٹی کے وفد میں سکندر حیات خان' خضر حیات' راجہ غضنفر علی' بیگم شاہ نواز اور دیگر شامل تھے۔ لکھنؤ میں کافی گفت و شنید کے بعد درج ذیل چند تحریری نکات پر اتفاق ہو گیا جس کا اعلان سکندر حیات نے خود کیا:

1- سکندر حیات اپنی پارٹی کے تمام ارکان کو مسلم لیگ کی رکنیت اختیار کرنے کی ہدایت کریں گے اور مسلم لیگ کے مرکزی اور صوبائی بورڈوں کی پابندی کریں گے۔ البتہ یہ معاہدہ یونینسٹ پارٹی کی موجودہ ہیئت پر اثر انداز نہیں ہو گا۔

2- آئندہ عام یا ضمنی انتخابات میں یونیسٹ پارٹی میں شامل تمام گروہ ایک دوسرے کے امیدواروں کی حمایت کریں گے۔

3- مسلم لیگ کے ٹکٹ پر منتخب ہونے والے یا مسلم لیگ کے رکن بننے والے ارکان اسمبلی' اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی تصور ہوں گے اور مرکزی لیگ کی پالیسی کے مطابق کام کریں گے البتہ یونینسٹ پارٹی اپنا نام برقرار رکھے گی۔

4- اس معاہدے کو مد نظر رکھتے ہوئے صوبائی پارلیمانی بورڈ کی تشکیل نو ہو گی۔

یہ معاہدہ جناح سکندر پیکٹ کہلایا جس پر وقتی طور پر خوشی کا اظہار کیا گیا نیز وزیر اعظم بنگال مولوی فضل الحق اور آسام کے وزیر اعظم سر محمد سعد اللہ نے بھی اس اجلاس میں شرکت کی تھی۔ جو مسلم لیگ قیادت پر ملائم سے اعتماد کا اظہار کیا تھا۔ اور سکندر حیات نے اس معاہدے کے تحت مسلم لیگ ارکان سے تعلق قائم کر لیا تھا لیکن دوسری طرف چھوٹو رام گروہ کو اپنے ساتھ رکھنے اور مطمئن کرنے کا کوئی بہانہ نہ تھا۔ چنانچہ اس نے لاہور آتے ہی اس

معاہدے کی مختلف تاویلات کرنی شروع کر دیں اور ان تاویلات کے ذریعے وہ مسلم لیگ ارکان کو بھی دھوکہ دینا چاہتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ فروری 1938ء تک مسلم لیگ کی رکنیت فارم پر دستخط نہ کیے۔ اور یہ جھگڑا پنجاب مسلم لیگ اور یونینسٹ پارٹی کے درمیان چلتا رہا اب سکندر حیات نے پنجاب مسلم لیگ کو نقصان پہنچانے کے لئے ایک اور پینترا بدلا کہ اپنی سرپرستی میں گورنمنٹ کے ٹوڈیوں اور خان بہادروں پر مشتمل ایک مسلم لیگ قائم کر دی۔ اور مسلم لیگ مرکز کو اپنے الحاق کی درخواست دے دی جس کو منظور کر لیا گیا اور پرانی مسلم لیگ کے صدر علامہ اقبال' ملک برکت علی اور غلام رسول خان کی درخواست شمولیت کو مسترد کر دیا گیا جس پر اپیل دائر کر دی گئی۔ 17 اپریل 1938ء کو مسلم لیگ کا کلکتہ میں اجلاس ہوا جس میں یہ کیس پیش ہوا۔ جس میں سمجھوتہ کرا دیا گیا اور ایک مشترکہ آرگنائزنگ کمیٹی تشکیل دی گئی جس کے ممبروں کی تعداد پینتیس مقرر ہوئی جس میں پچیس ارکان سکندر حیات گروپ کے اور دس پہلے گروپ سے لئے گئے۔ سکندر حیات کو صدر مقرر کیا گیا یوں سکندر کا پنجاب مسلم لیگ پر مکمل قبضہ ہو گیا مسلم لیگ کا پرانا خدمت گار گروپ دل شکستہ ہو کر واپس لاہور آ گیا یہ اجلاس ابھی جاری تھا کہ 21 اپریل 1938ء کو علامہ اقبال کا انتقال ہو گیا۔

سکندر حیات نے اپنے منصوبے کے تحت مسلم لیگ کو منظم کرنے کا کوئی کام نہ کیا۔ مسلم لیگ کے پرانے ممبروں نے جب حالات کو بگڑتے دیکھا تو ملک برکت علی نے اپنے گروپ کے ساتھ مسلم لیگ ریڈیکل پارٹی بنا کر ممبر شپ کا کام شروع کر دیا اور قائداعظم کو جملہ حالات سے مطلع کیا تو انہوں نے ہدایت کی کہ معاملہ آل انڈیا مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی کے سامنے پیش کرو چنانچہ 27 اگست کو دہلی اجلاس میں یہ معاملہ پیش ہوا جس پر کمیٹی نے فیصلہ دیا کہ 10 نومبر تک مسلم لیگ پارٹی بورڈ نہ بنایا گیا اور مسلم لیگ کی تنظیم نو نہ کی گئی تو موجودہ بورڈ خود بخود کالعدم قرار پا جائے گا' چنانچہ یہی ہوا اس طرح سکندر حیات کی دھوکہ بازی کی وجہ سے پنجاب میں مسلم لیگ کی رابطہ عوام مہم بہت حد تک ناکام رہی لیکن کانگریسی وزارتوں کے مظالموں کی وجہ سے عوام کانگریس اور یونینسٹوں سے ان کی ہندوانہ تعلقات کی بنا پر متنفر ہو گئے اور مسلم لیگ کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوئے۔

دوسرے صوبوں میں مسلم لیگ کے حق میں کانگریسی وزارتوں نے نہایت اہم کردار ادا

کیا۔ جوں جوں ہندو وزارتوں کے تحت مسلمانوں پر مظالم ہوتے تھے توں توں مسلمان یہ سوچنے پر مجبور ہو رہے تھے کہ ابھی تک انگریز کی ہندوستان میں حکومت ہے۔ اس کے باوجود ہندو منظم طور پر مسلمانوں کی شدھی کر رہے ہیں جب انگریز یہاں سے چلے جائیں گے تو پھر مسلمانوں کا کیا ہو گا۔ اس سوچ اور فکر نے رد عمل کا کام کیا اور مسلمان مسلم لیگ کی حمایت میں ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ یوپی میں جب ضمنی انتخابات ہوئے تو کانگریس کو اپنا نمائندہ کھڑا کرنے کی جرات تک نہ ہوئی۔

قوم پرست قائدین اور کانگریسی علماء جو مسلمانوں کو کانگریس کے حق میں لاتے تھے اور مسلم لیگ کے خلاف پراپیگنڈہ کرتے تھے وہ بھی جب کانگریسی وزارتوں' ہندو غنڈوں کے سامنے مجبور اور بے بس ہو گئے تو مسلمان جان گئے کہ یہ سب کانگریس کے ہاتھوں بکے ہوئے لوگ ہیں۔ یہ صرف اپنے مفادات کا تحفظ کرتے ہیں ان کو عام مسلمانوں سے ذرا برابر ہمدردی نہیں ہے اس بنا پر وہ ان سے بھی متنفر ہو گئے۔

انتخابات اور کانگریسی راج

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات
(اقبال)

گورنمنٹ آف انڈیا 1935ء کو مسلم لیگ اور کانگرس دونوں نے پسند نہیں کیا تھا چونکہ اس سے دونوں کی امیدیں پوری نہ ہوتی تھیں اس کا پہلا حصہ جو مرکز سے متعلق تھا اسے رہنے دیا گیا۔ البتہ دوسرا حصہ جو صوبائی خودمختاری کے متعلق تھا اسے نافذ کر دیا گیا۔ اور اس کے تحت ہندوستان میں انتخابات ہونے قرار پائے۔ مسلمانان ہند اس زمانہ میں انتہائی انتشار اور افراتفری کا شکار تھے جمعیت العلمائے ہند' احرار' سرخپوش' اور قوم پرست مسلمان کانگرس کا ساتھ دے رہے تھے۔ پنجاب میں یونینسٹ سرسکندر کی قیادت میں مسلم لیگ کے خلاف کردار ادا کر رہے تھے۔ ایسی صورت میں انتخابات آ گئے۔ کانگرس نے اپنی انتخابی مہم بڑے جوش و خروش اور روپے کی ریل پیل سے چلائی۔ مسلم لیگ نے پوری کوشش کی۔ اس نے مسلمانوں کے حقوق پر خصوصی توجہ دی۔ مسلمانوں کے شعور کو بیدار کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس نے دیگر مسلم جماعتوں کا تعاون حاصل کرنے کی بڑی کوشش کی لیکن ناکام رہی۔ یہ انتخابات گیارہ صوبوں میں ہوئے۔ کانگرس کو توقع سے زیادہ کامیابی حاصل ہوئی۔ گیارہ صوبوں میں سے چھ میں اس نے واضح اکثریت حاصل کر لی۔ اور دو صوبوں میں دیگر اقلیتوں کو ساتھ ملا کر حکومتیں بنا لیں۔ مسلم لیگ یہ توقع رکھتی تھی کہ پہلے کی طرح انتخابات کے بعد مل جل

حکومتیں بنائی جائیں گی اور ہندو مسلم مل کر قومی تعمیر کے کام کریں گے۔ لیکن انتخابات کی اس واضح کامیابی نے کانگرس کے رویہ کو بدل کے رکھ دیا۔ اس نے مسلم لیگ کے ساتھ مخلوط وزارتیں بنانے سے انکار کر دیا۔

اس نے مسلم لیگ کو ختم کرنے کا تہیہ کر لیا اور مسلم لیگی ممبران کو کہہ دیا گیا کہ اگر وہ حکومت میں شامل ہونا چاہتے ہیں تو پہلے مسلم لیگ سے مستعفی ہوں پھر کانگرس میں شریک ہوں۔ تب ان کو وزارت میں شامل کیا جائے گا۔ کانگرس کے اس رویئے سے اس کے اصلی عزائم بے نقاب ہو گئے۔ جس سے مسلمانوں کو سخت تشویش لاحق ہوئی۔

کانگرس کی قوم پرستی' اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ اور پوری قوم کی نمائندگی کا بھرم تو کھل چکا تھا جمہوریت اور سوراج کے نعرے کی حقیقت بھی اس طرح نمایاں ہو گئی کہ کانگرس نے اپنے تمام منتخب نمائندوں اور وزیروں کو اطلاع دی کہ وہ عوام اور اپنے ووٹروں کے سامنے جوابدہ نہیں ہیں بلکہ کانگرس کے سامنے جوابدہ ہیں۔ کانگرس نے اپنی ایک ہائی کمان قائم کر دی جس میں ابوالکلام آزاد' راجندر پرشاد اور ولبھ بھائی پٹیل شامل تھے۔ کانگرس کی ورکنگ کمیٹی نے اپنے اختیارات اس کمیٹی کو سونپ دیئے۔ ان تینوں حضرات نے ملک کو تین حصوں میں بانٹ دیا۔ بنگال' یوپی' پنجاب اور سرحد ابوالکلام کے حصے میں آئے' بہار' اڑیسہ اور آسام راجندر پرشاد کے اور بمبئی' مدراس اور سی پی اور سندھ پٹیل کے حصے میں آئے۔ گویا ایک ایک آدمی تین تین چار چار صوبوں کا ڈکٹیٹر بن گیا۔ کانگرسی وزارتیں ان کے سامنے جوابدہ تھیں۔ اور ان کے احکام کی پابندیوں سے ہندوستان پر کانگرسی آمریت حکمرانی کرنے لگی۔ اسی غرور اور تمکنت میں نہرو نے کہا تھا "اب ہندوستان میں صرف دو ہی طاقتیں ہیں ایک کانگرس اور دوسری حکومت برطانیہ۔ جس کے جواب میں قائد اعظمؒ نے کہا تھا "نہیں تیسری طاقت مسلم لیگ ہے۔" انہی دنوں یوپی میں پانچ مسلم نشستوں پر ضمنی انتخابات ہونے والے تھے۔ قائد اعظمؒ نے کانگرس کو چیلنج کیا کہ اگر وہ مسلمانوں کی نمائندگی کا دعوی رکھتی ہے تو مسلم لیگ کے مقابلے میں اپنے امیدوار کھڑے کرے۔ کانگرس نے چیلنج قبول کر لیا۔ چنانچہ اس نے کانگرسی علماء کو مسلم لیگ کے خلاف کھڑا کیا۔ اپنا پورا زور' سرمایہ اور ذرائع استعمال کئے اس کے باوجود امیدوار ہار گئے۔ اور مسلمانوں نے کانگرس کے دعوی نمائندگی کو جھوٹا ثابت کر دیا۔

کانگرسی وزارتوں نے خوفناک قسم کا خالص ہندو راج قائم کرنے کے لئے عملی اقدامات شروع کر دیئے۔ متعصب ہندو لیڈروں کی طرف سے وقتاً فوقتاً جو نعرے بلند کئے جاتے تھے کہ ہندوستان صرف ہندوؤں کے لئے ہے اب اسے سچ کر دکھایا جانے لگا۔ اس ضمن میں کانگرس نے سیاسی، قانونی، اقتصادی، تہذیبی، لسانی، مذہبی اور تعلیمی غرضیکہ ہر قسم کا پروگرام تیزی سے نافذ کرنا شروع کر دیا۔ گویا کہ وہ اس کے لئے بہت پہلے سے منصوبہ بنائے ہوئے تھے۔ چنانچہ مسلم لیگ نے اکتوبر 1937ء میں لکھنؤ کے اجلاس میں ایک قرارداد کے ذریعے کانگرسی صوبوں میں "بندے ماترم" جیسے مسلم دشمن اور رسوائے زمانہ گیت کو قومی گیت کا درجہ دینے کے خلاف احتجاج کیا تھا۔

واردھا سکیم

کانگرس نے اپنے کانگرسی صوبوں میں جو تعلیمی پالیسی رائج کی وہ واردھا سکیم اور ودھیا مندر سکیم کے نام سے مشہور ہیں۔ واردھا سکیم گاندھی کی قیادت میں تیار کی گئی۔ اس کے تحت طے پایا کہ سات سے چودہ سال تک کی عمر کے بچوں کو لازمی جبری تعلیم دی جائے گی۔ گویا مسلم و غیر مسلم کوئی بھی گھرانہ اپنے آپ کو اس طوفان سے نہ بچا سکے گا۔ اس سکیم کے تحت ہندوستان کی پوری آبادی کو ایک قوم فرض کر لیا گیا۔ اور وہ قوم صرف ہندو تھی۔ اس نصاب میں اس قسم کے فقرے عام تھے۔

"مہاتما گاندھی نے اس کا بیڑا اٹھایا کہ تعلیم کی ایسی راہ نکالیں گے جو ہندوستانیوں کی طبیعت کے مناسب ہو۔ اور جس سے ساری قوم کی تعلیم کا کام کم سے کم وقت میں چل نکلے۔" اس کے ذریعے بچے کے دل میں وطن کی محبت ہو۔ وہ ہندوستان کے پچھلے زمانے کی عزت کرے اور آنے والے زمانے کے بارے میں عقیدہ رکھے کہ یہ ایک ایسا سماج ہو گا جس کی نیو مل کر کام کرنے، محبت اور سچائی پر رکھی جائے گی۔ "سب کے دل میں ایک دوسرے کے مذہب کی اور دنیا کے سب مذہبوں کی عزت پیدا ہو جائیگی...... دنیا کے تمام مذہبوں کے اصول بتا کر یہ ثابت کیا جائے کہ خاص باتوں میں سب مذہب ایک ہیں۔"

اس تعلیم کے عام ہونے سے اسلام کو سراسر نقصان تھا چونکہ اسلام وحدانیت کا قائل

ہے جب کہ دوسرے مذاہب شرک اور انسانی خیالات وافکار کی آمیزش ہے۔ اسی بنا پر اقبال نے کہا ہے۔

باطل دوئی پسند ہے حق لاشریک ہے
مصلحت میان حق وباطل نہ کر قبول

باطل مذاہب ومسالک یا افکار ونظریات میں اگر اور افکار ونظریات داخل کر دیئے جائیں تو ان کا اتنا بڑا نقصان نہیں ہوتا جتنا کہ حق میں باطل کو ملانے سے نقصان ہوتا ہے۔ فرض کیجئے ہندومت میں بیس بت ہیں (جو حقیقت میں بے شمار ہیں) اور اسلام کا صرف ایک خدا ہے ہندو آپ سے کہتے ہیں کہ تم ہمارے بتوں کو مان لو ہم تمہارے خدا کو مان لیں گے اس کا فائدہ کس کو ہوا۔ ہندو کو چونکہ اس کے بتوں میں ایک بت کا اضافہ ہو گیا لیکن تم توحید پرست سے بت پرست ہو گئے۔ یہی بات تو کفار رسول کریمؐ سے کہا کرتے تھے کہ تم ہمارے بتوں کو برا بھلا نہ کہو ہم تمہارے اللہ کو بھی مان لیں گے۔ دراصل یہ بھی ہندوؤں کو ایک چال تھی۔ اس طرح وہ مسلمان بچوں کو وطن پرستی کی بنیاد پر ہندو بنانا چاہتے تھے ان میں ہندوستان سے محبت کا جذبہ پیدا کرنا مقصود تھا جو درحقیقت ہندو قومیت سے محبت کے مترادف تھا۔

اس تعلیمی نظریے کو عملی شکل وصورت دینے والے ڈاکٹر ذاکر حسین تھے جو بعد میں بھارت کے صدر بنے۔ اب دیکھیے واردھا سکیم کے مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے کیا کیا اقدامات کیے گئے۔ مسلمانوں کے پیغمبروں' مذہبی پیشواؤں اور دیگر مشاہیر کو عام لوگوں کی صف میں کھڑا کر دیا گیا۔ بلکہ بعض جگہوں پر وہ گویوں کے ساتھ بٹھائے گئے اس طرح مسلمان بچوں کے دلوں میں جو پیغمبروں کا تقدس ہے وہ پامال ہو جائے گا ان کی عزت وتوقیر ختم ہو جائے گی ناموس رسولؐ پر مرمٹنے کا جذبہ ماند پڑ جائے گا۔ دین اسلام کے عظیم الشان ستون خود بخود گر جائیں گے ان کے دلوں میں ان کی جگہ پیغمبر خدا کی بجائے ایک مصلح کی رہ جائے گی اور اسلامی تہذیب وتمدن کو اس رنگ میں پیش کیا گیا جو اکبر' داراشکوہ اور گورونانک کے روپ میں ظاہر ہوئی۔ اسلامی تصور کو ویدانت کا رنگ دے کر مسلمانوں میں ہندو عقائد مسئلہ کرم' مسئلہ تناسخ اور حلول کے نظریئے کو عروج وفروغ دیا گیا ان کوششوں سے مسلمان بچوں میں کیبر پنتھی

اور برہمو سماجی شعور تو پیدا ہو سکتا ہے مگر اسلامی شعور ہر گز پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔

ودھیامندر سکیم

سی پی کے وزیر اعظم پنڈت شکلا جو مالوہ جی کے خاص چیلے تھے انہوں نے ودھیامندر سکیم جاری کی اس کا ابتدائی تخیل شردھانند کی گردکل سکیم پر مبنی تھا۔ اس سکیم کی تیاری کا کام 30 جولائی 1937ء سے شروع ہوا اور دسمبر کو کانگریس اسمبلی پارٹی نے اسے قبول کر لیا۔ مگر عام مسلمانوں کے سامنے یہ مارچ 1938ء میں آئی جب اس کے لئے اسمبلی سے بجٹ منظور کروایا گیا اسمبلی کے چودہ ارکان میں سے تیرہ نے اس کے خلاف ووٹ دیے اور چودھویں مسٹر شریف' وزیر ہونے کی حیثیت سے غیر جانبدار رہے۔ کئی ایک ہندو لیڈروں خصوصاً" ڈاکٹر کھارے نے بھی اس کے خلاف ووٹ دیا اور اس سکیم کو مسلمانوں کے لئے تباہ کن قرار دیا۔ سی پی سے کوئی بھی شخص حکومت کو اس سکیم کے تحت نصاب مرتب کرنے کو نہ ملا باہر سے ڈاکٹر ذاکر حسین اور ڈاکٹر اشرف کی خدمات مستعار لی گئیں اس سکیم کے تحت مدرسے کا نام ہی مندر تجویز ہوا چونکہ مدرسہ سے مسلم ذہن کی بو آتی ہے۔ حالانکہ صاف ظاہر ہے کہ مندر سے مراد ہندوؤں کی عبادت گاہ ہے۔ لیکن ہندو اکثریت یہ کرشمہ بھی کرنے پر قادر تھی اس سکیم کا مقصد بھی یہی بتایا گیا کہ بچوں میں متحدہ قومیت کا تصور پیدا کیا جائے اس سکیم کے تحت بچے گاندھی کی مورتی کے سامنے پوجاپاٹ کرتے اور ہندوانہ مذہبی گیت گاتے۔ بندے ماترم کا گانا باقاعدہ گایا جاتا۔ لباس میں دھوتی شامل ہوتی اس کے باوجود یہ باور کرانے کی کوشش کی گئی کہ اس میں سے مذہبی تعلیم خارج ہے۔ صوبہ بمبئی میں حکم دیا گیا کہ پرائمری سکولوں میں اس سکیم کے تحت شائع ہونی والی کتابیں پڑھائی جائیں۔ اس کے برعکس صوبہ سرحد میں خان صاحب اور خان عبدالغفار خان کی کانگریسی وزارت نے انجمن حمایت اسلام 'لاہور' کی شائع کردہ کتب پڑھائے جانے پر پابندی عائد کر دی کہ ان میں مذہبی باتیں پائی جاتی ہیں۔

یہ کتابیں اور سنسکرت آمیز اردو میں لکھی گئیں دوسرے الفاظ میں درپردہ ہندی کو اردو کی جگہ دینے کی سازش کی گئی۔ شروع میں گاندھی کہا کرتا تھا کہ اردو اور ہندی ایک ہی زبان ہندوستانی ہیں جنہیں فارسی اور دیوناگری میں لکھا جا سکتا ہے چنانچہ انہوں نے خود بھی فارسی

رسم الخط لکھنا سیکھا۔ لیکن مہاتما جی نے پینترہ بدلا اور کہنے لگے چونکہ اردو قرآنی حروف میں لکھی جاتی ہے اس لئے یہ مسلمانوں کی زبان ہے اور صرف ہندی ہی ہند کی زبان ہو سکتی ہے۔ گویا یہ دونوں سکیمیں مسلمانوں کی تہذیبی شدھی کی سکیمیں تھیں۔ لہٰذا ان سکیموں کے خلاف مسلمانوں نے زبردست احتجاج کیا۔ کمال یار جنگ رپورٹ میں یہاں تک کہہ دیا گیا "ان کتابوں کے دس سالہ مطالعے کے بعد مسلمان بچے شاید اپنے پیغمبرؐ کا اسم مبارک بھی نہ جانتے ہوں گے"۔ کانگریس اور اس کی پریس نے ان الزامات کی پرزور تردید کی یہاں تک کہ کانگریس کے چیلے ابوالکلام آزاد اپنی کتاب آزادی ہند میں صاف لکھتے ہیں کہ پیرپور رپورٹ میں مندرجہ الزامات بالکل بے بنیاد تھے۔ جب کہ اس وقت کے یوپی کے گورنر سر ہیری ہیگ وزیر ہند لارڈ زٹلینڈ' برطانوی پارلیمنٹ کے مشہور ٹوری رکن کوشن اور ایک انگریز صحافی پیٹرک لیسی نے مسلمانوں کے ان الزامات کی پوری پوری توثیق کی۔ تاہم نہرو کے جواب میں جب قائد اعظمؒ نے مطالبہ کیا کہ الزامات کی تحقیقات کے لئے ججوں پر مشتمل ایک رائل کمیشن مقرر کیا جائے جس کا صدر پریوی کونسل کا کوئی لاء لارڈ ہو۔ مگر وائسرائے نے اس مطالبے کو منظور نہ کیا کیونکہ اندرون خانہ وہ خود اس میں شریک تھے اور انہوں نے کانگریسی وزارتیں بننے سے پہلے قول دے رکھا تھا کہ گورنر کابینہ کے معاملات میں کوئی مداخلت نہ کریں گے۔ گویا مسلمانوں کے معاملہ میں انگریز اور ہندو مل گئے تھے اور اس ضمن میں انگریزوں نے اپنے بنائے ہوئے قانون کی بھی پرواہ نہ کی اور یہ قانون 1935ء مسلمانوں کے لئے دھوکہ اور فریب ثابت ہوا۔

کانگریسی راج کے خلاف رپورٹیں

کانگریسی مظالم کی جب کوئی انتہا نہ رہی تو ہندوستان کے کونے کونے سے ان مظالم کی شکایات آنے لگیں تو مسلم لیگ نے صحیح صورت حال کا جائزہ لینے کے لئے درج ذیل کمیٹیاں مقرر کیں جنہوں نے بڑے حیرت انگیز انکشافات کیے۔

پیرپور رپورٹ

یہ کمیٹی 20 مارچ 1938ء کو یعنی کانگریسی وزارتوں کے قیام کے ساڑھے آٹھ ماہ بعد راجہ

سید محمد مہدی آف پیرپور کی صدارت میں قائم کی گئی اس نے 15 نومبر 1938ء کو مسلم لیگ ہائی کمان کو اپنی رپورٹ پیش کی اس کا دائرہ کار بجز سرحد کے تمام کانگرسی صوبے تھے۔ اس میں کانگرسی راج کے مسلمانوں پر مظالم اور ان کی تفصیلات بیان ہوئی ہیں۔ یہ کافی تفصیلی رپورٹ ہے۔ یہ تین حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں فرقہ وارانہ مسئلہ کی نوعیت کا جائزہ لیا گیا ہے۔ دوسرے میں ہندو مسلم تصادم کے اسباب کا تجزیہ کیا گیا ہے اور تیسرے حصے میں ان مظالم کی ایک جھلک دکھائی گئی ہے جو کانگرسی وزارتیں مسلمانوں اور بالخصوص مسلم لیگ کے کارکنوں کے ساتھ روا رکھے ہوئے تھیں۔ اس کا مختصر جائزہ درج ذیل ہے:۔

برصغیر میں فرقہ وارانہ مسئلہ کی نوعیت

رپورٹ کے مصنفین نے پہلے حصے میں بہت خوبصورتی سے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ متحدہ ہندوستان میں اقلیتوں کے مسئلہ کی نوعیت اس سے بالکل مختلف ہے جو یورپی ممالک اور برطانیہ میں ہے۔

برطانیہ میں اکثریتی اور اقلیتی جماعتیں بدلتی رہتی ہیں ان کے بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ ان کے رنگ ڈھنگ اور طاقت میں فرق پڑتا رہتا ہے آج برطانیہ میں قومی حکومت برسراقتدار ہے تاکہ کنزرویٹو' لبرل اور لیبر پارٹیوں کو حکومت چلانے کے یکساں مواقع حاصل ہیں اس کے برعکس یہاں متحدہ ہندوستان میں ہندومت اکثریت میں اور دوسری قومیں اقلیت کی حیثیت رکھتی ہیں اس لئے یہاں اکثریتی پارٹی کے لئے یہ بہت آسان ہے کہ وہ فرقہ وارانہ لیبل لگا کر قوم پرستی کے پردے میں خالص فرقہ وارانہ پالیسی اختیار کئے رکھے۔

اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے کمیٹی نے اس امر کی نشاندہی کی کہ جس ملک میں ذات پات کا نظام اتنا سخت ہو کہ جتنا ہندوستان میں ہے جہاں ایک انسان کے محض چھو جانے سے دوسرا ناپاک ہو جاتا ہے جہاں ایک طبقہ کے بارے میں سمجھا جاتا ہے کہ وہ دوبارہ پیدا ہونے کی وجہ سے دوسروں سے بلند تر ہے جہاں ایک طبقہ کو مستقل طور پر گندگی صاف کرنے کا کام دیا گیا ہو وہاں متحدہ قومیت کا تصور نہیں کیا جا سکتا ہے

کانگرس کا کردار

پیرپور رپورٹ میں ملک کے سماجی ومعاشی حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے کانگرس کے صحیح کردار کی نشاندہی اس طرح کی گئی تھی کہ اس ملک میں پیشہ کا انتخاب آزاد نہیں بلکہ بعض پیشے خاص نسلوں کے لئے مخصوص ہیں صنعت وتجارت کے میدان میں بھی ذاتی قابلیت کی بجائے قومیت ومذہب کی بنیاد پر کامیابی حاصل ہوتی کیونکہ ایک آدمی کی ذات اور اس کے پیشے کا آپس میں گہرا تعلق ہے تجارت پر ایک خاص ذات چھائی ہوئی ہے۔ اکثریتی جماعت کانگریس بجٹ بناتے ہوئے اسی جماعت کے مفادات کا تحفظ کرتی ہے ٹیکس لگاتے ہوئے بظاہر معاشی و معاشرتی حالت ہوتی ہے لیکن دراصل بات پیش نظر رکھی جاتی ہے کہ کون سا ٹیکس ہندوؤں کو متاثر کرے گا اور کون سا مسلمانوں کو۔ خاص معاشی تنازعات کو حل کرتے ہوئے بھی ہندو اکثریت اپنی فرقہ وارانہ ذہنیت چھپا نہیں سکتی۔ کمیٹی نے کانگرس کے اس طرز عمل کی وضاحت کے لئے باقاعدہ مثالیں دیں کہ کس طرح ہزاری باغ کے ایک گاؤں میں ایک مسلم زمیندار اور ایک کانگرس کارکن کے درمیان جھگڑے پر پوری کانگرس حرکت میں آگئی۔ اس کے برعکس بہار میں ایک گاؤں سلوان ضلع سرن میں جب مسلمانوں کے گھروں کو نذر آتش کردیا گیا تو سوشلسٹ نظریات کا پرچار کرنے والی کانگرس کو ان غریبوں کے حال پر کوئی رحم نہ آیا اور جب ضلع ساگورا کے سینکڑوں مزدور اس وجہ سے ملازمت سے علیحدہ کردیئے گئے کہ انہوں نے کانگرس امیدوار کے خلاف ووٹ دیئے تھے تو سوشلسٹ کانگرس نے ان مزدوروں کی اس وجہ سے حمایت نہ کی کہ وہ مسلمان تھے۔

چنانچہ کمیٹی نے واضح کیا کہ کم از کم مسلمانوں کی حد تک اس بات میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ شہری آزادی کا ڈھنڈورہ پیٹنے کے باوجود مسلمانوں کو اس سے محروم رکھا جارہا ہے۔

کانگرس اور مہاسبھا کی ملی بھگت

پیرپور رپورٹ نے کانگرس اور مہاسبھا کے درمیان پائی جانے والی فکری ہم آہنگی اور مزاحمت کو بھی بے نقاب کیا۔ اس سلسلے میں اس بات کی نشان دہی کی گئی کہ دستوری طور پر ہندو مہاسبھا کا رکن کانگرس کا بھی رکن بن سکتا ہے لیکن مسلم لیگ کا رکن نہیں بن سکتا۔ نیز

انتخابات میں بعض محاسبھا امیدواروں کو کانگرس کے بااثر لوگوں کی حمایت حاصل تھی۔ کمیٹی نے نشان دہی کی کہ جب محاسبھا کا صدر ڈاکٹر کھارے بہار کے دورے پر گیا تو کانگرس وزراء اس کے استقبال کے لئے موجود تھے اس کے ساتھ مختلف اجلاسوں میں شریک ہوتے رہے اور جب ڈاکٹر کھارے سے اس بارے میں سوال کیا گیا تو انہوں نے کہا کہ کانگرس وزراء اپنی ذاتی حیثیت میں مجھ سے ملنے آئے تھے۔ اس سے قائداعظمؒ کی اس رائے کا ثبوت ملتا ہے کہ ہندو قوم نے اپنا نقطہ نظر واضح کر دیا ہے کہ ہندوستان ہندوؤں کے لئے ہے۔ کانگرس اس کام کو نیشنلزم کے حسین لفظ میں لپیٹ کر پیش کر دی ہے۔ اور مہاسبھا الفاظ کے چکر میں نہیں پڑتی۔ پیرپور رپورٹ نے کانگرس کی جنرل پالیسی کا تفصیلی تجزیہ کیا اور کانگرس حکومتوں کے خلاف مسلمانوں کی شکایات کو مرتب کر کے پیش کیا' اس رپورٹ کی روشنی میں کانگرس وزارتوں کے طرز عمل کا ایک جائزہ ذیل میں دیا جا رہا ہے۔

مسلم لیگ کو ختم کرنے کی کوشش

کانگرس کے اکابرین اس بات کو سمجھتے تھے کہ وہ جس طرح ہندوستانی قومیت کو تشکیل کرنا چاہتے ہیں اس کا تقاضہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو عملاً" محمڈن ہندو بنا کر رکھا جائے اور ان کے تہذیب و ثقافت' مذہب' معیشت اور اثاثی تصورات قومیت کو اس طرح شدھی کیا جائے کہ ان کے اس مقصد کے پوری طرح سے ہندوستانی یعنی ہندو بن چکے ہیں۔ انہیں اس کا پورا احساس تھا کہ ان کے اس مقصد کے پورے ہونے میں سب سے بڑی رکاوٹ مسلم لیگ ہے۔ اس وجہ سے انہوں نے مسلم لیگ پر ہر طرف سے حملہ کر دیا۔ آغاز پنڈت جواہر لال نہرو کی رابطہ عوام مہم سے ہوا جس میں مسلم لیگ اور قائداعظمؒ کو رجعت پسند قرار دیا گیا اور اقتصادی مسائل کو اصل عوامی مسائل قرار دے کر کانگرس میں شمولیت کو اس کا واحد راستہ بتایا گیا۔ اور وزارتوں کی تشکیل کا مرحلہ آیا تو مسلم لیگی ارکان کو مسلم لیگ پارلیمانی بورڈ توڑ کر کانگرس میں جذب ہونے کی شرط پر وزارتیں پیش کی گئیں۔ حالانکہ بعض صوبوں میں انتخابات کے دوران کانگرس اور لیگی امیدواروں نے ایک دوسرے کی حمایت کی تھی اور یہ بات تقریباً" طے تھی کہ انتخابات کے بعد کولیشن وزارت قائم کی جائے گی مزید کانگرس نے

مسلمانوں کے حقیقی نمائندوں کو وزارتوں میں شامل کرنے کے بعد مسلم لیگی ارکان کو وزارتوں کا لالچ دے کر توڑنا شروع کر دیا مثال کے طور پر یوپی میں حافظ محمد ابراہیم' مدراس میں سیٹھ یعقوب حسن احمد' ڈاکٹر سید محمد اور محمد یوسف شریف کو لیگ سے توڑ کر کانگرس میں شامل کیا گیا یہ سب کچھ گویا اس بات کا اعلان تھا کہ آئندہ کانگرس کے علاوہ ہندوستان میں کسی اور جماعت کو زندہ رہنے کا حق نہ ہوگا۔ اور اگر مسلمان اس ملک میں زندگی کا سانس لینا چاہتے ہیں تو انہیں جداگانہ قومی تنظیم ختم کر کے کانگرس میں جذب ہو جانا پڑے گا۔ مسلم لیگ کو جب اس طریقے سے بھی ختم نہ کیا جا سکا تو آزاد مسلم لیگ قائم کر کے مسلمانوں کے اتحاد کو اندر سے سبوتاژ کرنے کی کوشش کی گئی اور اس پورے عرصے میں مسلم لیگ کے خلاف اتنا بھرپور پروپیگنڈہ کیا گیا کہ اگر ہندوؤں نے اپنے تعصب کے مظاہرے سے مسلمانوں کے دلوں میں شدید نفرت کے جذبات نہ پیدا کر دیئے ہوتے تو اس بات کا امکان موجود ہے کہ وہ کانگرس پروپیگنڈہ سے متاثر ہو جاتے ہیں۔

انتظامیہ کے کام میں مداخلت

کسی بھی ملک میں اقلیتوں کے حقوق اس وقت تک محفوظ نہیں سمجھے جا سکتے جب تک انتظامیہ غیر جانب داری سے انتظام نہ چلائے۔ کانگرس وزارتوں کی تشکیل کے بعد کانگرس نے انتظامیہ کو اپنی پارٹی کا آلۂ کار بنانے کی کوشش کی۔ کانگرس کے قائدین نے اپنے کارکنوں میں یہ احساس ابھارا کہ وہ حکمرانوں میں روا نہیں ہر سطح پر انتظامی مشینری کی حمایت حاصل ہوگی۔ چنانچہ یوپی کے چیف سیکریٹری نے ضلعی حکام کو یہ ہدایت بھی بھیجی کہ وہ تمام اہم اقدامات سے پہلے کانگرس کمیٹیوں سے مشورہ کریں۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ ہندوؤں نے جارحیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے فرقہ وارانہ فسادات شروع کر دیئے گورنر حضرات جن کو 1935ء کے ایکٹ کی روح سے اقلیتوں کے تحفظ کا فریضہ سونپا گیا تھا۔ کانگرس کی جارحانہ پالیسی کے باوجود اس وجہ سے خاموش رہتے تھے کہ وہ کانگرس وزارتوں کے استعفاء سے پیدا ہونے والے دستوری تعطل سے بچنا چاہتے تھے نیز گاندھی جی نے وزارتوں کی تشکیل سے پہلے وائسرائے سے یہ بات منوائی تھی کہ گورنر اقلیتوں کے بارے میں خصوصی اختیارات استعمال نہیں کریں گے۔

کانگرس کی انتظامیہ کے بارے میں دو حکمت عملی تھیں۔ اس کا اندازہ اس سے بھی ہو سکتا ہے کہ بعض معاملات میں کانگرس کی ضلعی کمیٹیاں براہ راست احکام صادر کرتی تھیں' بعض جگہوں پر کانگرس نے اپنے پولیس سٹیشن الگ قائم کر لئے تھے اور وہاں جرائم کی تحقیقات کی جاتی تھی۔ یوپی کی کانگرس حکومت نے اپنا شعبہ فوج الگ قائم کیا تھا۔ جس کو پانچ لاکھ اشخاص پر مشتمل ایک فوج کو فوجی تربیت دینے کی ہدایت کی گئی تھی۔ اس فوج کے لئے افسران کی تربیت کا انتظام بھی کر دیا گیا تھا اور ان تربیتی کیمپوں میں یونیفارم میں ملبوس فوجی پریڈ کرتے نظر آتے تھے ان تمام سرگرمیوں کو مسلمان بیک وقت تشویش کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اور ایک عام آدمی بھی یہ تاثر لئے بغیر نہ رہ سکتا تھا کہ کانگرس نے ایک متوازی حکومت قائم کر لی ہے۔

عدلیہ پر اثر انداز ہونے کی کوشش

کانگرس حکومت نے اپنی حدود سے تجاوز کرتے ہوئے صرف انتظامیہ ہی کے کام میں مداخلت نہ کی بلکہ عدلیہ بھی اس کے ہاتھ سے محفوظ نہ رہی۔ چنانچہ اوودھ کی چیف کورٹ کے ججوں نے اپنے فیصلے میں یہ ریمارکس دیئے کہ حکومت نے اس کے ایک فریق کی جو ایک مقامی کانگرس کمیٹی کا صدر ہے ناجائز طرفداری کی ہے الہ آبادہائی کورٹ نے ایک مقامی کانگرس ایم ایل اے ڈاکٹر مکرجی کے مقدمہ کا فیصلہ سناتے ہوئے لکھا کہ ہم سب جانتے ہیں اور حق بجانب ہیں گذشتہ مہینے میں مختلف عدالتوں کو بااثر شخصیات کے مختلف مقدمات میں کسی نہ کسی فریق کے حق میں خطوط ملے ہیں ان میں سے ایک خط میں مجسٹریٹ کو تاکید کی گئی تھی کہ عدالت میں کانگرس کی جانبداری کا مظاہر کیا گیا اس کی تفصیل آگے آئے گی جس سے یہ بات واضح ہو جائے گی کہ قومی حمایت حاصل ہونے کا دعوی کرنے والی کانگرس کس طرح ہندو راج قائم کر رہی تھی۔

بندے ماترم

کانگرس نے برسراقتدار آنے کے بعد بندے ماترم کو قومی ترانہ قرار دیا اس ترانے کا پس منظر یہ تھا کہ 82-1881ء میں ایک بنگالی ہندو بنکم ناتھ چیٹرجی نے ایک ناول انند متھ لکھا جس

کے پیر بھاوانند نے یہ گیت گایا ہے۔ اس ناول کا ہیرو مسلم حکومت کے خلاف ایک بغاوت کا منصوبہ تیار کرتا ہے۔ اسے سڑک پر ایک اور شخص مہندر ملتا ہے جس کی بیوی اور لڑکی کو اس نے مسلمانوں سے بچایا تھا اور اس کے سامنے یہ بھی بندے ماترم گاتا ہے۔ اور اسے اپنی فوج میں بھرتی ہونے کے لئے کہتا ہے۔ مہندر اس کا مطلوب حلف اٹھانے سے انکار کرتا ہے تو وہ کس کے سامنے بندے ماترم پھر گاتا ہے اور ماتا کو آزاد کرانے کے لئے بغاوت پر آمادہ کرنے کی کوشش کرتا ہے مہندر اسے مسلمانوں کی طاقت و شجاعت سے ڈراتا ہے تو وہ مسلمانوں کو بزدل قرار دیتا ہے اس کے بعد اسے ایک مخصوص مندر میں لے جاتا ہے جہاں اسے وشنو کی زیارت کرواتا ہے جس کے دائیں طرف لکشمی دیوی' بائیں طرف سراسوتی دیوی اور گود میں ایک خوبصورت بت ہوتا ہے۔ جس کو وہ ماتائے بھارت قرار دیتا ہے اور اسے بندے ماترم یعنی ہم تیرے پجاری ہیں۔ ماتا کہنے کی ترغیب دیتا ہے پھر وہ مہندر کو مندر کے ایک اور حصے میں لے جاتا ہے اسے وہاں ایک شاندار جگت دھرتی کی زیارت کرواتا ہے یہ کہتا کہ ماتا بھارت پہلے اس حالت میں تھی پھر مندر کے ایک تیسرے حصے میں لے جاتا ہے جہاں کالی دیوی کی زیارت کرواتا ہے جو نہایت بد صورت اور بھدی ہے۔ وہ مہندر کو کہتا ہے کہ مسلمانوں کی حکومت کے بعد ماتا کی یہ پوزیشن ہو گئی ہے۔ اس کے بعد اسے اپنے مقدس اور بلند ذات کے تحفظ کے لئے مسلمانوں کے خلاف لڑنے پر اکساتا ہے چنانچہ مہندر اس کی باغی فوج میں بھرتی ہو جاتا ہے جو مسلمانوں کے دیہات پر چھاپے مارتی ہے اور انہیں بے دردی سے قتل کرتی ہے اور بالاخر ان کی حکومت ختم کر دیتی ہے۔ اور وہاں انگریز کی حکومت قائم ہوتی ہے جس کے بارے میں ایک دہد تھاوانند کو سمجھاتا ہے کہ پہلے یہ حکومت کریں گے پھر ہندوؤں کی باری آئے گی اور یہ انگریز ہندو کے دوست ہیں اس پورے ناول میں بندے ماترم بار بار گایا جاتا ہے اور اس گیت میں مسلم حکومت ختم کرنے کے نعرے بار بار لگائے جاتے ہیں نیز مسلمان حکمرانوں کو ڈاکو اور لٹیرا بنا کر دکھایا جاتا ہے اور اس کے ایک ایک بول سے مسلم دشمنی ٹپک رہی ہے کانگرس نے اس کو تمام سرکاری و غیر سرکاری تقریبات میں بجانے کا فیصلہ کیا حتی کہ اسمبلی کے اجلاس تک میں یہ ترانہ سنایا جاتا ہے۔ قائداعظم محمد علی جناح نے اس پر اعتراض کیا کہ پنڈت نہرو نے لکھا تیس سال سے بندے ماترم کا گیت ہماری قومی جدوجہد سے وابستہ چلا

آرہا ہے اور اس کے ساتھ بہت سی یادیں اور قربانیاں پیوست ہو رہی ہیں مقبول عام گیت فرمائش کر کے لکھوائے جاتے ہیں۔ نہ کہ لوگوں پہ خارجی دباؤ سے مسلط کئے جاتے ہیں یہ خود بخود جذبات کی دنیا میں جنم لیتے ہیں گویا ہندوؤں کے جذبات کی دنیا میں جنم لینے کی وجہ سے اب یہ قومی ترانہ بن چکا تھا۔ یہ ترانہ ان سکولوں میں بھی گایا جاتا جہاں مسلمان طلباء نے اس بات سے تنگ آکر ہڑتال کر دی تھی۔

پیرپور رپورٹ میں واضح طور پر کہا گیا تھا کہ کسی سیاسی پارٹی کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اپنے ترانے کو قومی ترانہ قرار دے کر تمام قوموں پر مسلط کر دے۔

ترنگا جھنڈا

کانگرس نے اپنا ترنگا جھنڈا تمام پبلک عمارتوں پر لہرایا حالانکہ پارٹی جھنڈے کو سرکاری عمارتوں پر لہرانے کا کسی کو حق نہ تھا۔ مسلم لیگ کا اپنا پرچم تھا جس کو ایسے اداروں کی عمارت پر جن میں مسلم اکثریت تھی لہرایا جاتا تو ہندو مسلم فساد ہو جاتا تھا۔ جب قائد اعظمؒ نے ہندوؤں کی توجہ اس طرف مبذول کرائی تو انہوں نے اس کے رنگوں کو آرٹ کے نقطہ نظر سے خوبصورت قرار دیا۔ اور برعکس مسلم لیگ کے جھنڈے کو فرقہ وارانہ قرار دیا۔

مسلمانوں کی مذہبی رسوم و عبادات میں مداخلت

کانگرس حکومتوں نے مسلمانوں کی مذہبی رسوم میں بھی رکاوٹیں ڈالنی شروع کر دی تھیں۔ مثلاً" محرم اور عید کے مواقع پر دفعہ 144 کا نفاذ اور بکر عید پر گائے کے ذبح پر پابندی لگا دی جاتی۔ یوپی کے ایک قصبہ زاہد آباد کے مسلمانوں نے باقاعدہ عدالت سے ڈگری لی کہ انہیں گائے کے عین ذبح کی اجازت ہے اس کے باوجود انہیں قربانی کی اجازت نہ دی گئی۔ مسلمانوں کی مساجد کے سامنے عین نماز کے وقت ڈھول پیٹے جاتے' باجے بجائے جاتے۔ بعض جگہوں پر اذان کی بندش کر دی گئی بعض مساجد پر قبضہ کر لیا گیا۔ ایسی تمام حرکات کو برسراقتدار طبقہ کی حمایت حاصل ہوئی۔

ذبیحہ گاؤ کا مسئلہ

یہ بات تسلیم شدہ تھی کہ مسلمانوں کو گائے کو ذبح کرنے کا حق حاصل ہے پنڈت نہرو نے قائد اعظمؒ کے نام ایک خط میں اس کی تردید کی کہ کانگرس اس ذبیحہ گاؤ پر پابندی لگانے کے لئے کوئی قانون بنانے کا ارادہ رکھتی ہے لیکن گاندھی جی نے کانگرس کے سالانہ اجلاس ہری پورہ میں فرمایا کہ چرخہ چلانا اور گائے کی حفاظت ایک ہی پالیسی قرار پاگیا۔ اس موقع پر سردار پٹیل نے نمائش گائے بھی منعقد کی۔ جس میں خطاب کرتے ہوئے مہاتما گاندھی نے گائے کی حفاظت کے معاشی فوائد بھی گنوائے اور قدیم راجاؤں کے گائے پالنے کا حوالہ دیتے ہوئے گائے کی حفاظت کی اہمیت سمجھنے پر زور دیا۔ عملاً "یہ صورت حال تھی کہ گائے کی ذبح کی اطلاع پاتے ہیں ہندو حملہ کر دیتے۔ مردوں' بچوں اور عورتوں سبھی کو قتل کر دیتے اور سامان لوٹ لیتے۔ بعض اوقات محلوں کے محلے نذر آتش کر دیئے جاتے اور جب انتظامیہ وہاں پہنچتی تو مصالحت کروادیتی جس میں مسلمانوں کو معافی مانگنے اور آئندہ کے لئے گائے نہ ذبح کرنے کی یقین دہانی کرانے کے لئے کہا جاتا۔

مورتی پوجا

مہاتما گاندھی کی مورتی کی پوجا اس زمانے میں سکولوں میں کروائی جاتی اور بچوں کو پوجا پاٹ پر مجبور کیا جاتا تھا۔ پیرپور رپورٹ میں سی پی کے ایک قصبہ کا واقعہ درج ہے جہاں میونسپل سکولوں میں گاندھی کے یوم ولادت پر ایک خاص تقریب منائی گئی تو بچوں کے ساتھ ان کے والدین کو بھی وہاں حاضر ہونے کا حکم دیا گیا۔ اور وہ بھی گاندھی کی مورتی پوجا میں شامل کیے گئے۔

ہندو مسلم فسادات

1937ء میں کانگرسی وزارتیں قائم ہوتے ہی ہندو مسلم فسادات یکایک بہت بڑھ گئے تھے بذات خود یہ ایک قابل توجہ امر ہے کہ ایسا کیوں ہوا۔

کانگرسی وزراء نے یقیناً" مہاسبھائیوں کی حوصلہ افزائی کی' ان کے مقدمات گول کر دیئے گئے انہیں پولیس کی سرپرستی دلاوائی گئی ان کے حق میں جھوٹی گواہیوں کا بندوبست کیا گیا۔

مجسٹریٹوں اور ججوں کے پاس سفارش کی گئی۔ ناگپور ہائی کورٹ نے ایک مقدمے میں کانگرس وزراء کی اس طرح کی حرکات پر ریمارکس بھی دیئے اس سب کچھ کے باوجود یوپی کے وزیر اعلی نے دھڑلے سے یہ بات کہی کہ کانگرس تو مسلمانوں کے ساتھ منصفانہ ہی نہیں فیاضانہ سلوک کر رہی ہے۔ قائد اعظمؒ نے اس کے جواب میں فرمایا "میں کہتا ہوں کہ پیرپور رپورٹ میں فتنہ فساد اور ظلم و ناانصافی کے جو بیسیوں واقعات الگ بتائیں کہ نانده برادری بھاگلپور اور ہزارہ باغ میں مسلمانوں کے ساتھ کیا کچھ ہوا۔ میں یوپی کے وزیر اعلی پنڈت پینٹ سے پوچھتا ہوں کہ وہ مہربانی کرکے بتائیں کہ انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ کون کونسا رحم دلی اور فیاضی کا سلوک کیا۔"

مندرجہ بالا واقعات کی تفصیل پر ایک سرسری نگاہ ڈالنے سے بھی کانگرس راج کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے مثلاً" ٹانڈا' مشرقی یوپی کا ایک قصبہ تھا۔ جس میں 21 اگست 1938ء کو ہندو مسلم فساد ہوا۔ مولانا حسین احمد مدنی جو کانگرس کے ہمنوا تھے کے بیان کے مطابق ہندوؤں کا ایک جلوس کا گذرنا سابقہ روایات کے خلاف ہے بحث نے طول پکڑا تو تحصیلدار مسلمانوں کی مسجد کے پاس آیا اور اس کے سامنے سے گذرنے پر اصرار کرنے لگا چند مسلمانوں نے اسے روکا اور انہیں سمجھایا کہ مسجد کے سامنے راستے سے اس جلوس کا گذرنا سابقہ روایات کے خلاف ہے بحث نے طول پکڑا تو تحصیلدار کو بلایا گیا لیکن وہ فیصلہ کئے بغیر واپس لوٹ گئے تھوڑی دیر بعد ایس ڈی او پولیس آپہنچے' ان کے حکم پر پولیس نے مسلمانوں کے مجمع کو گھیر لیا اور وارننگ دیئے بغیر فائرنگ شروع کر دی۔ اس نے ہر اس جگہ فائرنگ کروائی جہاں چند مسلمان بھی جمع تھے۔ بعض جگہوں پر لاٹھی چارج بھی کیا گیا مسجد کے اندر جن نمازیوں نے دروازے بند کر دیئے تھے زبردستی باہر نکالے گئے انہیں رسیوں سے باندھ کر تھانے لاجایا گیا اور انہیں اپنا پیشاب پینے پر مجبور کیا گیا۔ ٹانڈہ کے تار گھر سے تاریں بھیجنے پر یا اسٹیشن سے کسی شخص کے گاڑی پر چڑھنے پر پابندی لگا دی گئی تاکہ اس واقعہ کی اطلاع باہر نہ جاسکے اور کانگرس حکومت نے اس پورے ظلم پر مسلمانوں کی کوئی داد فریاد نہ سنی۔

تلکوری صوبہ بہار میں ایک مسلمان نے اپنے مہمانوں کے لئے گائے کا گوشت ایک قصاب سے خریدا تو ہندوؤں نے اس پر حملہ کر دیا اس پر الزام لگایا کہ اس نے بچھڑا ذبح کیا ہے۔

اس کو' اس کے مہمانوں کو زدو کوب کیا اور ان کی عورتوں کی ان کے سامنے تذلیل کی۔ مسلمانوں کو باندھ کر ایک سور منگوایا گیا اور اس کے جسم سے ان کے چہروں کو رگڑا گیا جب قصہ عدالت میں پہنچا تو عدالت نے مصالحت کروانے پر زور دیا اور ہندوؤں کو حکم دیا کہ مسلمانوں کو دو سو روپے معاوضہ ادا کرے۔

سید جمیل الدین احمد نے بجا طور پر لکھا ہے کہ اس واقعہ سے ثابت ہو جاتا ہے کہ کانگرس راج میں ہندوانہ قانون زیر عمل آتا تھا۔ بلکہ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ان پر جنگل کا قانون نافذ ہوتا تھا۔

زبان کا مسئلہ

ایک قوم کی زبان اور اس کا رسم الخط اس کی تہذیب اور اس کی قومیت کے بقا و فنا میں فیصلہ کن حیثیت رکھتا ہے۔ ایک قوم کو دوسری قوم میں بدلنے کے لئے ہمیشہ یہی طریقہ اختیار کیا گیا ہے کہ اس کی زبان اور رسم الخط کو تبدیل کر دیا جاتا ہے۔ تاکہ اسلاف سے اس کا تعلق ٹوٹ جائے۔ برصغیر پاک و ہند میں کانگرسی حکومتوں نے یہی طریقہ مسلمانوں پر آزمایا انہوں نے کھلم کھلا ہندی کی حمایت بھی کی اور اسے ہندوستانی زبان کے روپ میں نافذ کرنے کی بھی کوشش کی۔ انہوں نے اردو کے خلاف پون صدی سے محاذ کھول رکھا تھا لیکن وہ اس زبان کے خاتمے پر قادر نہ ہو سکے تھے۔ اب انہوں نے ایک مشترک قومی زبان ہندوستانی کا ڈھونگ رچایا جس کے اسی فیصد الفاظ ہندی یا سنسکرت کے تھے اور جس زبان کو ایک اردو دان کے لیے سمجھنا ناممکن ہے۔ دراصل ہندی ہی کو باہمی قومی زبان کے نام سے رائج کرنے کی کوشش کی جارہی تھی۔ کبھی کبھار کانگرس لیڈر اپنے اس مصنوعی پردے سے باہر آکر ہندی کی حمایت میں اعلان عام بھی کر دیتے تھے مثلاً" گاندھی جی تک نے کئی مرتبہ وضاحت کی کہ ہندی زبان ہی ہندوستان کی قومی زبان ہے۔ اور دیوناگری رسم الخط ہی ہندوستان کا رسم الخط ہونا چاہیے۔ صدر کانگرس سبھاش چندر بوس نے راشٹر باشا سمیلن ترجمہ قومی زبان کانفرنس کے ساتویں اجلاس کو جو پیغام بھیجا وہ زیادہ واضح ہے لکھنے میں صوبوں کے باہمی تعلقات کی ترقی کے لئے ایک مشترک زبان کی ضرورت ہے۔ اور وہ زبان ہندی ہی ہو سکتی ہے جن لوگوں نے ابھی تک

ہندی نہیں سیکھی انہیں چاہئے کہ ہندوستانی قوم کی تعمیر میں مددگار ثابت ہوگی۔ یوپی کے وزیر تعلیم نے بنارس میں ایک تقریر میں اور زیادہ واضح الفاظ استعمال کئے کہ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہندی کو ہندوستانی بھی کہا جاتا ہے۔ ہمارے جنوبی ہند کے ہم وطن آسانی سے سیکھ لیں تو لازم ہے کہ ہم ہندوستانی زبان میں سنسکرت کے کافی الفاظ استعمال کریں۔ سید ابوالاعلی مودودی نے ان ساری حرکات کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد لکھا کہ یہ وہ لوگ ہیں کہ جنہوں نے متحدہ ہندوستانی کے نام سے سیاسی طاقت حاصل کی ہے اور اب وہ اس طاقت کو ہندوستان کی ایک قوم کی زبان کو سارے ملک پر مسلط کردینے میں استعمال کر رہے ہیں۔

قرارداد پاکستان

پس منظر، پیش منظر

یوں تو قائداعظمؒ نے ایک مرتبہ دوران تقریر فرمایا تھا کہ پاکستان کی بنیاد تو اسی دن رکھ دی گئی تھی جب پہلا ہندو مسلمان ہوا تھا۔ اس نے عملی طور پر اپنے آباؤاجداد، عزیزواقارب کو برملا کہا تھا کہ تم مجھ سے الگ ہو، تمہارا مجھ سے اب کوئی تعلق نہیں تم ہندو ہو، بت پرست ہو، گائے کی پوجا کرنے والے ہو، تمہاری زندگی، تمہارا تمدن، تمہارا رہن سہن، قانون وضوابط گویا کہ ہر چیز مجھ سے الگ ہے۔ میں نے تمہاری ان سب چیزوں کو چھوڑ دیا ہے۔ میں اب صرف اللہ کو اپنا الہ مانتا ہوں۔ لیکن اس کے باوجود بھی ہندو اور مسلمان مل جل کر زندگی بسر کرتے رہے۔ ان میں باہمی امن وسکون بھی تھا اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کی مسلمان حکمران تھے ان کے پاس قوت تھی اور ہندو قوت کا پجاری ہے۔ اس کے بت اور معبود اس حقیقت کے آئینہ دار ہیں۔ اسی بنا پر وہ مسلمانوں کے سامنے رام رام کرتے رہے۔ سترہویں صدی عیسوی میں انگریز تاجر کی حیثیت سے ہندوستان میں آئے۔ رفتہ رفتہ وہ اپنی عیاری ومکاری، ہندوؤں کی یاری اور اپنوں کی غداری سے وہ ہندوستان پر قابض ہونے لگے یہاں تک کہ 1857ء کی جنگ آزادی میں مسلمانوں کی ناکامی کی بنا پر ہندوستان پر قابض ہو گئے۔ ہندو کے لئے یہ تبدیلی کوئی اتنی بڑی تبدیلی نہ تھی وہ مسلمانوں کی غلامی سے نکل کر انگریز کی غلامی میں چلے گئے تھے۔ کے کے عزیز کے مطابق ہندوؤں کے لئے یہ ٹوپی بدلنے کے مترادف تھی۔ لیکن مسلمانوں کے لئے یہ بہت بڑی تبدیلی یا انقلاب تھا۔ کل تک وہ حاکم تھے آج وہ غلام بن گئے تھے۔ ان کی اس

تبدیلی کا نقشہ ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر کچھ اس طرح کھینچتے ہیں:۔

"اگر کوئی برطانوی سیاستدان دار العوام میں جذباتی فضا پیدا کرنا چاہتا تھا تو اسے صرف بنگالی مسلمانوں کے حالات بیان کرنے کی ضرورت تھی۔ در حقیقت انگریزی تسلط میں آتے وقت ہندوستان کے مسلمان اعلیٰ نسل تھے وہ نہ صرف جرات مند اور باحوصلہ تھے بلکہ سیاسی تنظیم اور حکومت کے نظام میں بھی دوسروں پر فائق تھے۔ لیکن اب مسلمانوں کے لئے نہ صرف سرکاری بلکہ غیر سرکاری حلقوں میں بھی اعلیٰ ملازمتوں کے دروازے بند ہو چکے ہیں اعلیٰ ترین افسر سے لے کر ایک ادنیٰ ترین افسر تک یہ احساس ہو چکا ہے کہ ہم (انگریزوں) نے مسلمانوں کے متعلق اپنی ذمہ داری کو کماحقہ پورا نہیں کیا۔ اب سے ایک سو ستر سال پہلے ہندوستان کے کسی اچھے خاندان کے مسلمان کے لئے یہ تقریباً" ناممکن تھا کہ وہ غریب ہو جائے۔ آج کل اس کے لئے یہ تقریباً" ناممکن ہے کہ وہ مالدار ہو سکے۔"

اس پر کئی شاعروں نے مرثیے لکھے۔ لیکن جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات ہی ہوتی ہے۔ مسلمان ذلت کے گڑھے میں گرتے گئے اس مایوسی اور بدحالی کے عالم میں ایک شخص سرسید احمد خان نامی آگے بڑھتا ہے۔ وہ اس حقیقت کو بھانپ لیتا ہے کہ اب انگریز قدم جما چکے ہیں ان کو اب انہی کے ہتھیاروں سے مسلح ہو کر وطن سے نکالا جا سکتا ہے۔ اس لئے قوم کو انگریزی زبان اور انگریزی تہذیب سیکھنے کی ضرورت ہے۔ وہ اس ضمن میں سعی و کوشش کرتا ہے۔ مسلم علی گڑھ یونیورسٹی کی بنیاد ڈالتا ہے۔ جس سے بعد میں تحریک پاکستان کا ہراول دستہ پیدا ہوتا ہے۔ اسی زمانہ میں ہندوستانیوں میں سیاسی بیداری پیدا کرنے کے لئے ایک انگریز لارڈ ہیوم نے آل انڈیا نیشنل کانگریس کی بنیاد رکھی۔ جس کی وجہ سے ہندوؤں میں سیاسی بیداری پیدا ہوئی۔ مغربی افکار و نظریات اور سوچوں نے ان پر واضح کر دیا کہ انگریز ایک نہ ایک دن چلے جائیں گے۔ بادشاہت و ملوکیت کا دور بیت چکا ہے۔ اکثریت کے بل بوتے پر آئندہ کی حکومتیں وجود میں آئیں گی۔ لہٰذا انہوں نے بڑھ چڑھ کر سیاسی تربیت لینا شروع کر دی۔ مسلمانوں میں سے پڑھے لکھے باشعور' جاگیردار یا سرمایہ دار (جو آٹے میں نمک کے برابر بھی نہ تھے) سیاست میں دلچسپی لینے لگے ادھر سرسید احمد خان نے محمڈن کانفرنس کی بنیاد رکھی اور سیاسی تربیت کا بندوبست ہونے لگا۔ لیکن مسلمانوں میں سیاسی بیداری ابھی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ وہ تو ابھی

تک پیٹ کے دھندے سے ہی فارغ نہ ہوئے تھے وہ سیاست کیا کرتے۔ بہرحال سیاست کی گاڑی چلتی رہی۔ آل انڈیا نیشنل کانگریس ہی ہندوستانیوں کی محدود سی آواز تھی۔ مسلمانوں کو بھی اس پر اعتماد تھا۔ 1905ء میں تقسیم بنگال کا واقعہ پیش آگیا۔ جس نے کانگریس کا بھرم کھول دیا۔ اس نے انصاف اور مسلمانوں کی حمایت کرنے کی بجائے خالص ہندوانہ ذہنیت کا مظاہرہ کیا جس سے مسلمانوں کو سخت دھچکا لگا اور انہیں محسوس ہوا کہ کانگریس تو صرف ہندوؤں کی نمائندہ جماعت ہے۔

انہی دنوں میں یہ بات مشہور ہو گئی کہ انگریز ہندوستان میں کچھ آئینی اصلاحات کا نفاذ کرنے والے ہیں۔ چنانچہ مسلم قائدین کا ایک وفد اس ضمن میں وائسرائے کے پاس شملہ گیا۔ اس وفد کے قائد سر آغا خان تھے۔ وفد نے بڑی خوبی کے ساتھ ہندوستانی مسلمانوں کے مسئلہ کو پیش کیا۔ یہ انہی قائدین کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ 1909ء کی منٹو مارلے اصلاحات میں مسلمانوں کے لئے جداگانہ انتخابات کو تسلیم کر لیا گیا۔ واپسی پر آتے ہوئے وفد ڈھاکہ گیا وہاں نواب سلیم اللہ خان کے گھر 1906 میں آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا جو مسلمانوں کی نمائندہ جماعت کی حیثیت سے ابھری۔ یوں سیاسی طور پر ہندوستان میں دو قومی نظریہ کی بنیاد پڑی۔

18-1914ء جنگ عالمگیر اول جاری رہی۔ جس میں جرمن' اٹلی اور ترکی ایک طرف تھے اور برطانیہ اور دیگر اتحادی ایک طرف تھے۔ جرمنی' اٹلی اور ترکی کو شکست ہوئی۔ اس کے نتیجہ میں انگریزوں نے ترکی کے حصے بخرے کرنے شروع کر دیئے۔ جس کے خلاف ہندوستانی مسلمانوں نے تحریک چلائی جسے تحریک خلافت کہتے ہیں۔ اس تحریک کے دوران ہندو اور مسلمان متحد ہوئے انہوں نے مشترکہ کوششیں کیں۔ اس میں سب سے زیادہ نفع گاندھی جی کو ہوا۔ جو معمولی قسم کے افریقہ میں وکیل تھے یہاں مہاتما گاندھی اور ہندوستان کے چوٹی کے لیڈر بن گئے۔ جب گاندھی نے حالات کو اپنے حق میں دیکھا تو ستیہ گرہ' ترک موالات ور دوسری تحریکوں کو ختم کرنے کا اعلان کیا نیز کمال اتاترک نے برسر اقتدار آکر خلافت کو ہی ختم کر دیا۔ جس کی وجہ سے یہ تحریک بھی ختم کر دی گئی۔

اس تحریک کے بعد مسلمان بٹ گئے جس طرح کسی علاقے میں سیلاب آئے اور اس

کاریلا گزر جائے تو بعد میں پانی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے رہ جاتے ہیں بعینہ مسلمانون کا حال ہوا۔ وہ بھی مختلف جماعتوں میں بٹ گئے۔ ہندوؤں کے لئے ان کا بٹ جانا بہت بڑی کامیابی تھی۔ اب کانگریس ہندوستان کی بہت بڑی طاقت بن گئی تھی۔ اس میں اس قدر غرور و تمکنت آگیا تھا کہ 1929ء کی نہرو رپورٹ میں مسلمانوں کے کاز اور مفادات کو بالکل ہی نظرانداز کردیا گیا۔ اس کے بعد ہندوستان کے مسئلے کا حل تلاش کرنے کے لئے گول میز کانفرنسیں بلائی گئیں۔ جن کی ہندو کانگریس کی طرف سے گاندھی جی نے نمائندگی کی۔ لیکن اس نے ہر مقام پر ہر کانفرنس کو سبوتاژ کرنے کی کوشش کی۔ جس سے مسلم قائدین کو ہندو ذہنیت کا گہرا علم ہونے لگا۔ 1935ء کے گورنمنٹ انڈیا ایکٹ کے تحت انتخابات کے نتیجہ میں ہندو کانگریس کو مسلمانوں کی بے اتفاقی کی بنا پر بہت بڑی اکثریت حاصل ہوئی اور اس نے اپنے صوبوں میں حکومتیں بنالیں اور مسلمانوں پر وہ ظلم توڑے جن کے سامنے چنگیز کی چنگیزیت بھی ماند پڑ جائے۔ یہ وہ عوامل تھے جنہوں نے مسلم قائدین کو علیحدگی کے بارے میں سوچنے پر مجبور کیا۔ یہی وہ سوچ ہے جس کی بنا پر قرارداد پاکستان وجود میں آئی۔

1940ء کا مسلم لیگ کا اجلاس لاہور میں ہونا منعقدہ قرار پایا۔ 21 مارچ کو اجلاس ہونا تھا۔ اس وقت لاہور کے حالات سخت ابتر تھے۔ برطانوی سامراج کے سائے تلے پنجاب کے مشہور جاگیردار وزیر اعلیٰ کے ہاتھوں خاکساروں کا قتل عام ہوا تھا۔ شاہی مسجد اور لاہور کی دوسری کئی مساجد میں خاکساروں کا خون بہہ چکا تھا۔ ان حالات میں مسلمان ایک تاریخی فیصلے کے لئے جمع ہو رہے تھے جہاں انہوں نے اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنا تھا اور اپنے قومی تشخص کو اجاگر کرنا تھا۔

جب وہ تاریخی دن طلوع ہوا تو اس گردوں نے دیکھا کہ مسلمانوں کا ایک جم غفیر اپنی امنگوں' آرزوں' احساسات اور جذبات سے معمور منٹو پارک میں جمع ہو رہا ہے اور وہ جوش و خروش ہے کہ ایک عامی اس کا اندازہ کرنے سے قاصر ہے۔ اس قرارداد میں کہا گیا:۔

جغرافیائی لحاظ سے مستقل علاقائی وحدتوں کی حد بندی اور ضروری و مناسب تبدیلیوں کے بعد ہندوستان کے شمال مغرب اور مشرق کے وہ علاقے جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے دو آزاد حکومتیں قرار دے دی جائیں ان میں شامل ہونے والی وحدتوں کو داخلی آزادی اور

اقتدار اعلیٰ حاصل ہو۔ ان وحدتوں اور علاقوں میں اقلیتوں کے مذہبی' ثقافتی' اقتصادی' انتظامی اور دوسرے حقوق و مفادات کے تحفظ کے لئے ان کے مشوروں سے دستور میں خاص طور سے مناسب اور موثر تحفظات شامل کئے جائیں۔

اس تاریخی قرار داد نے قومی جدوجہد کی ایک منزل متعین کی اور قائد اعظم نے اس تاریخی اجلاس میں ارشاد فرمایا:

"میں مسلمان دانشوروں سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ قربانی کے جذبے کے ساتھ میدان عمل میں پھیل جائیں مسلمان عوام بیدار ہیں ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ پورے برصغیر میں مسلمانوں کو اقتصادی' معاشرتی' سیاسی اور تعلیمی اعتبار سے منظم کیا جائے مجھے یقین ہے کہ مسلمان اس کے بعد ایسی قوت بن جائیں گے جس کا سبھی احترام کریں گے۔"

اس اپیل نے مسلمانان ہند کے ہر طبقے کو ہلا کر رکھ دیا۔ مسلمانوں کو اپنی منزل مقصود مل گئی وہاں ہی چند مفاد پرستوں کو اس قرار داد نے ایک امتحان میں ڈال دیا۔ خصوصاً" پنجاب میں جاگیردار جماعت یونینسٹ کو جو اپنے سیاسی اقتدار کو مضبوط کر رہے تھے۔ سرحد میں سرخ پوش لیڈر خان عبدالغفار خان جو باپو مہاتما گاندھی کے چرنوں میں بیٹھے ہوئے تھے اور کانگریس کی زبان بول رہے تھے۔ کشمیر میں شیخ عبداللہ جو برہمنی سامراج کے زیر اثر ذاتی مفادات کا پتلا بنے ہوئے تھے' بنگال میں مہابنگال کا نعرہ ہندوؤں کے زیر اثر بلند ہو رہا تھا اور تو اور اپنے مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا حسین احمد مدنی جیسے لوگ متحدہ قومیت کا راگ الاپنے لگے۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے ذاتی مفادات کے حصول کے لئے مسلمانوں کے مشترکہ کاذ کو زبردست نقصان پہنچانے کی کوشش کی لیکن مسلمانوں کے سامنے ان کی کچھ پیش نہ گئی۔

قائد اعظم نے اس قرار داد کے بعد یہ مسلسل کوشش کی کہ دنیا پر واضح کر دیا جائے کہ مسلمانان ہند ایک الگ قوم ہیں۔ چونکہ یہ وہی حربہ تھا جس کے تحت مسلمان اپنا الگ وطن حاصل کر سکتے تھے۔ اس سے قبل جے ایس مل کے افکار کے زیر اثر یورپ ٹکڑے ٹکڑے ہو چکا تھا۔ اور ہندوستان سے برما اور لنکا کو الگ کیا جا چکا تھا۔ چنانچہ آپ نے نہ صرف عوام کو بلکہ ہندو قیادت اور انگریز حکمران کو بھی یہ تسلیم کروایا کہ مسلمان ایک الگ قوم ہیں۔ آپ نے اس حقیقت کو منوانے کے لئے فرمایا:

"مسلمان ایک الگ قوم ہیں وہ ایک جداگانہ مذہب' ایک بالکل جداگانہ تہذیب کے مالک ہیں مسلمانوں کے نام' انکی عادات واطوار' ان کی رسوم اور تہوار' ان کا ضابطہ اخلاق' ان کی معاشرتی تنظیمیں غرض جملہ امور ہندوؤں سے بالکل جداگانہ اور مختلف ہے۔ کسی پس منظر میں بھی دیکھئے ہندوستان میں دو ہی نمایاں فرقے نظر آئیں گے ایک کا نام ہندو ہے اور دوسرے کا نام مسلمان' اور دونوں کو بجا طور پر دو قوموں کا نام دیا جاسکتا ہے۔"

تاریخ شاہد ہے کہ ہندو اور مسلمان کبھی ایک قوم کی حیثیت سے نہ رہے ان کی تاریخ باہمی تصادم اور لڑائی جھگڑے کی تاریخ ہے۔ محمود غزنوی' شہاب الدین غوری' ظہیر الدین بابر' اور اورنگزیب عالمگیر مسلمانوں کے جلیل القدر مشاہیر ہیں جب کہ ہندوؤں کے نزدیک یہ ڈاکو' ظالم اور جابر حملہ آور ہیں۔ رانا سانگاہ' ہیموں بقال اور سیوا جی کی مسلمانوں کے نزدیک ڈاکو اور غنڈہ سے زیادہ کچھ حیثیت نہیں' جب کہ ہندوؤں کے یہ ہیرو ہیں۔ ہندو گائے کی پوجا کرتے ہیں مسلمان اس کو ذبح کر کے اس کا گوشت کھاتے ہیں اور اس کی قربانی دیتے ہیں۔ مسلمان موحد ہیں جب کہ ہندو مشرک۔ ہندوؤں کی عبادت بتوں کی پوجا اور انکے سامنے بھجن گانا ہے جب کہ مسلمانوں کی تمام عبادات سکون و اطمینان کی طالب ہیں۔ ہندو اہنسا اور مسئلہ کرم کا قائل ہے جب کہ مسلمان جہاد کو فرض اور موت کے بعد جزا و سزا کا قائل ہوتا ہے۔ ہندو گائے کو گوبر کو پوتر جان کر گھروں اور دکانوں میں برکت کے حصول کے لئے ان کی لیپ کرتا ہے اور مسلمان اس کے اوپلے بنا کر جلاتا ہے۔ یعنی ان ہر دو کے درمیان مذہبی' معاشرتی' اخلاقی' روحانی' ثقافتی غرض زندگی کے ہر پہلو میں بعد المشرقین کہا جاتا ہے۔ اسی بنا پر ایک مرتبہ قائداعظم نے فرمایا:

"اسلام اور ہندو دھرم محض مذاہب نہیں ہیں بلکہ درحقیقت وہ دو مختلف معاشرتی نظام ہیں چنانچہ اس خواہش کو خواب و خیال ہی کہنا چاہیے کہ ہندو اور مسلمان مل کر ایک مشترکہ قومیت تخلیق کر سکیں گے۔ یہ لوگ آپس میں شادی بیاہ نہیں کرتے نہ ایک دسترخوان پر کھانا کھاتے ہیں میں واشگاف لفظوں میں کہتا ہوں کہ وہ دو مختلف تہذیبوں سے واسطہ رکھتے ہیں اور ان دو تہذیبوں کی بنیاد ایسے تصورات اور حقائق پر رکھی گئی ہے جو ایک دوسرے کی ضد ہیں بلکہ اکثر متصادم ہوتے رہتے ہیں۔ انسانی زندگی کے متعلق ہندوؤں اور مسلمانوں کے خیالات

اور تصورات ایک دوسرے سے مختلف ہیں یہ بھی ایک واضح حقیقت ہے کہ ہندو اور مسلمان اپنی اپنی ترقی کی تمناؤں کے لئے مختلف تاریخوں سے نسبت رکھتے ہیں۔ ان کے تاریخی وسائل اور مواخذ مختلف ہیں' ان کی رزمیہ نظمیں' ان کے سربر آوردہ بزرگ اور قابل فخر تاریخی کارنامے سب مختلف اور الگ الگ ہیں اکثر اوقات ایک قوم کا زعیم اور رہنما دوسری قوم کے بزرگ اور برتر ہستیوں کا دشمن ثابت ہوتا ہے۔ ایک قوم کی فتح دوسری قوم کی شکست ہوتی ہے ایسی دو قوموں کو ایک ریاست یا ایک حکومت کی ایک مشترکہ گاڑی کے دو بیل بنانے اور ان کو باہمی تعاون کے ساتھ قدم بڑھانے پر آمادہ کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دونوں کے دلوں میں بے صبری روز بروز بڑھتی رہے گی جو انجام کار تباہی لائے گی خاص کر اس صورت میں کہ ان میں سے ایک قوم تعداد کے لحاظ سے اکثریت میں ہو اور دوسری اقلیت میں ہو ایسی ریاست کے آئین کا عمل خاک میں مل کر رہے گا۔"

آپ نے ایسوسی ایٹڈ پریس آف امریکہ کو یکم جولائی 1942ء کو فرمایا:

"ہم مسلمان اپنی تابندہ تہذیب و تمدن کے لحاظ سے ایک قوم ہیں زبان و ادب' فنون لطیفہ' فن تعمیر' نام و نسب' شعور و اقدار و تناسل' قانون و اخلاق' رسم و رواج' تاریخ و روایات اور رجحان و مقاصد ہر ایک لحاظ سے ہمارا اپنا انفرادی زاویہ نگاہ اور فلسفہ حیات ہے۔ بین الاقوامی قانون کی ہر تعریف ہماری قومیت کو سلامی دینے کے لئے تیار ہے۔"

مسلم لیگ کے اجلاس میں کراچی 1943ء میں قائد اعظم نے فرمایا "وہ کونسا رشتہ ہے جس سے منسلک ہونے سے تمام مسلمان جسد وحدت کی طرح ہیں وہ کونسی چٹان ہے جس پر ان کی ملت کی عمارت استوار ہے' وہ کونسا لنگر ہے جس سے اس امت کی کشتی محفوظ کردی گئی؟ وہ رشتہ' وہ چٹان' وہ لنگر خدا کی کتاب قرآن مجید ہے' مجھے یقین ہے کہ جوں جوں ہم آگے بڑھتے جائیں گے ہم میں زیادہ سے زیادہ اتحاد پیدا ہوتا جائے گا۔ ایک خدا' ایک رسول' ایک کتاب اور ایک امت"۔

مسلمانوں نے اس حقیقت کو تسلیم کر لیا کہ وہ ایک الگ قوم ہیں ان کے قائد محمد علی جناح اور جماعت مسلم لیگ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ 1946ء کے انتخابات میں مسلم لیگ نے اپنی تمام آئینی نشستیں جیت کر ثابت کر دیا کہ وہ ایک الگ قوم ہیں۔ یہاں تک کہ کانگریس کی طرف

سے بڑے بڑے جغادری مسلم لیڈر ہار گئے تھے اس الیکشن نے انگریزوں پر واضح کر دیا کہ قائد اعظم مسلمانوں کی آواز ہیں۔ اور تمام مسلم قوم ان کی پشت پر ہے اور ابوالکلام آزاد جنہیں کانگریس نے مسلمانوں کو دھوکہ دینے کے لئے کانگریس کا صدر بنا رکھا تھا وہ ان انتخابات کے بعد اپنا وقار کھو بیٹھے۔ بے شک ہندوؤں نے انہیں کئی ایک موقع پر بعد میں بھی استعمال کرنے کی کوشش کی لیکن ہر بار ناکامی ہوئی۔

اس قرارداد نے مسلمانوں کو ایک منزل مقصود عطا کی اس ذرا سی نم نے انہیں ایسی جلا دی کہ وہ ایک ہی وقت میں انگریزوں' ہندوؤں اور اپنوں سے ٹکر لینے کو تیار ہو گئے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ صرف سات سال میں وہ آزادی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے اور دنیا کے نقشے پر پاکستان نامی ملک ظاہر ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندوؤں نے متحدہ قومیت کا راگ مسلمانوں اور انگریزوں کو بیوقوف بنانے کے لئے الاپا تھا ورنہ انہوں نے پنجاب' بہار' اڑیسہ' گجرات اور بنگال میں قتل و غارت مچائی ہے اس کی وجہ کیا ہے؟ یہی نا کہ وہ مسلمان تھے ورنہ وہ ان کے ساتھ مدتوں سے رہ رہے تھے۔ اس قتل عام میں متحدہ قومیت کی سوچیں کہاں تھیں۔ آج جو مسلمانوں کا بھارت میں قتل عام اور ان کی مساجد کی مسماری اور بربادی ہو رہی ہے وہ کیوں ہے؟ کیا اس سے یہ واضح نہیں ہوتا کہ ہندو اکثریت متحدہ قومیت پر ایمان نہیں رکھتی وہ مسلمانوں اور انگریزوں کو دھوکہ دے رہے تھے اور وہ اب تک دنیا کی آنکھوں میں اسی سیکولرزم کے ذریعے دھول جھونک رہے ہیں آج کے دن مسلمانوں نے ایک ٹھوس فیصلہ کیا قوم نے اس پر لبیک کہا۔ پھر کیا تھا مسلمان بچہ بچہ مسلم لیگ کا علمبردار بن گیا۔ پورے ہندوستان کے گلی کوچوں میں "ہم لے کے رہیں گے پاکستان" کے نعرے گونجنے لگے جن کی ہندو اور انگریز تاب نہ لا سکے۔ جب حضرت قائد اعظمؒ نے "راست اقدام" کا اعلان کیا تو ہندوؤں اور انگریزوں کی سب عیاری اور مکاری دھری کی دھری رہ گئی اور مجبوراً اعلان کر دیا کہ 14 اگست 1947ء کو پاکستان بنا دیا جائے گا اور مسلمانوں نے صرف سات سال کے قلیل عرصہ میں پاکستان حاصل کر لیا عظیم ملت' عظیم ملک۔

اقبال کا پاکستان

علامہ اقبال دنیائے اسلام کے عظیم خیرخواہ' اتحاد اسلامی کے علمبردار اور قیام پاکستان کے عظیم مجاہد تھے۔ آپ صرف شاعر ہی نہ تھے بلکہ ایسے فلسفی تھے جو قوم کو راہ ہدایت کی طرف راہنمائی کرتے ہیں۔ آپ کے زمانے میں مسلمانوں کی حالت بڑی خراب اور قابل رحم تھی۔ انگریزوں اور ہندوؤں کی اسلام کے خلاف مشترکہ سازشیں علامہ اقبال کے تصور پاکستان کا پس منظر بنیں۔ آپ نے یہ شدت سے محسوس کر لیا کہ مسلمانوں کے اندر احساس زیاں کی حد درجہ کمی ہے اس کے ساتھ ہی انہیں یہ یقین تھا کہ اگر وہ منزل کی طرف جاوہ پیما ہو گئے تو ان کی عظمت رفتہ لوٹ آئے گی:

جہاں میں اہل ایماں صورت خورشید جیتے ہیں
ادھر ڈوبے ادھر نکلے' ادھر ڈوبے ادھر نکلے

حفیظ ہوشیار پوری کی اس بات پر کہ "قوم مرنے کے بعد پھر زندہ نہیں ہوتی" آپ نے فرمایا:

"یہ خیال صحیح نہیں مختار قومیں عام طور پر اپنے محکوموں کے دل و دماغ پر یہ خیال اس لئے مسلط کر دیتی ہیں کہ ان میں پھر سے اپنی کھوئی ہوئی قوت حاصل کرنے کا جذبہ ہی پیدا نہ ہو۔ اسلام اس خیال کا قطعی مخالف ہے"۔ آپ محض ایک قوم کے متعلق فرماتے ہیں کہ مر کر زندہ نہیں ہو سکتی مگر خیال فرمایئے کہ مسلمان تو قیامت کا قائل ہے اور اس کا عقیدہ ہے کہ ایک قوم کیا ساری دنیا مر کر ایک بار پھر زندہ ہو گی۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اقبال کی فکری اوج کے پس منظر میں ہمیشہ اسلامی نظریات رہے ہیں انہیں نظریات اور خیالات کے تحفظ کے لئے وہ ایک آزاد مملکت کے حامی ہیں۔ جہاں مسلمان اسلامی وحدت و فکر و عمل کے مطابق زندگی بسر کرنے کے قائل ہو سکیں گے اس ضمن میں وہ رقمطراز ہیں:

"شریعت اسلامیہ کے کافی طویل اور بغور مطالعے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اگر اس قانون کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے اور اس پر پوری طرح عمل کیا جائے تو ہر شخص کا استحقاق یقیناً" محفوظ ہو سکتا ہے۔ لیکن شریعت اسلامیہ پر عمل کرانا اور اس کو ترقی دینا اس وقت تک ناممکن ہے جب تک کہ آزاد ریاست نہ بن جائے میں عرصہ دراز سے اس پر مخلصانہ طور پر یقین رکھتا ہوں اور اب بھی مجھے یقین ہے کہ صرف یہی مسلمانوں کی مشکلات کا حل ہے اور ہندوستان کی عافیت بھی اسی میں ہے۔"

شریعت اسلامیہ کے مفاہیم و مطالب نہایت وسیع ہیں اس سے مراد صرف اسلامی تعزیرات کا نفاذ ہی نہیں بلکہ ایک ایسا نظام عدل و انصاف اور معاشی اور معاشرتی انصاف مراد ہے۔ جس کا مکمل نمونہ جناب رسول مقبولؐ نے اپنی حیات اقدسیہ میں دیا اور خلفاء راشدین نے اس پر عمل کر کے دکھایا لیکن ہمارے قائدین و علماء اسلام ملوکانہ اسلام کے نفاذ کے قائل ہیں۔ غرباء کی بہتری کے لئے جو اسلام اخوت و مساوات' عدل و انصاف اور محروم کے حقوق کی بات کرتا ہے اس پر عمل کرنے سے گریزاں ہیں۔ وہ اسلام کو بھی پابند ملوک کرنا چاہتے ہیں حالانکہ اقبال نے خود اس ضمن میں بہت کچھ کہا ہے:

"میں علماء کی ایک ایسی جماعت قائم کرنے کی تجویز پیش کرتا ہوں جس میں ایسے مسلم قانون دان ضرور شریک کئے جائیں جنہوں نے جدید اصول قانون کی تعلیم پائی ہو۔ مقصد یہ ہے کہ اسلام کے بنیادی اصولوں کی روح کو سمجھ کر اسلامی قوانین کا موجودہ حالات کی روشنی میں تحفظ' توسیع اور اگر ضرورت ہو تو اس کی از سر نو تعبیر کی جائے۔ جدید دنیا' مسلم و غیر مسلم دونوں کو ابھی اسلامی عدل کی راہ محدود کی قدر و قیمت سے آشنا ہونے کی ضرورت ہے اور سرمایہ دارانہ دنیا کو جس کے اخلاقی معیارات' انسان کے معاشی طرز عمل کی حدود سے بہت دور جا پڑے ہیں اسلامی قوانین سے روشناس کرانے کی ضرورت ہے۔"

اقبال کے بیانات و تقاریر صفحہ 60-61

آپ کو یاد ہو گا کہ تحریک آزادی کے دوران مسلمانوں کا ایک خاص طبقہ کانگریس کا ہمنوا بن گیا تھا۔ وہ اس آزادی کو سبوتاژ کرنا چاہتا تھا۔ اقبالؒ اپنے مضامین میں اس فکر کی نفی کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

"مسلمان ہونے کی حیثیت سے انگریز کی غلامی کے بند کو توڑنا اور اس کے اقتدار کا خاتمہ کرنا ہمارا فرض ہے۔ اور اس آزادی سے ہمارا مقصد یہی نہیں کہ ہم آزاد ہو جائیں۔ ہمارا اول مقصد یہ ہے کہ اسلام قائم رہے اور مسلمان طاقتور بن جائیں۔ اس لئے مسلمان کسی ایسی حکومت کے قیام میں مددگار نہیں ہو سکتا جس کی بنیادیں انہی اصولوں پر ہوں جن پر انگریزی حکومت قائم ہے۔ ایک باطل کو مٹا کر دوسرے باطل کو قائم کرنا چہ معنی دارد؟ ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان کلیتاً" نہیں تو ایک بڑی حد تک دارالاسلام بن جائے۔ لیکن اگر آزادی ہند کا نتیجہ یہ ہو کہ جیسا دارا لکفر ہے تو ویسا ہی رہے یا اس سے بھی بدترین بن جائے تو مسلمان ایسی آزادی وطن پر ہزار مرتبہ لعنت بھیجتا ہے۔ ایسی آزادی کی راہ میں لکھنا' بولنا' روپیہ خرچ کرنا' لاٹھیاں کھانا' جیل جانا' گولی کا نشانہ بننا سب کچھ حرام اور قطعی حرام ہے۔"

مضامین اقبال صفحہ 196-195

اسی فکر کو آگے بڑھاتے ہوئے وہ رقمطراز ہیں:

"لہٰذا میں ہندوستان اور اسلام کے بہترین مفادات کے پیش نظر ایک مستحکم و متحد مسلم مملکت کے قیام کا مطالبہ کر رہا ہوں۔ اس سے اندرونی توازن قوت کی بدولت ہندوستان میں تحفظ اور امن پیدا ہو جائے گا اور اسلام کے لئے ایک ایسا موقع حاصل ہو گا کہ وہ اس ٹھپّے سے نجات حاصل کر لے جو عرب شہنشاہیت نے اس پر لگا دیا ہے۔ اور اپنے قانون' اپنی تعلیم اور اپنی ثقافت کو حرکت میں لائے اور انہیں اپنے اصلی مزاج اور عصر حاضرہ کی روح سے قریب تر کر دے۔" ایضاً صفحہ 15

یہ سچ ہے کہ اقبالؒ مغربی جمہوریت کے مخالف ہیں اور دو شعر اکثر اخبارات اور تقاریر کا موضوع بنتے ہیں کہ:

جلال بادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو

جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

یا

گریز از طرز جمہوری غلام پختہ کار لے شو
کہ از مغز دو صد خر فکر انسانے نمی آید

لیکن اس کے باوجود وہ اسی جمہوریت کو اسلام کی ابتدائی پاکیزگی کی طرف رجوع کا ذریعہ خیال کرتے ہیں۔ وہ قائد اعظم کو خطوط لکھتے ہوئے جہاں مسلمانوں کے "روٹی کے مسئلہ" کی اہمیت کو جتاتے ہوئے اور نہرو کی منکر خدا اشتراکیت کو رد کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"شریعت اسلام کا نفاذ (آزاد مسلم ریاست کے بغیر) ناممکن ہے۔ میں کئی سال سے اس عقیدے کا زیادہ سے زیادہ قائل ہوتا جارہا ہوں اور اب بھی میرا خیال یہی ہے کہ مسلمانوں کی روٹی کا مسئلہ اور ہندوستان میں امن وعافیت کا مسئلہ اسی طرح حل ہو سکتا ہے۔ اگر ہندوستان میں یہ ممکن نہیں ہے تو پھر دوسرا رخ یہ کہ خانہ جنگی ہوگی بلکہ ہندو مسلم فسادات کی شکل میں تو وہ پہلے ہی ظہور میں آچکی ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ ملک کے بعض حصوں میں مثلاً سرحدی علاقے میں فلسطین کی داستان دہرائی جائے گی۔ اور یہ بھی کہ جواہر لال کی اشتراکیت اگر ہندوؤں کی ہیئت سیاسیہ میں سرایت کر گئی تو خود ہندوؤں میں بھی خون خرابہ ہوگا.... ادھر اسلام کے لئے صورت یہ ہے کہ اگر اشتراکی جمہوریت کو مناسب تبدیلیوں اور اسلام کے اصول شریعت کے ساتھ اپنا لیا جائے تو وہ کوئی نئی بات یا انقلاب عظمی نہیں ہوگا بلکہ اسلام کی اصل پاکیزگی کی طرف واپس آنا ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ عہد جدید کے مسائل کا حل مسلمان کے لئے جس قدر آسان ہے ہندو کے لئے اتنا آسان نہیں ہے۔" صفحہ 18-16

جو حرف "قل العفو" میں پوشیدہ ہے اب تک
اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار

دراصل اقبال "حقیقی جمہوریت کا قائل ہیں ان کے ذہن میں جمہوریت کا وہ نقشہ ہے جسے اسلام نے چالیس سال تک دنیا کے سامنے پیش کیا اس جمہوریت میں حکمرانوں کا کوئی طبقہ نہیں

تھا۔ ہر طرح کی آزادی ضمیر تھی۔ مملکت رفاعی ریاست تھی جس کے اندر عمر فاروق رضی اللہ عنہ جیسا جلیل القدر انسان راتوں کو گردش کر کے دیکھتا تھا کہ کہیں ظلم تو نہیں ہو رہا یا کسی کے گھر میں فاقہ تو نہیں۔ اگر کوئی غریب گھرانا نان شبینہ کا محتاج دکھائی دیتا تو بیت المال سے اپنی پیٹھ پر لاد کر سامان خورد و نوش معذرت کے ساتھ وہاں پہنچا دیتا۔ کوئی امیر یا گورنر' سرمایہ دار یا جاگیردار کسی پر ظلم نہ کر سکتا۔ یہ ہر قسم کے استحصال سے پاک معاشرہ تھا۔ اقبالؒ کو یہ صورت کہیں نظر نہ آئی۔ نہ مشرق میں نہ مغرب میں' نہ ممالک اسلامیہ میں نہ فرنگ میں۔ وہ ایسا جمہوری نظام چاہتا تھا جہاں استحصال نہ ہو' انسانیت کی قدر و توقیر ہو' جہاں حکمران علم و اخلاق کی بنا پر منتخب ہوں وہ شاہی میں فقیری کریں۔ ان کو کسی قسم کا کوئی تفوق حاصل نہ ہو۔

سروری در دین ما خدمتگری است
عدل فاروقی و فقر حیدری است
در ہجوم کار ہائے ملک و دیں
با دل خود یک نفس خلوت گزیں
آں مسلمانان کہ میری کردہ اند
در شہنشاہی فقیری کردہ اند
ہر کہ عشق مصطفےٰ سامان اوست
بحر و بر در گوشہ دامان اوست
روح را جز عشق او آرام نیست
عشق او روزیست کو را شام نیست

پیام مشرق' صفحہ 64

اقبالؒ نے بندہ حق کی جو تعریف کی ہے وہ یہ ہے:۔

بندۂ حق بے نیاز از ہر مقام
نے غلام او را نہ او کس را غلام

اس مقصد کا حصول شاہی و ملوکیت' آمریت و استبدا یا کسی اور نظام سیاسی میں موجود نہیں

ہے۔ سوائے جمہوریت کے جو سرمایہ داروں، جاگیرداروں نے تباہ برباد کر کے رکھ دی ہے۔

اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دار حیلہ گر
شاخ آھو پر رہی صدیوں تک تیری برات
دست دولت آفریں کو مزد یوں ملتی رہی
اہل ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکات
نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب، رنگ
خواجگی نے خوب چن چن کر بنائے مسکرات
مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار
انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات

* ○ *

مجلس آئین واصلاح و رعایات و حقوق
طب مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری
گرمی گفتار اعضائے مجالس الاماں
یہ بھی اک سرمایہ داروں کی ہے جنگ زرگری
اس سراب رنگ وبو کو گلستاں سمجھا ہے تو
آہ ! اے ناداں قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو

اس صورت حال سے مفر ناممکن تو پھر کیا جائے تو اس سے بہتر اور صحیح حل صرف یہ ہے کہ تعلیم کو عام کیا جائے سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے زور کو توڑا جائے اور مجالس آئین ساز میں نیک اور صالح انسانوں کو بھیجا جائے۔ لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ سرمایہ دار اس جنگ زرگری میں لوگوں کو خرید لیتے ہیں۔ یہاں تک کہ بڑے بڑے نیک اور پارسا لوگ بک جاتے ہیں۔ لیکن اس سے ناامید نہیں ہونا چاہیے۔ اگر قطرہ قطرہ پتھر کی سل کو توڑ سکتا ہے تو ہم انسان ہوتے ہوئے کامیاب کیوں نہ ہوں گے۔ ضرورت ہے کہ مخلصانہ اور ایماندارانہ کوشش جاری رکھی جائے اور حاجی سیف اللہ کا کردار ادا نہ کیا جائے۔

اقبال" پاکستان کو ایسی اسلامی ریاست بنانا چاہتے تھے جس میں سرمایہ داروں' جاگیرداروں' پیروں اور حکمرانوں کا استحصال نہ ہو۔ جہاں غریب اور مزدور کو عزت نفس اور انسانی وقار حاصل ہو۔ ان کے نزدیک پاکستان کا حصول خلافت راشدہ کے حصول کے ذریعہ تھا۔ وہ اس کے ذریعے مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کے خواہشمند تھے اور عرب ملوکیت نے جو اسلامی فکر کو گزند پہنچایا تھا اس کو دور کرنا چاہتے تھے۔ لیکن بدقسمتی یہ ہوئی کہ قیام پاکستان کے ساتھ ہی خالقین پاکستان رفتہ رفتہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے اور زمام حکومت ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں آگئی جو کسی صورت بھی اس کے اہل نہ تھے نہ فکری طور پر اور نہ سیاسی و اخلاقی وابستگی کی بنا پر۔ بلکہ یہ سب کے سب مفاد پرستوں کا ایک ٹولہ ثابت ہوا۔ اگر یہ ذات شریف اور کچھ بھی نہ کرتے اسلام سے ہی اپنے خلوص کا مظاہرہ کرتے تو ہمیں جمہوری انداز میں ایک محب وطن' مخلص اور قوم کی خیر خواہ قیادت تو میسر آچکی ہوتی۔ لیکن افسوس کہ ایسا کرنے کی سعی و کوشش کبھی نہ کی گئی۔

قائداعظمؒ اور دو قومی نظریہ

پاکستان کے قیام و بقاء کی بنیاد و اساس دو قومی نظریہ ہے۔ اسی کے بل بوتے پر قائد اعظم محمد علی جناحؒ نے جدوجہد پاکستان کا آغاز کیا۔ آج ملک عزیز میں مختلف قومیتوں' ان کے جدا جدا تہذیبی وثقافتی ورثہ کی باتیں کہیں دھیمے دھیمے اور کہیں زور و شور سے سنائی دے رہی ہیں جو ہر درد مند پاکستانی کے لئے بڑی درد انگیز اور دکھ سے لبریز ہیں۔ یہ کسی صورت بھی قوم و ملک کی وحدت و ترقی کے لئے مستحسن قرار نہیں دی جاسکتیں۔ ضرورت اس امر کی محسوس ہو رہی ہے کہ ہم اساس پاکستان کو سمجھنے اور اس پر غور و فکر کرنے کی سعی کریں۔ اس کی بنیادی حقیقتوں اور نظریاتی اساس کا از سر نو جائزہ لیں۔

قائد اعظم محمد علی جناحؒ نے جس دو قومی نظریہ کی اپنی جدوجہد آزادی کے دوران نشرواشاعت کی ہے وہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے۔ اس برصغیر میں ہندو اور مسلمان دو جدا قومیں مدتوں ایک جگہ آباد رہیں ہیں۔ جو ایک دوسرے سے مختلف' ممیز بلکہ متضاد ہیں اور مسلمانان ہند اپنے فروعی اختلافات کے باوجود ایک قوم رہے۔ اور یہی چیز تحریک پاکستان کا جواز بھی ہے۔ جس نے تمام مسلمانان ہند کو اس تحریک میں متحد رکھا اور وہ حصول پاکستان کے لئے ہر قسم کی قربانی دینے کو تیار ہو گئے۔ تاریخی لحاظ سے یہ دونوں قومیں ہندوستان میں تقریباً" ایک ہزار سال تک آباد رہیں۔ بعض اوقات عظیم مسلم فاتحین اس کو اپنے زیر نگیں بھی کر لیتے رہے جس پر تمام ہندیوں کے ایک قوم ہو جانے کا مغالطہ بھی ہو جاتا رہا۔ جس طرح انگریزوں نے اپنی عیاری و مکاری سے سارے ہندوستان پر قبضہ کر لیا۔ یہاں انگریزی زبان' بودوباش اور سیاسی نظام قائم کر کے اسے ایک متحدہ قوم بنانے کی ناکام کوشش بھی کی۔ انگریزی جمہوری

نظام میں ہندوؤں کو اکثریت میں ہونے کی بنا پر بڑا فائدہ ہوا۔ اور دوسری بڑی قوم مسلمان کو اقلیت میں ہونے کی بنا پر بہت نقصان برداشت کرنا پڑا۔ بلکہ ہندوؤں کو مسلمانوں پر حکمرانی کا حق بھی ملا رہا۔ اور انگریز کے چلے جانے کے بعد ہندوؤں کی اس حکمرانی کے امکانات زیادہ روشن بلکہ اور درخشاں تھے بلکہ یہ لگاتار مسلمانوں کی غلامی اور ہندوؤں کی حکمرانی تھی۔ اسی بنا پر وہ اکھنڈ بھارت کا نعرہ بلند کرنے لگے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد جب انگریزوں نے ہندوستان سے چلے جانے کا فیصلہ کیا تو مسلمان ایک نازک ترین صورت حال سے دوچار ہو گئے چونکہ انگریز اپنی جمہوری روایات کے تحت ہند کو غیر منقسم اور انہیں ہندوؤں کے زیر نگیں چھوڑ کر جانا چاہتے تھے۔ لیکن 1946ء کے المیہ بہار نے ان کو بھی باور کرا دیا کہ ہندو اور مسلمان دو الگ قومیں ہیں۔ اور اس مقام تک پہنچنے میں انگریز نے اپنے تعصب کی بنا پر بہت دیر کر دی۔ حالانکہ یہ ایک روشن حقیقت تھی جس کا ادراک 1905ء کی تقسیم بنگال سے ہی ہو سکتا تھا۔

دراصل دو قومی نظریہ کو عملی جامہ پہنانے کے لئے مسلمانان ہند نے اسی بنا پر 1906ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کی بنیاد رکھی اور چند مسلم زعماء نے سر آغا خان کی قیادت میں وائسرائے ہند لارڈ منٹو کے پاس شملہ جا کر ایک محضر نامہ پیش کیا جس پر 35 مسلم قائدین کے دستخط ثبت تھے۔ اس محضر نامہ میں وائسرائے کی توجہ اس نکتہ کی طرف مبذول کرائی گئی تھی کہ ہندوستان کے مسلمان تاریخی' ثقافتی' مذہبی' لسانی' معاشی و معاشرتی لحاظ سے ایک منفرد اہمیت کے حامل ہیں۔ اس لیے سرکار انگریزی جب ہندوستان میں جمہوری و سیاسی اصلاحات نافذ کرے تو مسلمانوں کے الگ تشخص کو پیش نظر رکھے۔ بھارت میں انگلستان' کینیڈا یا آسٹریلیا جیسے حالات نہیں ہیں۔ بلکہ یہاں مسلمان ایک الگ سیاسی و ملی اکائی ہیں۔

اس محضرنامے کے جواب میں وائسرائے نے اپنی تقریر میں جو الفاظ کہے وہ اس وقت کے لحاظ سے توقع سے زیادہ حوصلہ افزا تھے۔ انہوں نے نہایت واضح الفاظ میں مسلمانوں کے قومی تشخص کا اعتراف کیا۔ مسلمانوں کی عظیم تاریخی حیثیت کو تسلیم کرتے ہوئے وائسرائے نے کہا "سرکار برطانیہ جب بھی آئینی اصلاحات کرے گی تو مسلمانوں کی جماعتی اہمیت کا پورا پورا لحاظ رکھے گی۔ جو کہ مجموعی آبادی میں ان کے تناسب پر مبنی ہو گا۔ شملہ سے جب یہ وفد واپس

لوٹا تو جلد ہی ڈھاکہ میں مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا۔ اور علی گڑھ کو اس تنظیم کا صدر مقام مقرر کیا گیا۔

علی گڑھ سرسید احمد خان کے افکار و نظریات کا امین ہے۔ ہم سرسید کے بارے میں جانتے ہیں کہ انہوں نے اپنی 1883ء کی تقریر میں مسلمانوں کے لئے جداگانہ انتخابات کا مطالبہ کیا تھا۔ ہندوؤں کے ایک اہم رہنما سربندر ناتھ بینرجی خود سرسید احمد خان کے پاس گئے اور ان کے ذریعے مسلمانوں کو کانگریس میں شمولیت کی دعوت دی۔ جس کا نہ صرف انہوں نے انکار کیا بلکہ دیگر مسلمانوں کو بھی کانگریس میں شمولیت سے منع فرمایا چونکہ اس طرح سیاسی تنظیم میں شمولیت سے ان کے نزدیک مسلمانوں کا ملی تشخص مجروح ہو گا۔

ہندوستانی تاریخ نے کئی انقلابات دیکھے جن کی نظیر میں مسلمانوں نے محسوس کیا کہ اب ان کی اپنی تنظیم ہونی چاہیے۔ لہٰذا مسلم لیگ وجود میں آئی۔ اس نے وجود میں آنے سے لے کر 1947ء تک صرف چالیس سال میں مسلمانوں کے لئے الگ وطن حاصل کر لیا۔ جو تاریخ انسانی کی ایک عظیم ترین کامیابی ہے۔ لیکن اس تمام عرصہ میں مسلمانوں کی سیاست نہایت دشوار مراحل سے گزری۔ اس میں چند اہم موڑ بھی آئے اور خونچکاں داستانوں سے بھی صفحہ تاریخ کو رنگین کیا۔ اس عرصہ میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں اشتراک اور عدم اشتراک کے کئی ادوار بھی آئے۔ مسلم قائدین ایک ہی وقت میں کانگریس اور مسلم لیگ کے رکن بھی رہے۔ ان کے اجلاس بھی ایک جگہ اور ایک وقت میں ہوتے رہے۔ جس سے ان کو باہمی مشاورت اور رابطے کے مسلسل کئی مواقع بھی ملتے رہے۔ اسی کے نتیجہ میں ان میں معاہدہ لکھنؤ بھی ہوا۔ جس کے تحت کانگریس نے مسلمانوں کے جداگانہ انتخابات کے اصول کو تسلیم کر لیا اور مسلمانوں سے رعایت بھی لی۔ جس کی وجہ سے مسلمانوں کے دو بڑے صوبوں پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کی نشستیں کم بھی ہوئیں۔ اور ان کی اکثریت کو بے اثر بھی کر دیا گیا۔ اتنی بڑی قربانی کے باوجود ہندو پھر بھی رام نہ ہوئے ان کی ذہنیت اسی طرح قائم رہی۔

اس زمانہ میں جنگ عظیم اول زوروں پر تھی۔ جو 1918ء میں ختم ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی خلافت کے مسئلہ پر مسلمانوں کے احتجاج نے مسلم ریاست کو ایک نئے موڑ پر لا کھڑا کیا۔ معاہد لکھنؤ کے تحت مسلمان الگ طور پر بھی احتجاج کر سکتے تھے لیکن خلافتی لیڈر مسلمانوں کو

جوق در جوق کانگریس میں شامل کرنے لگے۔ اور گاندھی جیسے شاطر انسان کو اپنا لیڈر بنا لیا۔ انگریزوں کے خلاف ہندوؤں اور مسلمانوں کی ایک مشترک مہم کا آغاز ہوا۔ اس تحریک میں ترک موالات' ستیہ گرہ' اور سوراج کی تحریکوں نے سر اٹھایا۔ لیکن 1924ء میں کمال اتاترک کے خلافت کے ادارہ کو ختم کر دینے پر یہ تحریک ختم ہو گئی۔ اس کا عبرتناک نتیجہ ہندو مسلم فسادات' اور مسلم اتحاد کا فقدان نکلا۔ ہندوؤں کو اس سے دور رس فوائد حاصل ہوئے۔ کانگریس کی قوت میں اضافہ ہوا۔ اسے گاندھی جیسا شاطر لیڈر مل گیا۔ جس نے آئندہ کی مسلم سیاسی تحریک کو سبوتاژ کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ جس سے تحریک آزادی میں بہت خلل آیا۔ یہ صورت حال تقریباً" 1937ء تک رہی۔ جب کانگرسی وزارتیں وجود میں آگئیں اور ان کے ظلم و ستم کی وجہ سے مسلمانوں کو جان کے لالے پڑنے لگے۔

اس دور کے دو واقعات ایسے ہیں جنہوں نے جدوجہد آزادی میں دور رس نتائج مرتب کئے ان میں سے ایک علامہ اقبال" کا خطبہ الہ آباد اور دوسرا چوہدری رحمت علی کا شمال مغربی علاقے کو پاکستان کا نام دینا ہے۔ انگریزوں نے ہندوستان کے مسئلہ کو حل کرنے کے لئے گول میز کانفرنسوں کا انعقاد کیا۔ دسمبر 1930ء میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس الہ آباد میں ہوا۔ جس کی صدارت علامہ اقبال" نے کی۔ آپ نے اپنے خطبہ صدارت میں فرمایا:

"میری یہ خواہش ہے کہ پنجاب' شمال مغربی سرحد' صوبہ سندھ اور بلوچستان کو حق خودارادیت کے تحت ایک مسلم ریاست بنا دیا جائے۔ یہ ریاست خواہ تاج برطانیہ کے تحت ہو یا آزاد اسے اندرونی خودمختاری حاصل ہو۔"

ان خیالات نے مسلمانوں کو جو اب تک آئینی تحفظات کی بات کرتے تھے انہیں ہندوستان کے مسئلے کا ایک اور حل دے دیا جس پر غور و فکر ہونے لگی۔ اسی زمانہ میں چوہدری رحمت علی کیمرج میں زیر تعلیم تھے انہوں نے ایک پمفلٹ "اب یا کبھی نہیں" (Now or Never#) شائع کیا۔ جس میں تمام ہندوستان کو مختلف حصوں میں تقسیم کیا اور اس شمال مغربی ہندوستان کو "پاکستان" کا نام دیا گیا۔ گو اس وقت سیاسی قائدین نے اول الذکر کو "شاعرانہ خیال" اور آخرالذکر کو "طالب علم کی تجویز" قرار دیا۔ لیکن جب کانگریسی وزارتوں کی بنا پر یہاں کے مسلمانوں کی زندگی اجیرن ہو گئی تو انہوں نے ان لائنوں پر سوچنا شروع کر دیا۔ یہاں

تک کہ 23 مارچ 1940ء کو مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس لاہور میں قرارداد لاہور پاس کی گئی۔ جس کا مقصد مسلمانوں کے لئے الگ وطن کا حصول تھا۔

اگر ہم تاریخ عالم کا بغور مطالعہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ تمام دنیا کے سیاسی و معاشرتی حالات ایک دوسرے سے متاثر ہوتے ہیں مثال کے طور پر اگر مغرب میں ابتدا میں شہری ریاستیں تھیں تو ہندوستان میں بھی ہمیں شہری ریاستوں کا وجود ملتا ہے۔ اور یہ ریاستیں ہندو راجاؤں کی تھیں۔ سولویں صدی عیسوی میں مغرب میں حکومت کا حق ربانی (DIVINE RIGHT OF KING) عروج پر تھا تو ہندوستان میں اکبر بادشاہ "ظل سبحانی" بنا ہوا تھا۔ اس طرح جب یورپ جے ایس مل کے نظریہ حق خود ارادیت کے تحت تقسیم ہوا تو اس کا اثر ہندوستان پر پڑنا ضروری تھا۔ قائداعظم جو مغرب کے تعلیم یافتہ تھے انہوں نے اس نظریے کو اپناتے ہوئے انگریزوں اور ہندوؤں سے سیاسی جنگ لڑی۔ اب ضروری یہ تھا کہ ہندی مسلمانوں کو ایک قوم ثابت کیا جائے یہی وجہ ہے کہ آپ کا آئندہ کا تمام زور بیان اسی چیز کو ثابت کرنے پر ہے اور ہندو قائدین اپنا تمام زور اس حقیقت کو رد کرنے پر لگا رہے ہیں چنانچہ ہم قائداعظم کی آئندہ تمام تقریروں کو یہ حقیقت بیان کرتے ہوئے پاتے ہیں کہ مسلمانان ہند ایک قوم ہیں۔ ہم یہاں پر ان کی تقاریر میں سے چند اقتباسات پیش کرتے ہیں جن میں وہ اس حقیقت پر زور دیتے ہیں آپ نے فرمایا:

"قومیت کی تعریف چاہے جس طرح کی جائے مسلمان اس تعریف کی رو سے ایک الگ قوم کی حیثیت رکھتے ہیں اور اس لیے اس بات کے مستحق ہیں کہ ملک میں ان کی الگ مملکت اور اپنی جداگانہ خودمختار ریاست ہو ہم مسلمان چاہتے ہیں کہ ہندوستان کے اندر ہم ایک آزاد قوم بن کر اپنے ہمسایوں کے ساتھ ہم آہنگی، امن وامان کے ساتھ زندگی بسر کریں۔"

لاہور، 23 مارچ 1940ء

"ہم مسلمان اپنی تابندہ تہذیب اور تمدن کے لحاظ سے ایک قوم ہیں۔ زبان و ادب، فنون لطیفہ، فن تعمیر، نام و نسب، شعور اقدار و تناسب، قانون واخلاق، رسم ورواج، تاریخ و روایات اور رجحان و مقاصد ہر ایک لحاظ سے ہمارا اپنا انفرادی زاویہ نگاہ اور فلسفہ حیات ہے۔ بین الاقوامی قانون کی ہر تعریف ہماری قومیت کو سلامی دینے کے لئے تیار ہے۔

ایسوسی ایٹڈ پریس آف امریکہ کو بیان' یکم جولائی 1942ء

''وہ کونسا رشتہ ہے جس میں منسلک ہونے سے تمام مسلمان جسد واحد کی طرح ہیں' وہ کونسی چٹان ہے جس پر ان کی ملت کی عمارت استوار ہے' وہ کونسا لنگر ہے جس سے اس امت کی کشتی محفوظ کر دی گئی ہے؟ وہ رشتہ' وہ چٹان' وہ لنگر اللہ کی کتاب قرآن مجید ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جوں جوں ہم آگے بڑھتے جائیں گے ہم میں زیادہ سے زیادہ اتحاد پیدا ہوتا جائے گا۔ ایک خدا' ایک رسول'' ایک کتاب' ایک امت۔

اجلاس مسلم لیگ' کراچی 1943ء

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں طلباء سے 8 مارچ 1944ء کو نظریہ پاکستان پر تقریر کرتے ہوئے آپ نے فرمایا:

''آپ نے غور فرمایا کہ پاکستان کے مطالبے کا جذبہ محرک کیا تھا مسلمانوں کے لئے ایک جداگانہ مملکت کی وجہ جواز کیا تھی؟ تقسیم ہند کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ اس کی وجہ نہ ہندوؤں کی تنگ نظری ہے نہ انگریزوں کی چال۔ یہ اسلام کا بنیادی مطالبہ تھا۔''

آپ نے اسلامیہ کالج پشاور میں 13 جنوری 1948ء کو تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

''ہم نے پاکستان کا مطالبہ ایک زمین کا ٹکڑا حاصل کرنے کے لئے نہیں کیا تھا بلکہ ہم ایک ایسی تجربہ گاہ حاصل کرنا چاہتے تھے جہاں پر ہم اسلام کے اصولوں کو آزما سکیں۔''

اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ پاکستان بذات خود کوئی مقصد نہیں ہے بلکہ یہ کسی اور مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔ قائد اعظم پاکستان کو ایک ایسی ریاست بنانا چاہتے تھے جو جدید دور میں اسلامی فکر کی نمونہ کی ایک ریاست ہو۔ جو جدید دور کے تقاضوں کو بھی پورا کرتی ہو۔ اور جس سے اسلامی تعلیمات کی روح کو گزند بھی نہ پہنچتی ہو اس میں خلفاء راشدین کی سی رواداری' ہمدردی' اخوت اور انسان دوستی ہو۔ یہ نہ تو سرمایہ دارانہ نظام حیات کی آئینہ دار ہو اور نہ ہی اشتراکی بلکہ جمہوریت اور رواداری کی حامل ہوتے ہوئے قوم کے غرباء و مساکین کی دستگیر و دست نگر ہو۔ اس میں کسی انسان کی عزت نفس مجروح نہ ہو' یہ اپنی ذات میں تھیوکریسی یا ملازم کی علمبردار بھی نہ ہو اور نہ ہی جدید دور کی مادہ پرست اور لادین ہو۔ اس ضمن میں ہم ان کی تقاریر کے چند اقتصابات پیش کرنے کی جسارت کرتے ہیں۔

"اس میں شک نہیں کہ ہم نے پاکستان حاصل کر لیا ہے لیکن یہ تو محض آغاز ہے اب بڑی بڑی ذمہ داریاں ہمارے کندھوں پر آن پڑی ہیں اور جتنی بڑی ذمہ داریاں ہیں اتنا ہی بڑا ارادہ' اتنی ہی بڑی عظیم جدوجہد کا جذبہ ہم میں پیدا ہونا چاہیے۔ پاکستان حاصل کرنے کے لئے جو قربانیاں دی گئیں ہیں' جو کوششیں کی گئیں ہیں پاکستان کی تشکیل اور تعمیر کے لئے بھی کم از کم اتنی ہی قربانیوں اور کوششوں کی ضرورت پڑے گی۔ حقیقی معنوں میں ٹھوس کام کا وقت آن پہنچا ہے۔" پیغام یوم عید' 18 اگست 1947ء

آپ نے مقصد پاکستان کی وضاحت کرتے ہوئے حکومت پاکستان کے افسران کو 11 اکتوبر 1947ء کو تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

"جس پاکستان کے قیام کے لئے ہم نے گذشتہ دس برس جدوجہد کی ہے آج بفضل تعالیٰ ایک مسلمہ حقیقت بن چکا ہے مگر کسی قومی ریاست کو معرض وجود میں لانا مقصد بالذات نہیں ہو سکتا' بلکہ کسی مقصد کے حصول کے ذریعہ کا درجہ رکھتا ہے۔ ہمارا نصب العین یہ تھا کہ ہم کسی ایسی مملکت کی تخلیق کریں جہاں ہم آزاد انسانوں کی طرح رہ سکیں' جو ہماری تہذیب وتمدن کی روشنی میں پھلے پھولے اور جہاں معاشرتی انصاف کے اسلامی تصور کو پوری طرح پنپنے کا موقع ملے۔"

یہاں تخلیق پاکستان کے دو بڑے مقاصد بیان کئے گئے ہیں۔ ایک مسلم تہذیب و تمدن کا پھلنا پھولنا اور ترقی کرنا' دوسرا معاشرتی انصاف کی ترقی و ارتقاء۔ اسلام کا عدل اجتماعی بہت بڑا اصول ہے جس کا معاشرے میں انعقاد اسلامی تعلیمات میں توحید و رسالت کے بعد دوسرا نمبر ہے۔ اس کے بغیر اسلام کا تصور نامکمل اور بے اثر ہے اسی اصول کے تحت ایک اسلامی فلاحی ریاست وجود میں آتی ہے۔ قائداعظم کی سوچوں کے دھارے خلافت راشدہ اور حیات طیبہ سے پھوٹتے ہوئے نظر آتے ہیں اسی بنا پر آپ اسلامی آئین کے خواہاں ہیں جیسا کہ آپ نے فرمایا:

"پاکستان کا دستور ابھی بننا ہے اور یہ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی بنائے گی۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس دستور کی شکل و ہیئت کیا ہو گی۔ لیکن اتنا یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ جمہوری نوعیت کا ہو گا اور اسلام کے بنیادی اصولوں پر مشتمل۔ ان اصولوں کا اطلاق آج کی عملی زندگی

پر بھی اسی طرح ہو سکتا ہے جس طرح تیرہ سو سال پہلے ہوا تھا۔ اسلام اور اس کے نظریات سے ہم نے جمہوریت کا سبق سیکھا۔ اسلام نے ہمیں انسانی مساوات' انصاف اور ہر ایک سے رواداری کا سبق دیا ہے۔ ہم ان عظیم الشان روایات کے وارث اور امین ہیں۔ پاکستان کے آئندہ دستور کے معمار اور بانی کی حیثیت سے ہم اپنی ذمہ داریوں اور فرائض سے بخوبی آگاہ ہیں۔" امریکن نامہ نگار سے انٹرویو' فروری 1948ء

یہاں پر قائد اعظم کے نظریہ پاکستان اور موجودہ اسلامی جماعتوں کے نظریہ پاکستان میں ایک فرق نظر آتا ہے۔ ہمارے جدید اسلامی علماء یا قائدین اسلام کا نام لیتے ہیں جو قوانین کے اندر جکڑا ہوا ہے' وہ اپنی ہیئت میں ملوکانہ ہے۔ یہ وہ اسلام ہے جس کو بنی امیہ' بنو عباس اور بعد میں خلافت ترکیہ نے جاری رکھا جس میں بادشاہ اور اس کے حواری قانون خداوندی سے بالا تر ہیں۔ اسلام کی حدود و قیود کا نفاذ دیگر مسلمانوں پر ہوتا ہے یہ صرف یہ چاہتے قاضی عدالتیں قائم کر دی جائیں' حدود کا نفاذ ہو جائے' زکوٰۃ کا نفاذ ہو اور ہر قسم کا سود حرام ہو جائے اور ہمیں قاضی مقرر کر دیا جائے جس کا اظہار پاکستان کے شریعت بل سے ہوتا ہے۔ لیکن اسلام جو فلاحی ریاستیں قائم کر کے مسلمانوں کی قوت' مساوات' رواداری اور ہمدردی کے جذبات پیدا کرنا چاہتا ہے اس ضمن میں وہ منقار زیر پر ہیں۔ وہ جاگیرداری' سرمایہ پرستی اور دیگر مظالم جو دولت و ثروت کی وجہ سے غریب عوام پر ہوتے ہیں ان کے بارے میں نہیں بولتے۔ وہ مسلمانوں کو اسلام کے فیوض و برکات سے مستفید ہونے کا موقع دینے کو تیار نہیں ہیں وہ سعودی عرب کے اسلامی قوانین کی بات بڑی کھل کر کرتے ہیں اور اس کے گن گاتے ہیں۔ لیکن وہاں جو فلاحی ریاست قائم ہے جس سے ہر پیدا ہونے والا بچہ فیض یاب ہو رہا ہے اس کی بات نہیں کرتے بلکہ یہ آئین کے لحاظ سے جو عام مسلمانوں کو ووٹ کا حق حاصل ہے وہ بھی ان سے چھین لینا چاہتے ہیں۔ اسی وجہ سے وہ جمہوریت کے بھی خلاف ہیں اس کے برعکس قائد اعظم کے سامنے رسول خداؐ کی پوری حیات طیبہ ہے جس پر خلفاء راشدین نے عمل کر دکھایا اسی بنا پر آپ فرماتے ہیں:

"میرا ایمان ہے کہ ہماری نجات کا واحد ذریعہ اس سنہری اصولوں والے ضابطہ حیات پر عمل کرنے میں ہے جو ہمارے عظیم واضع قانون پیغمبر اسلام نے ہمارے لئے قائم کر رکھا ہے۔

ہمیں اپنی جمہوریت کی بنیادیں سچے اسلامی اصولوں اور تصورات پر رکھنی چاہیں۔

سبی دربار، بلوچستان' 14 فروری 1948ء

یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ علماء کرام نے قرآن مجید کی تمام وہ آیات جو "قل العفو"، حق محروم و مساکین اور غریب پروری کے ضمن میں آتی ہیں ان کو صاحب تقویٰ کے لئے مختص کر دیا ہے۔ امراء، سرمایہ دار اور جاگیردار انکی حدود سے باہر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں لوگوں پر ظلم کرتے ہوئے ذرا بھی احساس نہیں ہوتا ہمیں سب سے پہلے ان مظالم کی وجہ تخلیق کو ختم کرنا چاہیے اور وہ اسلامی اصولوں کے مطابق ہی ممکن ہے۔ ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ علماء کرام اللہ کی آیتوں پر تھوڑا مول نہ لیں۔ قائداعظمؒ نے اس مسئلے کے حل کے لئے خود فرمایا تھا:

"میں ضروری سمجھتا ہوں کہ زمین داروں اور سرمایہ داروں کو متنبہ کردوں۔ اس طبقے کی خوشحالی کی قیمت عوام نے ادا کی ہے۔ اس کا سہرا جس نظام کے سر ہے وہ انتہائی ظالمانہ اور شر انگیز ہے اور اس نے اپنے پروردہ عناصر کو اس حد تک خود غرض بنا دیا ہے کہ انہیں دلیل سے قائل نہیں کیا جاسکتا۔ اپنی مقصد بر آوری کے لئے عوام کا استحصال کرنے کی خوئے بد ان کے خون میں رچ گئی ہے۔ وہ اسلامی احکام کو بھول چکے ہیں' حرص وہوس نے سرمایہ داروں کو اتنا اندھا کر دیا ہے کہ وہ جلب منفعت کی خاطر دشمن کا آلہ کار بن جاتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ آج ہم اقتدار کی گدی پر متمکن نہیں آپ شہر سے باہر کسی جانب چلے جائیے میں نے دیہات میں جا کر خود دیکھا ہے کہ ہمارے عوام میں لاکھوں افراد ایسے ہیں جنہیں دن میں ایک وقت بھی پیٹ بھر کر کھانا نصیب نہیں ہوتا' کیا آپ اسے تہذیب اور ترقی کہیں گے؟ کیا یہی پاکستان کا مقصد ہے؟ کیا آپ نے سوچا کہ کروڑوں لوگوں کا استحصال کیا گیا ہے اور اب ان کے لئے دن میں ایک مرتبہ کھانا حاصل کرنا بھی ممکن نہیں رہا۔ اگر پاکستان کا حصول اس صورت حال میں تبدیلی نہیں لاسکتا تو پھر اسے حاصل نہ کرنا ہی بہتر سمجھتا ہوں اگر وہ (زمیندار اور سرمایہ دار) عقلمند ہیں تو وہ نئے حالات کے مطابق اپنے آپ کو ڈھال لیں گے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتے تو خدا ان کے حال پر رحم کرے' ہم ان کی کوئی مدد نہ کر سکیں گے۔"

اجلاس مسلم لیگ' دہلی' 24 مارچ 1943ء

یہ قائد اعظم کا نصف صدی پہلے کا تجزیہ ہے اب اس ظلم اور استحصال میں کئی ہزار گنا اضافہ ہو چکا ہے۔ یہاں تک کہ ملک عزیز ایک غریب ترین ملک ہے اور اس کے سرمایہ دار اور جاگیردار امیر ترین ہیں وہ اس وقت اربوں اور کھربوں ڈالر کی ملکیت کے مالک ہیں اور دوسری طرف پاکستان کا درمیانی طبقہ مٹ چکا ہے اور غریب مفلسی کی انتہا کو پہنچ چکے ہیں۔ خطرہ پیدا ہو رہا ہے کہ کہیں خونی انقلاب نہ آجائے چونکہ لاوہ پک چکا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ سرمایہ دار اور جاگیردار اپنا رویہ بدلیں اور محروم طبقے ک حقوق اسے واپس کریں کہیں ایسا نہ ہو کہ لوگ اپنے حقوق چھیننے کے لئے متحد ہو جائیں۔

بے شک قائد اعظم پاکستان کو ایک اسلامی جمہوری ملک بنانا چاہتے تھے ایسی جمہوری ریاست جس میں ہر قسم کا معاشی، معاشرتی، مذہبی، ثقافتی یا علمی استحصال نہ ہو اسی وجہ سے وہ ملا ازم یا تھیوکریسی کی مخالفت کرتے رہے ہیں۔

وہ غیر مسلموں کو واضح طور پر بتاتے ہیں کہ انہیں پاکستان میں کسی قسم کا مذہبی خطرہ نہیں ہو گا، بلکہ ان کا مذہب، عبادت گاہیں اور رسومات محفوظ و مامون رہیں گیں۔ انہیں کسی قسم کا خطرہ نہ ہو گا۔ آپ نے نئی دہلی میں 12 جولائی 1947ء کو پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

"پاکستان میں اقلیتوں کی پوری پوری حفاظت کی جائے گی خواہ وہ کسی بھی فرقے سے تعلق رکھتی ہوں۔ مذہب، عقیدہ اور ایمان پاکستان میں بالکل سلامت اور محفوظ رہے گا ان کی عبادت کی آزادی میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کی جائے گی۔ انکے مذہب، عقیدے، جان و مال اور ان کی ثقافت کا مناسب تحفظ ہو گا وہ بالحاظ رنگ و نسل ہر اعتبار سے پاکستان کے شہری ہوں گے۔"

کرپس مشن

قرار داد لاہور سے قبل قائد اعظمؒ کی طرف سے یہ مسلسل کوشش ہوتی رہی کہ ہندوستان کا مسئلہ آبرومندانہ طور پر حل ہو جائے اور مسلمانوں کو اپنی حدود میں رہتے ہوئے زندگی بسر کرنے کا موقع مل جائے۔ مگر کانگرس اپنی اکثریت کی بنا پر مسلمانوں سے رعونت اور حقارت کا سلوک روا رکھے ہوئے تھی۔ اس کے جواں سال قائد جواہر لال نہرو مسلمانوں کو غلام بنانے پر تلے ہوئے تھے جس کا فطرتی نتیجہ مسلمانوں کا کانگرس پر عدم اعتماد ہی ہو سکتا تھا۔ نیز جس فرعونیت کا کانگریسی وزارتوں نے اظہار کیا تھا اس نے بھی مسلمانوں کو سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے قرار داد لاہور کی صورت میں اس عدم اعتماد کا اعلان کر دیا۔ تو کانگریس نے مارچ 1940ء میں رام گڑھ میں اپنا سالانہ اجلاس منعقد کیا۔ جس میں قرار داد کے خلاف اقدامات کرنے کا اعلان کیا ایک تو قرار داد میں تقسیم ہند کی بات کو ہند کے قومی اتحاد کو پارہ پارہ کرنے کی کوشش قرار دیا گیا۔ نیز اس کی ہر سطح پر مخالفت کرنے کے عزم کا اظہار کیا۔ نیز مسلمانوں کو دھوکہ دینے کے لئے مولانا ابوالکلام آزاد کو کانگرس کا نیا صدر منتخب کر لیا گیا اور لوگوں کو باور کرانے کی کوشش کی گئی کہ کانگریس فرقہ وارانہ جماعت نہیں بلکہ ایک قومی جماعت ہے جو ہندوستان کے ہر طبقے کی نمائندگی کرتی ہے۔ اس دھوکہ کو مزید قوت فراہم کرنے کے لئے گاندھی جی نے یہاں تک کہہ دیا کہ اگر کانگرس ایک فرقہ پرست جماعت ہوتی تو ایک عالم دین کو اپنا صدر کیوں بناتی۔ چنانچہ جولائی 1940ء کو قائد اعظمؒ نے ابوالکلام سے یہ کہہ کر سیاسی گفتگو کرنے سے انکار کر دیا کہ آپ مسلم انڈیا کا اعتماد کھو چکے ہیں کیا آپ نہیں جانتے کہ غیر ممالک کو دھوکہ دینے کے لئے آپ کو کانگرس کا "شو بوائے" صدر بنایا گیا ہے۔ آپ نہ

مسلمانوں کے نمائندے ہیں نہ ہندوؤں کے۔ کانگرس محض ایک ہندو جماعت ہے۔"

سیاست ملیہ

اسی اجلاس میں کانگریس نے یہ بھی فیصلہ کیا کہ اب وہ درجہ نو آبادیات کی بجائے مکمل آزادی کے خواہاں ہیں۔ اس کے مطالبات تسلیم نہ کئے گئے تو وہ سول نافرمانی کی تحریک چلائے گی اس مہم کا آغاز کرنے کے لئے مناسب وقت مقرر کرنے کی ذمہ داری کانگرس کمیٹی اور مسٹر گاندھی پر عائد کردی گئی۔

اسی زمانہ میں جنگ میں برطانیہ کی پوزیشن سخت مخدوش ہو گئی پولینڈ' ہالینڈ' بلجیم' فرانس وغیرہ تمام ممالک جرمنوں کے سیلاب میں خش وخاشاک کی طرح بہہ چکے تھے۔ اب برطانیہ جرمنی کے مقابلے میں اکیلا رہ گیا تھا۔ ان حالات میں برطانیہ میں چیمبرلین کی وزارت توڑ دی گئی اور اس کی جگہ چرچل نے جنگی کابینہ تشکیل دی اس میں بطور وزیر ہند مسٹر ایمزے لئے گئے۔

مسٹر گاندھی چونکہ حکومت برطانیہ کو سول نافرمانی کی دھمکی دے چکے تھے اس لئے اب ان کے لئے ممکن نہ تھا کہ وہ انگریزوں سے بات چیت کر سکتے نہ ہی ان کی یہاں مہاتمائیت اور اندرونی روشنی کام کر سکتی تھی چنانچہ انہوں نے اب نیا چولا بدلا۔ ہندو لیڈروں کے ایماء پر جب جرمن طیارے لندن پر بم برسا رہے تھے تو انہوں نے بیان داغ دیا کہ برطانیہ کو چاہیے کہ وہ جرمنوں کا مقابلہ عدم تشدد سے کرے۔ اس پر فوراً" ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ہوا اور اعلان کر دیا گیا کہ گاندھی جی کا فلسفہ عدم تشدد کچھ اتنا اونچا ہے کہ کانگرس اس کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ لہٰذا انہیں کانگرس کی ذمہ داریوں سے سبکدوش کیا جاتا ہے۔ اب وہ اپنے طور پر جیسے مناسب سمجھیں کریں۔ گویا اس طریقے سے گاندھی جی کو آزاد چھوڑ دیا گیا کہ وہ مناسب سمجھیں تو وائسرائے سے بات چیت کر لیں۔

ادھر 27 جون 1940ء کو قائداعظمؒ نے وائسرائے سے ملاقات کی اور بعد میں تعاون کے لئے درج ذیل شرائط بھجوا دیں:۔

1- حکومت کوئی ایسا اعلان نہ کرے جو قرارداد لاہور کی روح کے منافی ہو۔

2- حکومت صاف صاف اعلان کرے کہ وہ کسی بھی دستوری تجویز کو مسلمانوں کی پیشگی

منظوری کے بغیر اختیار نہ کرے گی۔

3- مسلم لیگ کو بطور ایک فریق مساوی درجہ دیا جائے نیز صوبائی و مرکزی اختیار واقتدار میں برابر برابر حصہ دیا جائے۔

نیز مسلم لیگ نے تجویز کیا کہ عرصہ جنگ کے دوران عارضی طور پر تین اقدام لازمی ہیں۔

1- وائسرائے کونسل میں توسیع کرکے اس میں مزید اتنے مسلم نمائندے شامل کئے جائیں کہ اگر کانگرس اس میں شمولیت اختیار کرے تو ان کی تعداد ہندوؤں کے برابر ہو۔ ورنہ انہیں اضافی ارکان میں اکثریت حاصل ہو۔

2- گورنری راج کے صوبوں میں غیر سرکاری مشیر مقرر کئے جائیں اور ان میں اکثریت مسلمانوں کی۔

3- پندرہ ارکان پر مشتمل وائسرائے کی زیر صدارت ایک وار کونسل تشکیل دی جائے تاکہ وہ جنگ کے دوران دفاعی اور مالیاتی امور پر حکومت کو مشورے دے سکے۔

وائسرائے نے ان تجاویز کا 6 جولائی کو جواب دیا کہ وائسرائے کونسل میں توسیع ہو سکتی ہے مگر یہ ناممکن ہے کہ مسلمانوں کو ہندوؤں کے برابر حصہ دیا جائے۔ البتہ انہیں معقول نمائندگی ضرور ملے گی۔ کیونکہ حالات کی اصل ذمہ داری وائسرائے اور اس کی کونسل کی ہو گی۔ دوسرے کسی بھی پارٹی کو اپنے نمائندے نامزد کرنے کا اختیار نہیں ہو سکتا کہ یہ خود وزیر ہند کی صوابدید پر ہے۔ گورنری راج کے صوبوں میں غیر سرکاری مشیروں کی ضرورت نہیں۔ یعنی مسلم لیگ کی تجاویز مسترد کر دی گئیں۔

ادھر گاندھی جی آزاد ہو کر وائسرائے سے بات چیت کرنے میں مصروف ہو گئے۔ نیز کانگرس حکومتی کاروبار سے لاتعلق ہو کر سخت پریشان تھی۔ وہ حکومت کے نزدیک آنا چاہتی تھی۔ گاندھی جی کو جب علم ہوا کہ حکومت بعد از جنگ ہندوستان کو نوآبادیاتی درجہ دینے کے بارے میں غور کر رہی ہے تو اس نے حکومت سے تعاون کے لئے یہ شرط بھیج دی:۔

"مرکز میں مرکزی اسمبلی کے سامنے جوابدہ ایک عارضی قومی حکومت تشکیل دی جائے۔"

گویا گاندھی جی جو قومی حکومت کے روپ میں پورے ہندوستان پر حکومت کرنا چاہتے تھے

اور وہ گل جو صوبائی حکومتوں کے روپ میں صوبوں میں کھلائے تھے وہ پورے ہندوستان میں کھلانا چاہتے تھے۔

قائد اعظمؒ اور گاندھی جی کی وائسرائے کے ساتھ ملاقاتوں کا سلسلہ کافی سود مند ثابت ہوا۔ 8 اگست کو اعلان کیا گیا "دستور کی ترتیب نو میں اقلیتوں کے مفادات کو بالکل نظرانداز نہیں کیا جائے گا۔ اور کسی بھی ایسے ادارے کو اقتدار منتقل نہیں کیا جائے گا جس کے اختیار سے ہندوستان کی قومی زندگی کے بڑے اجزائے ترکیبی انکار کرتے ہوں۔ دوسرے عوامی مطالبے کے پیش نظر نئی دستوری سکیم کے لئے خود ہندوستان پر مشتمل آئین ساز اسمبلی تشکیل دی جائے گی جس میں ہندوستانی زندگی کے تمام بڑے اجزا موجود ہوں۔ بشرطیکہ وہ اسمبلی ہندوستان کے بارے میں برطانیہ کی تمام ذمہ داریوں کو پورا کر سکے۔ لیکن یہ ادارہ جنگ کے بعد قائم کیا جائے گا۔ اور جنگ میں ہندوستان کے تمام گروہوں کو حکومت سے پورا تعاون کرنا ہو گا۔ یہ شرائط پورا ہونے سے ہندوستان دولت مشترکہ کا رکن ملک بن سکتا ہے۔"

ہنگامی ضرورت کے لئے وائسرائے کی ایگزیکٹو کمیٹی کونسل میں توسیع اور ایک دفاعی مشاورتی کونسل کے قیام کا اعلان بھی کیا گیا۔

اس اعلان سے یہ واضح ہو گیا کہ اب حکومت کانگرس کو منتقل نہیں ہو گی بلکہ اس میں مختلف عناصر کی نمائندگی ہو گی۔

مسلم لیگ کے لئے یہ اعلان امید افزا تھا کہ اب حکومت صرف کانگرس کو منتقل نہ ہو گی لیکن جس قومی زندگی میں اقلیتوں کے حقوق کا اعلان کیا گیا تھا اس سے مسلم لیگ کے مقاصد کو زد پہنچی تھی چونکہ ہندوستانی مسلمان اقلیت نہیں تھے بلکہ ایک قوم تھے۔ نیز ہندوستان کبھی ایک قوم رہا ہی نہیں تھا لہٰذا قومی زندگی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بہرحال اس کے چند دن بعد 14 اگست کو وائسرائے نے یہ اعلان کر کے مسلمانوں کو مطمئن کر دیا:

"وزیر ہند نے کہا ہے ہندوستان اس مفہوم میں وحدانی ریاست نہیں ہو سکتا جس مفہوم میں ہم اس کے اندر ہیں۔ ہندوستان کے مستقبل کا ایوان اس قدر وسیع ہے کہ اس میں کئی ایک محل ہو سکتے ہیں۔"

اس بیان میں مسلمانوں کے لئے الگ بیان کی گنجائش موجود تھی لیکن عارضی حکومت

کے بارے میں مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی نے یہ کہہ کر مسترد کر دیا:

1- وائسرائے کونسل میں اضافی ارکان کی تعداد کے بارے میں لیگ کمیٹی یا اس کے صدر سے کوئی مشورہ نہیں لیا گیا۔

2- لیگ کمیٹی کو یہ نہیں بتایا گیا کہ کونسل کی تشکیل کیسے ہوگی۔

3- اس میں کون کونسی پارٹیوں کو لیگ کے ساتھ تعاون کرنا ہوگا۔

4- کونسل میں عہدوں کی تقسیم کیسے ہوگی۔

5- وار کونسل کی تفصیلات مہیا نہیں کی گئیں۔

تاہم کمیٹی نے قائداعظمؒ کو ان تمام امور کے بارے میں وائسرائے سے تفصیلات حاصل کرنے کا اختیار دے دیا۔ 24 ستمبر کو قائداعظمؒ وائسرائے سے ملے جس نے اگلے روز مطلوبہ امور کی وضاحت روانہ کر دی کمیٹی نے اس کو غیر تسلی بخش قرار دیا اور پوری پیش کش کو مجموعی طور پر مسترد کر دیا۔

8 اگست کی پیش کش کو کانگرس نے ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا اور مسترد کر دیا نیز سخت اقدام کرنے کی دھمکی بھی دی۔

چنانچہ یہ پیش کش بالکل رائیگاں گئی۔ 27 ستمبر 1942ء کو گاندھی پھر وائسرائے سے ملے۔ لیکن پھر ناکام رہے چونکہ وائسرائے ان کے دام میں نہ آسکا۔ 13 اکتوبر کو واردھا میں کانگرس ورکنگ کمیٹی نے سول نافرمانی کی تحریک چلانے کا فیصلہ کیا لیکن اب کی بار گاندھی جی کے حکم پر اس سول نافرمانی کو "انفرادی" اور "نمائندہ ستیہ گری" کہا گیا اور انفرادی طور پر لوگوں نے اپنے آپ کو قید کے لئے پیش کیا۔ سال کے آخر تک چند سو آدمی گرفتار ہوئے۔ مسلمانوں نے اس میں قطعاً حصہ نہ لیا۔ اپریل 1941ء کو اس نافرمانی کو عام کر دیا گیا لیکن پورے ہندوستان سے صرف بیس ہزار آدمیوں نے گرفتاری پیش کی۔ اور اکتوبر 1941 تک صرف پانچ ہزار چھ سو رہ گئے۔ اور تحریک بری طرح ناکام ہوئی۔ انگریزوں کو بھی یہ علم ہو گیا کہ ہندوستان میں ہر تحریک کی روح رواں مسلمان ہیں ان کے بغیر ہندوؤں میں کوئی قوت نہیں ہے۔

ڈیفنس کونسل کا قیام

1941ء کے وسط تک برطانیہ کی جنگی حالت بڑی خراب ہو گئی اور برطانیہ کو ہندوستان کا

اعتماد اور تعاون حاصل کرنے کے لئے پھر آگے بڑھنا پڑا۔ چنانچہ 2 جولائی کو وائسرائے نے گورنر بمبئی کے ذریعے قائداعظمؒ کو لکھا کہ وائسرائے کونسل میں توسیع کی جارہی ہے اس میں مسلم نمائندوں کے طور پر سر اکبر حیدری اور سر فیروز خان نون کو شامل کیا جارہا ہے۔ دوسرے وار کونسل بھی تشکیل دی جارہی ہے جس کے کل تیس ارکان ہوں گے۔ ان میں ریاستوں کے نمائندے ہوں گے۔ مسلم ارکان میں سے پنجاب' بنگال' آسام اور سندھ کے وزرائے اعلیٰ کے علاوہ سر محمد عثمان کو لیا جارہا ہے۔ نیز یہ کہ ان لوگوں نے اپنی شرکت کی رضامندی ظاہر کر دی ہے۔ آپ کے لئے یہ بڑی عجیب بات تھی۔ آپ نے وائسرائے کی تجویز سے اتفاق نہ کیا نیز وائسرائے نے اس کا باقاعدہ اعلان کر دیا۔

آپ نے تمام ارکان کو جواب طلبی کا نوٹس دے دیا نیز ان کے جوابات پر غور کرنے کے لئے 24 اگست کو ورکنگ کمیٹی کا اجلاس طلب کیا۔

پنجاب کے وزیر اعلیٰ سر سکندر کو جب نوٹس ملا تو وہ اپنی پارٹی کے 73 ارکان اسمبلی کے استعفے لے کر بمبئی پہنچ گئے۔ لیکن وہاں پہنچ کر لیگ کی پالیسی کے قائل ہو گئے۔ اور ڈیفنس کونسل سے استعفیٰ دے دیا۔ سر سعداللہ' وزیر اعلیٰ آسام' بھی مستعفی ہو گئے۔ بنگال کے مولوی عبدالحق نے وار کونسل سے استعفیٰ تو دے دیا ساتھ لیگ سے بھی الگ ہو گئے اور لیگ کے بغیر حکومت بنالی۔ وہ 1942ء تک وزیر اعلیٰ رہے اس کے بعد خواجہ ناظم الدین لیگ کے وزیر اعلیٰ مقرر ہوئے۔ پھر 1947ء تک انہیں وزارت نہ ملی۔ ڈیفنس کونسل میں بیگم سر شاہ نواز اور نواب چھتاری بھی شامل تھے۔ نواب چھتاری تو حیدر آباد چلے گئے مگر بیگم سر شاہ نواز نے مستعفی ہونے سے انکار کر دیا تو انہیں پانچ سال کے لئے لیگ سے نکال دیا گیا۔ یہی حال سر سلطان احمد کا ہوا جو سر ظفراللہ کی جگہ وائسرائے کونسل میں گئے تھے۔

اس واقعہ نے مسلم لیگ کی حیثیت کو اور مستحکم کر دیا اور یہ چیز اس امر کی علامت بن گئی کہ مسلم لیگ عوام میں بہت مقبول ہو چکی ہے۔

کرپس تجاویز

انگریز جنگ میں بری طرح پٹ رہے تھے۔ رومیل افریقہ میں سویز کی طرف بڑھ رہا تھا'

جرمنی روس پر حملہ آور ہو چکا تھا۔ برطانیہ اور فرانس نے عراق، فلسطین اور شام کو اپنی ڈیفنس لائن بنا لیا تھا۔ نیز وہ روس کی مدد سے ایران پر قابض ہو گئے اس طرح جنگ ہندوستان کی مغربی سرحد پر پہنچا ہی چلی تھی۔ دوسری طرف جاپان نے حملہ کر کے امریکی بحری بیڑے کو تباہ کر دیا تھا اور اس نے اپنے حملوں میں اس قدر تیزی پیدا کی کہ وہ ملایا، فلپائن، کوریا، ہند چینی، انڈونیشیا اور برما پر قبضہ کرتے ہوئے رنگون پہنچ گیا۔ سوبھاس چندر بوس فرار ہو کر جرمنی جا پہنچے۔ اس طرح جنگ ہندوستان میں داخل ہونے والی تھی۔ اس بنا پر ہندوستانیوں کو اپنے اعتماد میں لینا انتہائی ضروری ہو چکا تھا۔ چرچل نے رنگون کے چلے جانے کے تین دن بعد یعنی گیارہ مارچ کو اعلان کیا کہ نئی تجاویز کے ساتھ سر سٹیفورڈ کرپس کو ہندوستان بھیجا جا رہا ہے۔ کرپس 22 مارچ 1942ء کو ہندوستان پہنچا اس نے چند دن یہاں کے سیاسی قائدین سے ملاقاتوں میں گزارے اور 29 مارچ 1942ء کو اپنے فارمولے کا اعلان کر دیا۔ یہ فارمولا دو حصوں میں تھا۔ پہلا حصہ وائسرائے کی کونسل کے بارے میں تھا جس میں سوائے وزیر جنگ دیگر تمام ممبران ہندوستانی ہوں گے۔ دوسرا حصہ مستقبل کے آئینی ڈھانچے کے بارے میں تھا اس میں تجویز کیا گیا:

1- جنگ کے بعد ہندوستان کو نوآبادیاتی درجہ دے کر آزاد کر دیا جائے گا۔ وہ داخلی اور خارجی امور میں آزاد ہو گا اسے یہ بھی آزادی ہو گی کہ وہ چاہے تو دولت مشترکہ کا ممبر رہے یا نہ رہے۔

2- آئین ساز مجلس کا قیام عمل میں لایا جائے گا جو ایک وفاقی آئین تیار کرے گی جس میں اقلیتوں کو پورا پورا تحفظ حاصل ہو گا۔

3- وفاقی حکومت میں شامل صوبوں کو یہ اختیار حاصل ہو گا کہ چاہیں تو اس میں شامل رہیں، چاہیں تو اس سے الگ ہو کر اپنی علیحدہ یونین یا وفاق قائم کر لیں۔

ان تجاویز پر کرپس نے کانگریسی لیڈروں سے طویل مذاکرات کئے یہاں تک کہ قائداعظم نے اس پر اعتراض کیا کہ ان تجاویز کے پیش کرنے میں دیگر پارٹیوں کو مکمل طور پر نظرانداز کیا گیا ہے۔ کانگریس کی اتنی دلجوئی ہونے کے باوجود کانگرس نے ان تجاویز کو مسترد کر دیا کیونکہ اس کے خیال میں صوبوں کی علیحدگی کے اصول کو تسلیم کرنے سے ہندوستان کی وحدت ختم ہو کر رہ جائے گی۔ بالواسطہ مسلم لیگ کے تقسیم ملک کے مطالبے کو تسلیم کر لیا گیا مزید اس نے

یہ مطالبہ کیا کہ وائسرائے کونسل میں توسیع کی بجائے اکثریتی پارٹی کے اصول پر باقاعدہ وزارتیں قائم کی جائیں جو مکمل طور پر آزاد اور خودمختار ہوں۔ اس میں وزارت جنگ بھی شامل ہو۔ حقیقت میں کانگرس انگریزوں کی مجبوری سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہتی تھی گاندھی نے ان تجاویز پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا:

"یہ دیوالیہ ہونے والے بینک کا ایسا چیک ہے جس پر آئندہ کی تاریخ ڈال دی گئی ہے"

مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی نے ان تجاویز کو اپنی وجوہات کی بنا پر مسترد کر دیا اور اپنی قرارداد میں بتایا اگرچہ صوبوں کو وفاقی حکومت سے علیحدگی اختیار کرنے کے اصول میں مطالبہ پاکستان کو بالواسطہ تسلیم کر لیا گیا ہے لیکن مسلم لیگ کا حتمی فیصلہ یہی ہے کہ ہندوستان کے آئینی مسئلے کا واحد حل یہ ہے کہ ملک کو تقسیم کر دیا جائے اور مسلمانوں کو کسی بھی ایسی آئین سازی میں شریک ہونے پر مجبور نہ کیا جائے جو ایک ہندوستانی وفاق کو جنم دے۔ اس طرح کرپس تجاویز مسترد ہو گئیں اور وہ واپس انگلستان چلا گیا۔

راج گوپال اچاریہ فارمولا

کانگرس نے کرپس مشن کا منصوبہ مسترد کر دیا تو کانگرس کے ایک اہم لیڈر راج گوپال اچاریہ جو مدراس کے وزیر اعلیٰ بھی تھے' نے کانگرس کی پالیسی کو غیر دانشمندانہ قرار دیتے ہوئے اس سے اختلاف کیا۔ انہوں نے کہا یہ کونسی دانشمندی ہے کہ جنگ ہندوستان کے دروازوں پر دستک دے رہی ہے اور ہندوستان جنگ میں حصہ نہ لے۔ نیز مسلم لیگ کے مطالبات کو نظر انداز کر کے کوئی بھی قومی حکومت قائم نہیں کی جا سکتی۔ لہٰذا کانگرس کو چاہیے کہ وہ مسلم لیگ کے ساتھ پاکستان تک کے سوال پر سمجھوتہ کرے۔ ان خیالات کے زیر اثر اس نے سب سے پہلے صوبہ مدراس کی معطل شدہ ارکان اسمبلی کو اپنے موقف کا قائل کیا۔ اس کے بعد 23 اپریل 1942ء کو دو قرار دادیں منظور کرائیں۔ ایک یہ کہ کانگرس مسلم لیگ کا مطالبہ تقسیم ملک منظور کر کے قومی حکومت کے قیام کے لئے کوشش کرے دوسری یہ کہ صوبہ مدراس کی اسمبلی اور وزارت کو بحال کیا جائے اور مسلم لیگ ک وزارت میں شامل کیا جائے۔

29 اپریل 1942ء کو کانگرس کمیٹی نے یہ تجاویز پندرہ کے مقابلے میں ایک سو بیس آراء سے مسترد کر دیں کہ ملک کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کی تجویز سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے نتیجے میں راجا جی کانگرس کی مجلس عاملہ اور اسمبلی کی نشست سے مستعفی ہو گئے اور اپنی مصالحانہ کوششوں میں مصروف ہو گئے۔ دیگر ارکان نے بھی ان کا ساتھ دیا۔ ''ہندوستان چھوڑ دو'' تحریک کے صلے میں جب تمام کانگرسی لیڈروں کو قید کر لیا گیا تو بھی راجہ جی نے ہمت نہ ہاری وہ اس سلسلے میں قائد اعظمؒ سے بار بار ملے ان ملاقاتوں کے درمیان انہیں محسوس ہوا کہ مصالحت کا امکان موجود ہے وہ 12 نومبر کو وائسرائے سے ملے اور گاندھی جی سے ملنے کی

اجازت چاہی مگر وائسرائے نے انکار کر دیا۔

10 فروری 1943 کو گاندھی جی نے جیل میں مرن بھرت رکھ لیا جس کی وجہ سے ان کی حالت نازک ہو گئی مگر حکومت پر کچھ اثر نہ ہوا اور اس نے گاندھی جی کو رہا نہ کیا۔ البتہ بعض لوگوں کو ان سے ملنے کی اجازت مل گئی جس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے راجہ جی بھی گاندھی سے ملے اور انہیں اپنا فارمولا دکھایا اور اس پر ان کی منظوری حاصل کر لی اس پر راجہ جی نے 8 اپریل 1943ء کو قائداعظم کو لکھا کہ گاندھی جی اس فارمولے کو منظور کر چکے ہیں۔ ملاقات پر پابندیوں کی بنا پر وہ خود آپ سے ملاقات نہیں کر سکتے لہٰذا انہوں نے مجھے آپ سے گفتگو کرنے کا اختیار دیا ہے اس فارمولے پر پوری طرح غور کرنے کے بعد امید ہے آپ اسے منظور کر لیں گے' قائداعظم اس پر خاموش رہے۔ 24 اپریل کو مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی میں آپ نے کہا کہ اگر گاندھی جی کے خیالات میں تبدیلی آئی ہے تو وہ مجھے براہ راست لکھیں حکومت ایسے خط کو نہیں روکے گی اس کے جواب میں گاندھی نے صرف اتنا لکھا "میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں"

یہ ایک نہایت مبہم بات تھی۔ 30 جون کو راجہ جی نے پھر بات چیت کا سلسلہ شروع کیا' 20 جولائی کو قائداعظم نے ان کو جواب دیا۔ "اگرچہ آپ نے اپنے فارمولے میں کسی ترمیم کی اجازت نہیں دی تھی اس کے باوجود میں نے اسے لیگ ورکنگ کمیٹی میں پیش کرنے کے لئے رضامندی کا اظہار کیا۔ لیکن آپ نے ایسا کرنے کی بھی اجازت نہ دی۔ اگر اب بھی گاندھی جی مجھے کوئی تجویز براہ راست بھیجیں تو ورکنگ کمیٹی میں پیش کرنے کو تیار ہوں"۔ اس پر بات چیت ختم ہو گئی۔

راجہ جی نے یہ خط و کتابت پریس کو دے دی جس پر ہندو پریس قائداعظم پر برس پڑا کہ یہ مغرور ہو گئے ہیں سمجھوتا نہیں چاہتے ہیں۔

فارمولا

اس فارمولے کی درج ذیل مدات تھیں:۔

1- مسلم لیگ آزادی ہند کا مطالبہ کرے گی اور عبوری حکومت قائم کرنے میں کانگرس کے

ساتھ تعاون کرے گی۔

2- خاتمہ جنگ کے بعد شمالی اور مشرقی ہند میں مسلم مطلق اکثریت کے اضلاع کی حد بندی کے لئے ایک کمیشن مقرر کیا جائے گا ایسے علاقوں میں بالغ رائے دہی یا کسی اور قابل عمل طریقے سے استصواب کیا جائے گا کہ وہ باشندے ہندوستان سے علیحدگی چاہتے ہیں یا نہیں' ان کا فیصلہ آخری ہو گا۔

3- تمام پارٹیوں کو ایسے علاقوں میں استصواب رائے سے قبل اپنے خیالات کی تبلیغ کا حق ہو گا۔

4- علیحدگی کی صورت میں دونوں ریاستوں کے درمیان دفاع' تجارت' مواصلات اور دوسرے مقاصد کے تحفظ کے لئے باہمی معاہدہ ہو گا۔

5- آبادیوں کا انتقال برضا و رغبت ہو گا۔

6- ان شرائط کی پابندی صرف اسی صورت میں ہو گی کہ حکومت برطانیہ ہندوستان کو مکمل اختیار حکومت دے دے۔

تبصرہ

یہ فارمولا اپنے اندر بے شمار ابہام رکھتا ہے' مثلاً" عبوری حکومت میں کانگرس اور مسلم لیگ کا تناسب کیا ہو گا اور یہ عبوری حکومت کس دستور کے تحت عمل میں آئے گی اور کام کرے گی۔ یہ کمیشن کون مقرر کرے گا اور یہ کس کے سامنے جواب دہ ہو گا۔ استصواب کون کرائے گا۔اس فارمولے پر عمل کون کرائے گا اگر حکومت نہ مانے تو اس کا کیا بنے گا۔ مسلم اکثریتی علاقوں میں ہندو لیڈروں کی تبلیغ کا کیا مطلب ہے۔ شق نمبر 6 سے واضح ہے کہ یہ دونوں ریاستیں خود مختار نہ ہوں ان کے اندر ایک کنفڈریشن قائم ہو گی۔اس فارمولے کے خالق کی ذاتی حیثیت کیا تھی جب کہ وہ کانگرس کا رکن بھی نہ تھا۔ مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی سے مشورہ لینے پر قدغن کیوں لگائی گئی تھی۔

در اصل یہ پورا فارمولا ایک سراب اور دھوکہ تھا' مقصد صرف یہ تھا کہ مسلم لیگ کانگرس کی "ہندوستان چھوڑ دو" تحریک کا حصہ بنے اور انگریزوں کو مجبور کیا جائے کہ وہ

ہندوستان کو آزادی دے کر چلے جائیں۔ آخری شرط نے اس تمام فارمولے کو اپنے اندر سمیٹا ہوا ہے۔

کانگرس کی ہندوستان چھوڑدو تحریک

ہندوستان میں اس وقت چانکیائی اور میکیاولی ذہن آپس میں برسرپیکار تھے۔ انگریز جنگ میں بری طرح پھنسا ہوا ہے وہ اس موقع پر اپنے تمام دشمنوں اور دوستوں کو اپنے نزدیک لانے کی پوری پوری کوشش کر رہا ہے جب کہ ہندو کا چانکیائی ذہن مصیبت میں پھنسے ہوئے دشمن پر زیادہ سے زیادہ ضربیں لگانے کے لئے کوشاں ہے اور اس کی مجبوری سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔ کانگرس نے اعلان کر رکھا تھا "چونکہ جاپان ہندوستان کے لئے خطرہ بن رہا ہے اس لئے بہتر یہی ہے کہ انگریز ہندوستان کو اصل مالکوں کے حوالے کر دیں ورنہ ابوالکلام آزاد' صدر کانگرس کے الفاظ میں کانگرس مناسب اقدام کرے گی۔" کانگرس کا یہ فیصلہ "ہندوستان چھوڑدو" تحریک کی اساس بنا۔ گویا کانگرس کی طرف سے کرپس مشن کو یہ جواب تھا۔

7 اگست 1946ء کو کانگرس نے جو قرارداد پاس کی وہ یہ تھی:

"اس ملک سے برطانوی حکومت کا خاتمہ نہایت اہم اور عجلت طلب مسئلہ ہے اسی پر جنگ کے مستقبل اور جمہوریت و آزادی کی کامیابی کا دارومدار ہے لہٰذا آل انڈیا کانگرس کمیٹی پورے شدومد سے اس مطالبے کا اعادہ کرتی ہے کہ ہندوستان سے برطانوی اقتدار ہٹا لیا جائے ، کمیٹی طے کرتی ہے کہ ہندوستان کے غیر منفق حق آزادی و خودمختاری کے استقرار کے لئے غیر متشددانہ نہج پر اور وسیع تر پیمانے پر ایک عام جدوجہد شروع کی جائے تاکہ ملک اس تمام انسانی قوت کو بروئے کار لا سکے جو اس نے گزشتہ بائیس سال کی پرامن جدوجہد میں مجتمع کی ہے اس قسم کی مہم کا گاندھی جی کی زیر قیادت ہونا بالکل ناگزیر ہے اور یہ کمیٹی ان سے قیادت کی نیز ضروری اقدامات میں قوم کی راہنمائی کی درخواست کرتی ہے۔"

کانگرس اور گاندھی جی کا خیال یہ تھا کہ ایسے گھمبیر حالات میں برطانیہ کانگرس کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو جائے گا اور کانگرس کو حکومت بنانے کی کھلی چھٹی دے دے گا۔ وہ اس حقیقت کو فراموش کر گئے کہ جنگ میں اہم کردار اس وقت مسلم فوجیں ادا کر رہی ہیں۔ ہندو تو جرمنوں اور جاپانیوں کو دور ہی سے دیکھ کر بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔ لہٰذا انگریز مسلمانوں کے مفادات کو کبھی نظرانداز نہ کر سکتا تھا اس لئے برطانوی حکومت نے اس تحریک کو بغاوت قرار دیا اور 19 اگست کو گاندھی جی سمیت پوری ورکنگ کمیٹی کو گرفتار کر لیا گیا۔ کانگرس اور اس کی کمیٹیوں کو خلاف قانون قرار دے دیا گیا۔ گاندھی جی نے جیل جاتے ہوئے پیغام دیا کرو یا مرو (Do Or Die)۔ اس وجہ سے وسیع پیمانے پر تشدد کے واقعات رونما ہوئے۔ ریلوے' ڈاک خانوں' تار و ٹیلیفون کے نظام اور پولیس تھانوں پر حملے کیے گئے۔ نومبر کے آخر تک 940 افراد ہلاک اور ایک کروڑ 53 لاکھ کی جائیداد و املاک تباہ برباد ہوئی۔ تاہم برطانوی حکومت نے اس تحریک کو سختی سے کچل دیا۔

مسلمانان ہند نے اس کے خلاف سخت رد عمل کیا اسے ہندوؤں کی بلیک میلنگ اور بنیا پن کہا مسلم لیگ نے اپنے اجلاس میں یہ قرارداد پاس کی "یہ تحریک صرف اس لئے شروع کی گئی ہے کہ برطانوی حکومت کو دبا کر اس بات پر مجبور کیا جائے کہ حکومت اعلیٰ طبقے کے ہندوؤں کے حوالے کر دے اور اس طرح انہیں مسلمانوں اور ہندوستان کے دوسرے طبقات کے سے وقتاً" فوقتاً" کیے گئے وعدوں کو پورا کرنے کے قابل نہ رہنے دے۔ بلکہ اس لئے بھی شروع کی گئی کہ مسلمانوں کو کانگرس کے سامنے ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا جائے..... اس قرارداد میں واضح کیا گیا کہ کانگرس جب ہندوستان کے لئے آزادی کا مطالبہ کرتی ہے تو اس کا مطلب صرف یہ ہوتا ہے کہ کانگرس کو تمام اختیارات سونپ دیئے جائیں۔ وہ مسلمان قوم کو حق خود ارادیت دینے اور انہیں اپنے مستقبل کا فیصلہ خود کرنے کا حق دینے کو تیار نہیں۔ مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی نے اس بات کا برملا اظہار کیا "مسلمان قوم ملک کی آزادی کے لئے دوسری قوموں سے ذرا برابر بھی کم خواہاں نہیں لیکن کانگرس کی موجودہ تحریک ان تمام عناصر کی آزادی کے لئے نہیں ہے جس سے یہ ملک عبارت ہے بلکہ اس لئے ہے کہ ہندو راج قائم کیا جائے اور مسلمانوں کے نصب العین پر کاری ضرب لگائی جائے۔" ہسٹارک ڈاکومنٹس از جمیل

الدین احمد' صفحہ 431-430

قائداعظم نے اکتیس جولائی کو کانگرس کے ان فیصلوں کا سختی سے نوٹس لیا اور اسے نہایت مکروہ قسم کی بلیک میلنگ قرار دیا۔ انہوں نے کہا کہ یہ دراصل ہندو راج قائم کرنے اور مسلمانوں کو اور ان کے مطالبات کو کچلنے کی سازش ہے آپ نے اسی زمانے میں "ہندوستان چھوڑدو" تحریک کے جواب میں "ہندوستان تقسیم کرو اور چھوڑدو"۔ اسی زمانہ میں مسلمانوں نے یہ نعرہ لگایا "بٹ کے رہے گا ہندوستان۔۔۔ لے کے رہیں گے پاکستان"۔

یہ تحریک خود بخود دم توڑ گئی اور گاندھی جی اپنی چال میں کامیاب نہ ہوئے۔

گاندھی، وائسرائے مذاکرات

اکتوبر 1943ء کو لارڈ ویول بحیثیت وائسرائے ہندوستان آیا۔ لارڈ لنلتھگو اگرچہ مرنجان مرنج آدمی تھے لیکن انہوں نے قانون کی عملداری کو بڑی سختی سے قائم رکھا اور مسلم لیگ کی اہمیت اور قوت سے بخوبی آگاہ تھے۔ انہوں نے مسلمانوں کی رضامندی کے خلاف کوئی فیصلہ نہ کیا۔ قائداعظم نے ان سے مسلم لیگ کی واحد نمائندہ حیثیت کو منوا ہی لیا تھا۔ ایکٹ 1935ء کی فیڈریشن بھی منسوخ کروالی تھی۔ اس کے بدلے مسلم لیگ حکومت کی مساعی میں حائل نہ ہوئی۔ بلکہ حکومت سے تعاون کیا۔ نئے وائسرائے لارڈ ویول ایک فیلڈ مارشل تھے وہ ہندوستانی فوج کی اہمیت سے بخوبی آگاہ تھے۔ انہوں نے 17 فروری 1944ء کو اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے کہا "آپ جغرافیہ تبدیل نہیں کر سکتے ہندوستان ایک قدرتی وحدت ہے"۔ یہ بیان واضح طور پر کانگرس کے موقف کی حمایت میں تھا جس سے کانگرس کی کافی حوصلہ افزائی ہوئی۔ اسی بنا پر قائداعظم نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا:

"لارڈ ویول کانگرس کے سمندر میں مچھلیاں پکڑ رہے ہیں"۔

محاذ جنگ پر جنگ انقلابی صورت اختیار چکی تھی محوری قوتیں مات کھا رہی تھیں۔ ہندوستانی سیاست میں تبدیلی ناگزیر تھی۔ جنگی اخراجات نے ہندوستانی معیشت کی کمر توڑ کر رکھ دی تھی۔ اشیاء صرف کی قیمتیں آسمان سے باتیں کرنے لگیں تھیں افراط زر انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ تمام ذرائع مواصلات جنگی ضروریات کے لئے وقف تھے۔ خوراک کی نقل و حرکت معمول کے مطابق جاری نہ رہ سکی۔ بنگال میں خوفناک قحط پیدا ہوا۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق اس قحط میں 1873749 افراد بھوک سے ہلاک ہو گئے۔

6 مئی 1944ء کو گاندھی جی کو بیماری کی بنا پر غیر مشروط طور پر رہا کر دیا گیا۔ گاندھی نے وائسرائے کے ساتھ مراسلات کا سلسلہ شروع کر دیا انہوں نے ورکنگ کمیٹی سے ملنے کی اجازت چاہی لیکن وائسرائے نے انکار کر دیا۔ پھر 27 جولائی کو لکھا کہ وائسرائے ہندوستان کی کامل آزادی کا فوراً" اعلان کریں۔ اور مرکزی اسمبلی کے سامنے جواب دہ قومی حکومت قائم کی جائے۔ اس شرط کے ساتھ کہ دفاعی اختیارات وائسرائے اور کمانڈر انچیف کو حسب سابق حاصل رہیں تو وہ کانگرس کو سول نافرمانی ختم کرنے اور حکومت کے ساتھ تعاون کرنے کے لئے مشورہ دیں گے۔ یہ تجویز بھی بے سود اور لایعنی تھی۔ چونکہ حکومت ہندوؤں کی نافرمانی کی تحریک کچل چکی تھی۔ جنگ میں اتحادی قوتیں کامیابیاں حاصل کر رہی تھیں ایسے میں کانگرس کا تعاون بھی اتنا مفید نہ تھا۔ اس لیے یہ بات بھی عیاں ہو گئی کہ گاندھی جی نے عدم تشدد اور آہنسا کا اصول فراموش کر دیا تھا۔ اور تشدد اور مقابلے کی طرف بڑھ رہے تھے وہ کہنے لگے" کمزور اپنی مدافعت کے لئے اگر مقابلہ کرے تو وہ تشدد نہیں ہوتا مثلاً" اگر ایک عورت اپنے بچاؤ کے لئے کسی غنڈے پر چاقو سے حملہ کر دے تو وہ تشدد کی مرتکب نہیں ہو سکتی۔" ان کے ایسے ہی اپدیشوں نے تحریک میں تشدد کا عنصر داخل کر دیا۔

اس کے جواب میں وائسرائے نے 15 اگست 1944ء کو لکھا" یہ وہی تجاویز ہیں جو اپریل 1942ء کو کانگرس نے کرپس کے سامنے پیش کی تھیں اور اب بھی انہی وجوہ کی بنا پر حکومت برطانیہ انہیں مسترد کرتی ہے۔ نیز یہ تجاویز نئے دستور کی متقاضی ہیں اور نیا دستور اس وقت تک نہیں بن سکتا جب تک ہندوستانی سیاست کے تمام اہم عناصر اس سے اتفاق نہ کر لیں۔ اور نئے دستور کی تشکیل دوران جنگ ناممکن ہے۔"

گاندھی جی اس سے سخت مایوس ہوئے اور کہا" جب تک چالیس کروڑ افراد حکومت سے اقتدار چھین لینے کی قوت نہ پیدا کر لیں انگریز آزادی نہیں دے گا"۔ اس مایوسی کے عالم میں نیا پینترہ بدلتے ہوئے قائد اعظم کو خط لکھا کہ "میں نہ مسلمانوں کا دشمن ہوں نہ اسلام کا"۔ یہ ایک نیا فریب اور جال تھا جو گاندھی اب بچھانا چاہتے تھے۔ وہ دنیا کو یہ باور کرانا چاہتے تھے کہ کانگرس ہی مسلمانوں کی خیر خواہ ہے۔ وہ آزادی کے حصول کے لئے مسلمانوں کے ساتھ دور تک جانے کو تیار ہے۔ جب کہ در حقیقت وہ مسلمانوں کو کانگرس کے رحم و کرم پر رکھنا چاہتے

جناح، گاندھی مذاکرات

راج گوپال اچاریہ کی برہمی، انقطاع خط و کتابت اور اخباری بیان بازی کے بعد گاندھی جی کی باری آئی۔ اس دوران وہ لارڈ ویول سے اشیر باد لے چکے تھے۔ انہوں نے 17 جولائی 1944ء ایک خط کے ذریعے قائد اعظم کو لکھا "آج میرا دل کہہ رہا ہے کہ آپ کو خط لکھوں، جب آپ چاہیں میری آپ کی ملاقات ہو سکتی ہے مجھے اسلام کا یا اس ملک کے مسلمانوں کا دشمن نہ سمجھے، میں نہ صرف آپ کا بلکہ ساری دنیا کا دوست اور غلام ہوں مجھے مایوس نہ کیجئے گا"۔ قائد اعظم نے جواب میں اگست کے وسط میں بمبئی میں ملاقات کی تجویز پیش کی، تاہم ملاقات 9 ستمبر سے ہونی شروع ہوئی۔ دریں اثناء زبانی گفت و شنید کی بجائے مراسلات کا تبادلہ ہوتا رہا۔ 9 ستمبر کی ملاقات میں گاندھی جی نے واضح کر دیا کہ وہ صرف ذاتی حیثیت سے ملاقات کر رہے ہیں اس پر قائد اعظم نے اعتراض کیا اور اس بات پر زور دیا کہ جب تک دونوں قوموں کے نمائندوں کے درمیان گفت و شنید نہ ہو کسی مثبت نتیجے پر پہنچنا محال ہے۔ بات چیت کا آغاز قرار داد پاکستان سے ہوا جس کی بنیاد دو قومی نظریے پر تھی۔ گاندھی جی نے اس پر اعتراض کیا اور کہا "آپ کے اور میرے درمیان ایک بحر ذخار حائل ہے" اور زیر غور مثبت تجاویز کے طور پر راجہ جی کا فارمولا پیش کیا۔ 10 ستمبر کو قائد اعظم نے ایک خط میں راجہ جی فارمولا کا تنقیدی جائزہ لیا۔ جن چیزوں کے بارے میں قائد اعظم نے وضاحت طلب کی ان میں مندرجہ ذیل امور بھی شامل ہیں:

گاندھی جی کس حیثیت سے کانگرس (جو فریق ثانی کی حیثیت رکھتی تھی) کی طرف سے رضامندی دیں گے۔ آزاد ہندوستان کا دستور کون بنائے گا۔ اور عبوری حکومت کی ہیئت

ترکیبی کیا ہو گی اور مجوزہ حد بندی کمیشن کی تفصیلات کون طے کرے گا۔ استصواب رائے (ریفرنڈم) میں حصہ لینے والی تمام جماعتوں سے کیا مراد ہے۔ علیحدگی کی صورت میں آزاد ریاستوں کے قیام کے بعد اہم امور پر باہمی معاہدات کی شرط کیوں، تمام شرائط پر عمل انتقال اقتدار کے بعد ہو گا تو انتقال اقتدار کس کو اور کیسے کیا جائے گا۔"

گاندھی جی کی ذات ہی متنازعہ تھی۔ یہ گفت و شنید اور خط و کتابت کا دور کافی لمبا رہا لیکن کسی نتیجے پر پہنچے بغیر ہی یہ گفت و شنید ختم ہو گئی۔ چونکہ کانگرس یا گاندھی جی دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنا چاہتے تھے کہ ہم گفت و شنید کے ذریعے مسائل کا حل تلاش کرنا چاہتے ہیں لیکن مسٹر جناح کسی حل پر آمادہ ہی نہیں ہوتے۔ وہ ہمیشہ مسلمانوں کے مسائل کو سمجھنے میں ناکام رہے قائداعظم نے بعد میں ایک انٹرویو میں اس تمام گفتگو کا ماحصل یوں بیان کیا:

گاندھی تقسیم ملک سے پہلے آزادی چاہتا ہے حالانکہ تقسیم پہلے ہونی چاہیے گاندھی کی تجویز کے مطابق مرکزی اسمبلی کے سامنے جواب دہ عبوری حکومت کو برطانیہ سے ہندوستان کا چارج لینا تھا اور پھر اسی حکومت کو جس میں ہندو کی اکثریت ہوتی استصواب رائے اور سرحدات کے تعین کے اہم فیصلے کرنا تھے آخر میں کس طرح اس پاکستان پر رضامند ہو جاؤں جسے 3/4 مخالف اکثریت نے آخری شکل دینا ہے۔ یہ پاکستان نہیں ہو سکتا۔ ہاں صوبائی آزادی ہو سکتی ہے اور وہ بھی محض ہندو اکثریت کی مہربانی سے۔

قائداعظم نے مہاتما گاندھی کی شاطر سیاسی شخصیت کے بارے میں یوں اظہار خیال کیا:

"سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس راجہ جی کے فارمولا سے مسٹر گاندھی کا تعلق کس حیثیت سے سمجھا جائے کیونکہ وہ کانگرس کے 4 آنے والے ممبر تک نہیں ہیں۔ ان کی حیثیت مختلف ہے ان کی ذاتی حیثیت، ان کی کانگرس کے ڈکٹیٹر کی حیثیت اور ان سب سے بلند و بالا ان کا مہاتمائی اور دیوتائی منصب جس میں وہ اپنی اندرونی آواز پر کام کرتے ہیں۔ پھر وہ ستیہ گرہی بھی ہیں اور اس کے معنی و مقاصد کے واحد شارح بھی۔ وہ ہندو نہیں ہیں لیکن سناتنی ہیں اور اپنے ایجاد کردہ ہندو مت کے پیرو بھی۔ یہ پتہ لگانا بہت دشوار ہے کہ مسٹر گاندھی کس خاص موقع پر کس حیثیت کو کام میں لائیں گے۔"

تقاریر قائداعظم" 3 جولائی 1944ء

27 ستمبر کو فریقین اس نتیجے پر پہنچے کہ مزید گفت و شنید بے کار ہے لہٰذا تمام خطوط اور مشترکہ بیان پریس کے حوالے کر دیا جائے۔ اگرچہ مشترکہ بیان میں گفت و شنید کو غیر معینہ مدت کے لئے ملتوی کرنے کا اعلان کیا گیا۔ نیز بہت نرم زبان اور مزید افہام و تفہیم کی گنجائش رکھی گئی تھی۔ لیکن گاندھی نے فوراً" پریس اور عوام سے اپیل کی کہ وہ جناح پر دباؤ ڈالیں اور مسلم عوام کو مسلم لیگ اور قائداعظم کے خلاف اکسانے کی کوشش کریں اور اپنے مہروں کو محرک کر دیا۔

اس بات چیت کا لیگی نقطہ نظر سے یہ فائدہ ہوا کہ کانگرس نے قائداعظمؒ کو مسلمانانِ ہند کا نمائندہ تسلیم کر لیا نیز مسلم لیگ کو ہی مسلمانوں کی نمائندہ جماعت قرار دیا۔

لارڈ ویول کا منصوبہ

1945 کے آغاز میں جنگ عظیم دوم فیصلہ کن مراحل میں داخل ہو گئی۔ جرمنی کو شکست پر شکست ہونے لگی اور جاپان کے بارے میں واضح تھا کہ وہ تنہا زیادہ دیر تک اتحادیوں کا مقابلہ نہ کر سکے گا۔ اس لئے اب جنگ کے بعد کے لئے جو وعدے کئے گئے تھے ان کے ایفا کا وقت قریب آ رہا تھا۔ جنگ کے بعد جنگی صنعت اور جنگی معیشت ختم ہونے والی تھی۔ جس کے نتیجے میں بیروزگاری' اضطراب اور بے چینی کا سیلاب یقینی تھا جو کسی بھی تحریک کے لئے سازگار ماحول پیدا کر سکتا تھا۔ اگر سیاسی وعدے پورے نہ کئے جاتے تو سیاسی جماعتیں اس صورت حال سے فائدہ اٹھاتیں لہٰذا وائسرائے لارڈ ویول نے سیاسی ترقی کی طرف اہم قدم اٹھانے کا فیصلہ کیا۔ 3 مارچ 1945ء کو وائسرائے لندن پہنچے تاکہ مستقبل کے ہندوستان کا نقشہ تیار کیا جا سکے۔ وہ 3 جون واپس ہندوستان آئے اور 13 جون کو ایک نشری تقریر میں اپنے منصوبے کا اعلان کیا جس کی اہم شقیں درج ذیل تھیں:۔

1- موجودہ انتظامی کونسل کی جگہ نئی کونسل بنے گی جس میں تمام فرقوں کو نمائندگی دی جائے گی۔ مسلمانوں کو اونچی ذات کے ہندوؤں کے برابر نمائندگی دی جائے گی۔ کونسل میں نمائندے مرکزی اسمبلی کے منتخب ارکان میں سے لئے جائیں گے۔

2- حکومت ہند کے تمام شعبے بشمول وزارت خارجہ کونسل کے ارکان کو منتقل کر دیے جائیں گے صرف محکمہ جنگ کمانڈر انچیف کے پاس رہے گا۔

3- کونسل موجودہ دستور (گورنمنٹ انڈیا ایکٹ 1935ء) کے تحت کام کرے گی۔ گورنر جنرل کو کونسل اور اس کے فیصلوں کو مسترد کرنے کا حق حاصل رہے گا۔ لیکن وہ بلاوجہ اس حق کو

استعمال نہیں کرے گا۔

4- دیسی ریاستوں کے ساتھ تاج برطانیہ کے تعلقات وائسرائے کی وساطت سے حسب سابق برقرار رہیں گے۔

5- برطانوی حکومت کے معاشی مفادات کے تحفظ کے لئے ہندوستان میں برطانوی ہائی کمشنر مقرر کیا جائے گا۔

6- نئی کونسل کے تین فرائض تجویز کئے گئے:

(الف) جاپان کے خلاف جنگ کا اہتمام (جرمنی ہتھیار ڈال چکا تھا)

(ب) نئے دستور پر اتفاق رائے تک حکومت کا انتظام۔

(ج) نئے دستور کے بارے میں اتفاق رائے حاصل کرنے کے لئے تجاویز و اقدامات۔

7- اگر مندرجہ بالا فارمولا پر اتفاق رائے ہو جائے اور مرکزی ایگزیکٹو کونسل بن جائے تو صوبوں میں بھی وزارتیں بحال کر دی جائیں گی لیکن نئی وزارتیں مخلوط ہوں گیں یعنی ان میں مسلم لیگ کو بھی نمائندگی ملے گی۔

شملہ کانفرنس

ان تجاویز پر غور کرنے کے لئے لارڈ ویول نے 25 جون کو شملہ میں ایک کانفرنس طلب کی جس میں درج ذیل لوگوں کو دعوت دی گئی:

1- ہر صوبے کا وزیر اعظم (جہاں وزارت ٹوٹ چکی تھی وہاں وزارت ٹوٹتے وقت جو وزیر اعظم تھا اسے دعوت دی گئی)۔

2- مرکزی اسمبلی کی کانگرس پارٹی، نیشنلسٹ پارٹی، یورپین گروپ کے لیڈر اور مسلم لیگ پارٹی کے ڈپٹی لیڈر۔

3- کونسل آف سٹیٹ کی کانگرس پارٹی اور مسلم لیگ کے لیڈر

4- کانگرس اور مسلم لیگ کے نمائندوں کی حیثیت سے گاندھی جی اور قائد اعظم۔

5- سکھوں اور اچھوتوں کا ایک ایک نمائندہ۔

اس کانفرنس میں صرف ویول پلان پر ہی گفتگو نہ ہونے والی تھی بلکہ نئی کونسل کی تشکیل

بھی زیر غور تھی اس کانفرنس کو کامیاب بنانے کے لئے کانگرسی لیڈروں کو رہا کر دیا گیا۔ تاہم گاندھی جی نے اپنی بجائے ابوالکلام آزاد کا نام لکھوا دیا۔ کیونکہ مولانا آزاد صدر کانگرس تھے اور گاندھی کانگرس کے چونی والے ممبر بھی نہ تھے۔ کانگرس دراصل مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنا چاہتی تھی اسی مقصد کے لئے ابوالکلام آزاد کو کانگرس کا صدر بنایا گیا۔ خضر حیات ٹوانہ جو پنجاب کے یونینسٹ وزیر اعظم تھے' دوسرے آلۂ کار بنے اس نے دعویٰ کیا کہ اس کی پارٹی کو بھی نئی کونسل میں ایک نمائندہ نامزد کرنے کی اجازت دی جائے۔ آزاد نے مسلم لیگ کو مسلمانوں کی نمائندہ جماعت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اس پر طرہ یہ کہ کانگرس کو پوری قوم کا نمائندہ قرار دیا اور ایک مسلمان رکن کونسل نامزد کرنے کا حق مانگا۔ ان سب کے برخلاف قائد اعظمؒ کا اصرار یہ تھا کہ مسلمانان ہند کی واحد نمائندہ جماعت صرف مسلم لیگ ہے اس لئے مسلم ارکان صرف مسلم لیگ سے ہی لئے جائیں۔ نیز انہوں نے یہ مطالبہ بھی کیا چونکہ اقلیتی نمائندے ہمیشہ ہندؤوں کے ہم نوا ہوں گے لہٰذا اگر کسی مسئلے پر مسلم ارکان کی اکثریت اختلاف کرے تو اس مسئلے کو ووٹوں کی تعداد سے طے نہ کیا جائے۔

مولانا ابوالکلام آزاد اس بات پر اصرار کر رہے تھے کہ کانگرس صرف ہندوؤں کی نمائندہ جماعت نہیں ہے بلکہ پوری قوم کی نمائندہ ہے۔ سرحد کے وزیر اعلیٰ ڈاکٹر خان صاحب بھی ان کی پوری پوری حمایت کر رہے تھے۔ لیکن قائد اعظم نے اعلان کیا کہ کانگرس صرف ہندوؤں کی نمائندہ ہے۔ لارڈ ویول نے اس پر فیصلہ دیا کہ "کانگرس اپنے ارکان کی نمائندہ ہے"۔ قائد اعظم نے اسے منظور کر لیا کیونکہ کانگرس کے ارکان پچانوے فیصد سے زیادہ ہندو تھے۔

لارڈ ویول نے کونسل کی نامزدگی کے لئے یہ طریق کار مقرر کیا کہ ہر جماعت اپنے حصے کے ارکان سے تین گنا زیادہ ناموں کا ایک پینل وائسرائے کو دے دے اور وائسرائے ان میں سے جن کو پسند کریں گے مقرر کر دیں گے۔ قائد اعظم نے اس کو قبول نہ کیا اور کہا کہ اس کی بجائے وائسرائے اور وہ مل کر مسلمانوں کے حصے کے پانچوں ناموں کا فیصلہ کر لیں گے۔ وائسرائے نے اس پر اصرار کیا کہ مسلم لیگ چار نام تجویز کرے اور پانچواں شخص پنجاب سے لیا جائے گا اور وہ غیر لیگی ہوگا۔ قائد اعظم نے اس کو تسلیم نہ کیا۔ اور اس بات پر اصرار کیا کہ پانچ کے پانچ مسلمان لیگ میں سے ہونے ضروری ہیں۔ نیز انہوں نے مذکورہ تحفظ بھی مانگا۔ لارڈ

ویول نے ان کی دونوں باتوں کو ماننے سے انکار کر دیا جس پر 15 جولائی کے اجلاس میں وائسرائے نے کانفرنس کی ناکامی کا اعلان کر دیا۔

اس پر بہت سخت پراپیگنڈہ ہوا اور کانفرنس کی ناکامی کا سارا بوجھ قائداعظم پر ڈال دیا گیا۔ یہ بڑا نازک موقع تھا' قائداعظم کی سیاسی بصیرت کا کڑا امتحان تھا۔ لیکن آپ سنگلاخ چٹان کی طرح ثابت قدم رہے جس کی بنا پر کانگرس کا قومی حکومت پر قابض ہونے کا خواب پاش پاش ہو گیا۔ قائداعظمؒ نے ایک پریس کانفرنس میں کہا:

ویول پلان کے آخری جائزے اور تجزیئے میں ہم نے یہ پایا کہ وہ ایک جال اور پھندہ تھا۔ وہاں ایک اتحاد قائم تھا۔ ہمارے خلاف ایک اتحاد تو وہ تھا جو گاندھی کی ہندو کانگرس پر مشتمل تھا' جو متحدہ ہندوستان کی قومی آزادی کا علمبردار ہے۔ دوسرا گروہ لارڈ ویول' گلینسی اور خضر کا ہے جن میں سے ایک پر ہندوستان کی جغرافیائی وحدت کا الہام ہوا ہے۔ اور دوسرے دو پنجاب کے مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے پر تلے ہوئے ہیں - ہم کو ایسے انتظام میں شامل کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی کہ جس کو ہم منظور کر لیتے تو ہم اپنی موت کے فرمان پر دستخط کر دیتے۔"

قائداعظمؒ اور ان کا عہد صفحہ 585-584

عام انتخابات

شملہ کانفرنس کی اصل ناکامی اس بنا پر ہوئی کہ مسلمانان ہند کی نمائندگی مختلف لوگ ہندو کانگرس کے ایما پر کر رہے تھے لہٰذا ضروری ہو گیا کہ اس حقیقت کا فیصلہ کر لیا جائے اور ایک جمہوری حکومت میں اس کا بہترین حل انتخاب ہوتے ہیں اسی بنا پر قائداعظمؒ نے عام انتخابات کا مطالبہ کر دیا۔ اس کے علاوہ برطانیہ میں عام انتخابات ہوئے اور لیبر پارٹی بر سر اقتدار آ گئی۔ اور مسٹر اٹیلی برطانیہ کے وزیر اعظم مقرر ہوئے۔ اس نے لارڈ ویول کو برطانیہ طلب کیا اور اس کے بعد ستمبر 1945ء میں اپنی ایک نشری تقریر میں اعلان کیا کہ 1946ء کے موسم سرما میں ہندوستان میں عام انتخابات کروائے جائیں گے۔ قائداعظمؒ نے نئے انتخابات کی تیاری کا حکم دیا تو قوم نے نہ صرف ووٹ دینے کی ٹھانی بلکہ نوٹ بھی فراہم کرنے شروع کر دیئے۔ مسلم لیگ

کی تنظیم روز بروز زیادہ موثر اور زوردار ہونے لگی۔ لیگ کونسل نے نئے پارلیمانی بورڈ اور نئی انتخابی کمیٹیاں تشکیل دیں۔ قائداعظمؒ نے ملک گیر دورے کا پروگرام بنایا اور آپ نے جو منشور دیا اس کا لب لباب یہ تھا:

"دو قومی نظریہ' پاکستان و ہندوستان کے لئے الگ الگ دستور ساز اسمبلیوں کا قیام اور تشکیل"۔

کانگرس نے ملک کو متحد رکھنے اور ایک قوم کا نعرہ بلند کیا۔ کانگرس اور ہندو پریس نے قائد اعظمؒ کو سب سے بڑا ہٹلر باز' بدترین جھگڑالو' ضدی قرار دیا۔ پاکستان کو بھارت ماتا کے ٹکڑے کرنا' دقیانوسی رجعت پسندی' اور مذہبی بربریت قرار دیا۔ کانگرس نے اپنے مقاصد کے حصول کے لئے مومن گروپ' احرار شیعہ کانفرنس' جمیعت العلمائے ہند اور یونینسٹ پارٹی کا تعاون بھی حاصل کیا لیکن اس کے یہ سب ہتھکنڈے ناکام ہو کر رہ گئے۔

دسمبر 1946ء کو انتخابات ہوئے مرکز میں مسلمانوں کے لئے تیس نشستیں مخصوص تھیں تمام کی تمام مسلم لیگ نے جیت لی۔ بہت سی جگہوں پر قوم پرست مسلمانوں کی ضمانتیں بھی ضبط ہو گئیں (وی پی مینن ٹرانسفر آف پاور) کانگرس نے ستاون' اکالی دل نے دو آزاد پانچ منتخب ہوئے۔ 11 جنوری 1946ء کو مسلم لیگ نے یوم فتح منایا اسی موقعہ پر قائداعظمؒ نے بمبئی میں اردو میں تقریر کی۔

"انتخابات نے ثابت کر دیا کہ مسلم لیگ مسلمانوں کی نمائندہ جماعت ہے جب کہ کانگرس ہندو جماعت ہے۔ مسلم لیگ نے نہ صرف مرکز میں شاندار کامیابی حاصل کی بلکہ صوبائی چار سو بانوے نشستوں میں سے چار سو اٹھائیس حاصل کر لیں۔"

کابینہ مشن پلان

یہ ایک عجیب بات ہے کہ انگریزوں نے ہندوستان پر تقریباً" دو سو سال تک حکومت کی' لیکن وہ ہندو مسلم معاشرے کو سمجھنے میں ناکام رہے یا پھر وہ بھی ہندوؤں کی طرح مسلمانوں سے عناد رکھتے تھے اور صلیبی جنگوں کا بدلہ لینے کے لئے مسلمانوں کو ہندوؤں کا غلام بنانا چاہتے تھے۔ اس حقیقت کا اندازہ انگریزوں کے طور طریقہ اور اعلانات سے بخوبی ہو سکتا ہے۔ برطانیہ کی لیبر وزارت نے 1946ء کے آغاز میں تین وزراء پر مشتمل ایک مشن برصغیر بھیجا تاکہ یہاں کے لیڈروں سے مل کر کوئی قابل قبول فارمولا وضع کیا جائے۔ 15 مارچ کو وزیر اعظم برطانیہ ایٹلی نے برطانوی دارالعوام میں اس مسئلے پر بحث کرتے ہوئے کہا:

"میں خوب جانتا ہوں کہ ایک ایسے ملک کے بارے میں اظہار خیال کر رہا ہوں جس میں نسلوں' مذاہب اور زبانوں کے کئی مجموعے ہیں اس طرح جو مشکلات پیدا ہو گئیں ہیں میں ان سے بھی واقف ہوں لیکن ان مشکلات پر صرف ہند کے لوگ ہی قابو پا سکتے ہیں۔ اقلیتوں کے حقوق کا بھی ہمیں پورا خیال ہے مگر کسی اقلیت کو اس بات کی اجازت نہیں دے سکتے کہ وہ اکثریت کی راہ ترقی میں حق استرداد (ویٹو) کا روڑا اٹکائے۔"

یہ تقریر گویا کانگرس کی حمایت کا رنگ لیے ہوئے تھی۔ اس کے جواب میں قائداعظمؒ نے 17 مارچ کو ایک بیان میں فرمایا:

"یہاں ویٹو برتنے یا اکثریت کی ترقی روکنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بلکہ مسلمانان ہند بذات خود ایک قوم ہیں اور حق خود اختیاری ان کا بنیادی حق ہے انہوں نے مزید کہا کہ صورت کچھ ایسی ہے کہ مکڑا مکھی کو اپنے محل میں آنے کی دعوت دیتا ہے۔ اب اگر مکھی (اپنی جان کو

محفوظ رکھنے کے لئے) انکار کرتی ہے تو کہا جاتا ہے کہ مکھی حق استرداد استعمال کر رہی ہے اور سخت ضدی ہے۔"

آپ نے واضح کیا کہ اگر کابینہ مشن ایک خاص منصوبہ اور معین خیال لے کر ہندوستان آرہا ہے اور ایک دستور ساز اسمبلی اور ایک وفاق قائم کیا جائے گا تو پھر تمام ہندوستانی لیڈروں سے تعاون کا مطالبہ کرنے کے کوئی معنی نہیں ہیں کیونکہ:

"ہم ہندوستان کی تقسیم چاہتے ہیں اور پاکستان قائم کرنا چاہتے ہیں اور یہ کہ ہندوستان کے آئینی مسئلے کا حل صرف پاکستان ہے اور یہ اس برصغیر کی دو مختار مملکتوں کے لئے خوشی' فلاح اور تحفظ کا باعث ہو گا۔"

کانگرسی حلقے مسٹر اٹیلی کے بیان سے بہت خوش تھے لیبر پارٹی سے ان کے قدیمی تعلقات تھے اور انہیں یقین تھا کہ لیبر حکومت ماضی کی روایات کے مطابق ان کے حق میں یک طرفہ فیصلہ کرے گی اور اختیارات حکومت جلد ہی کانگرس کو منتقل کر دیئے جائیں گے' مسلمانوں کا علیحدگی کا منصوبہ تسلیم نہ کیا جائے گا۔ کابینہ کے تینوں ارکان لارڈ پیتھک لارنس' سر سٹیفورڈ کرپس اور اے وی الیگزینڈر اسی سیاسی فضا میں 24 مارچ 1946ء کو دہلی پہنچے۔ کانگرس نے بھرپور انداز سے وفد کا استقبال کیا جب کہ مسلم لیگ نے سرد مہری کا اظہار کیا جس کا وفد نے خاص نوٹس لیا۔ لارنس نے محسوس کر لیا کہ مسٹر اٹیلی کے بیان کی بنا پر مشن ناکام ہو سکتا ہے چنانچہ دوسرے دن اس نے ایک پریس کانفرنس میں میکیاولین نوعیت کا بیان دیا:

"جہاں کانگرس زیادہ بڑی تعداد کی نمائندہ ہے' مسلم لیگ کو یہ سمجھنا صحیح نہیں ہو گا کہ وہ محض ایک اقلیت کی سیاسی پارٹی ہے۔ وہ عظیم مسلم جماعت کی ایسی نمائندہ انجمن ہے جو صاحب اکثریت ہے۔"

گو لارنس نے مسلم لیگ کو ایک الگ قوم کی نمائندہ تسلیم نہ کیا تھا البتہ مسلمانوں کو دلاسہ دینے کی کوشش ضرور کی تھی۔ کرپس نے اس بات کی بھی تردید کر دی کہ وہ کوئی طے شدہ منصوبہ لے کر آئے ہیں۔ ایک ہفتے تک ارکان کابینہ وائسرائے' صوبائی گورنروں' ارکان قانون ساز اسمبلی سے گفتگو کرتے رہے تاکہ حکومت ہند کے نقطہ نظر کو بغور سمجھ سکیں۔ اس کے بعد انہوں نے ہندوستان کی مختلف سیاسی جماعتوں کے قائدین سے ملاقاتیں شروع کیں

اور مختلف تجاویز پر تبادلہ خیال کیا۔ ابوالکلام آزاد نے صدر کانگرس کی حیثیت سے وفاقی حکومت کے قیام کی تجویز پیش کی۔ جس میں مرکزی حکومت کے پاس تین محکمے دفاع' خارجہ اور مواصلات ہوں۔ مہاتما گاندھی نے چانکیائی سیاست سے کام لیتے ہوئے اپنے آپ کو مسلمانوں کا مخلص دوست بتایا لیکن کہا کہ پاکستان کا مطالبہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ انہوں نے راجہ جی فارمولا کی حمایت کی۔ قائداعظمؒ نے 4 اپریل کو اپنی ملاقات میں متحدہ ہندوستان کے نظریے کو غیر منطقی اور غیر تاریخی قرار دیا اور بتایا کہ ہندوستان کبھی ایک وحدت نہیں رہا۔ اس کی موجودہ وحدت صرف برطانوی قبضہ کی بنا پر ہے۔ انہوں نے ملک کے سماجی نظام کا جائزہ لیتے ہوئے بتایا کہ ہزاروں سال اکٹھا رہنے کے باوجود ہندو اور مسلمان الگ الگ ہی رہے ہیں' ان کے محلے الگ الگ ہیں' کھانا پینا الگ الگ ہے' ان کا فلسفہ حیات' تاریخ' مذہب اور طرز معاشرت ایک دوسرے سے الگ الگ ہیں لہٰذا برصغیر میں استحکام اور امن وامان کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ ان کو دو مملکتوں میں تقسیم کر دیا جائے۔

قائداعظمؒ یورپین سیاست کو جانتے تھے۔ ان کو علم تھا کہ انگریز صرف طاقت کی زبان سمجھتے ہیں لہٰذا انہوں نے 9 اپریل 1946ء کو مسلم لیگ کے ٹکٹ پر منتخب ہونے والے تمام ارکان صوبائی و مرکزی اسمبلی کا کنونشن بلایا۔ جس میں ملک کی صورت حال پر بہت مدلل تقاریر ہوئیں یہ قرارداد پاس کی گئی:

"یہ کنونشن ایک مرتبہ پھر یہ اعلان کرتا ہے کہ متحدہ ہندوستان کی بنیاد پر اگر کوئی دستور مسلط کرنے یا مرکز میں مسلم لیگ کے مطالبے کے خلاف جبراً" عبوری انتظام کرنے کی کوشش کی گئی تو مسلمانوں کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ ہو گا کہ وہ اپنی بقاء اور قومی تحفظ کے لئے تمام ممکن طریقوں سے اس کی مخالفت کریں۔"

قائداعظمؒ کی صاف گوئی' بیباکی اور سیاسی بصیرت سے وفد پہلے ہی کافی متاثر تھا لیکن جب یہ عظیم الشان قرارداد منظور ہوئی تو وزارتی مشن کو بھی پاکستان ناگزیر نظر آنے لگا۔ اس وفد نے ایک مرتبہ پھر قائدین سے ملاقاتیں کیں اور اپنا منصوبہ پیش کرنے کے لئے دوبارہ شملہ کانفرنس بلائی۔ گو کانفرنس تو ہندو کانگرس کی ہٹ دھرمی کی بنا پر ناکام رہی چونکہ وہ مضبوط' بااختیار مرکز اور صوبوں میں صدر راج نافذ کرانا چاہتی تھی یہ مسلمانوں کی تباہی اور بربادی کا

موجب بن سکتی تھی۔ وزارتی مشن نے مجبور ہو کر اپنا منصوبہ پیش کر دیا جس کے اہم نکات درج ذیل ہیں:

1- ہندوستان کی ایک ہی وفاقی حکومت ہو گی جو برطانوی ہند اور ریاستوں پر مشتمل ہو دفاع' خارجہ اور مواصلات کے محکمے مرکز کے پاس ہوں گے اور اسے بقدر ضرورت ٹیکس لگانے کا اختیار حاصل ہو گا۔ اہم فرقہ وارانہ مسائل کو حل کرنے کے لئے پارلیمنٹ کی اکثریت کے علاوہ دونوں فریقوں کے نمائندوں کی اکثریت بھی ضروری ہے۔

2- مذہبی بنیادوں پر صوبوں کے تین گروپ بنائے جائیں گے:

(الف) ہندو اکثریت کے صوبے (یوپی' سی پی' مدراس' بمبئی' اڑیسہ)

(ب) شمال مغربی مسلم صوبے (پنجاب' سرحد' بلوچستان' سندھ)

(ج) اس میں مشرقی مسلم صوبے (بنگال' آسام)۔

ہر گروپ کو اپنی مشترکہ حکومت قائم کرنے کا بھی اختیار ہو گا۔

3- صوبے اور ریاستیں وفاق کی بنیادی اکائیاں ہوں گیں۔ چند طے شدہ محکموں کے علاوہ باقی تمام محکمے صوبوں کی تحویل میں ہوں گے' ریاستیں جو اختیارات مرکزی حکومت کو سونپ دیں ان کے علاوہ باقی اختیارات اپنے پاس رکھیں گی۔

4- صوبوں کا ہر گروپ اپنے صوبوں کے لئے آئین سازی کرے گا اور یہ بھی طے کرے گا کیا گروپ کے لئے الگ آئین وضع کرنے کی ضرورت ہے؟ نیز انتخابات کے بعد کوئی بھی صوبہ اپنی اسمبلی کی اکثریت کی رائے سے اپنے گروپ سے الگ ہو سکے گا۔

5- دستور ساز اسمبلی میں نشستوں کی تقسیم اس طرح کی گئی: کل ارکان 385' مسلمانوں کی نشستیں 178' گروپ (الف) میں سے 120' گروپ (ب) میں سے 22' اور گروپ (ج) میں سے 36۔ سکھوں کے لئے مخصوص 4' دیسی ریاستوں کے لئے مخصوص 13' عمومی 210۔

6- دس سال کے بعد ہر صوبہ اپنی اسمبلی کی اکثریت کی خواہش پر اپنی حیثیت کو تبدیل کر سکتا ہے۔

7- دس سال کے لئے مرکز میں ایک عبوری حکومت قائم ہو گی جس میں پانچ کانگرس کے نامزد کردہ ہندو' ایک اچھوت' پانچ مسلم لیگ کے نامزد کردہ مسلمان' ایک پارسی' ایک سکھ اور ایک

دیسی عیسائی شامل ہو گا۔

8- ہر پارٹی کے لئے لازم ہے کہ اس فارمولے کو بحیثیت مجموعی قبول کرے یا رد کرے جو پارٹی اس کو جزوی یا کلی طور پر مسترد کر دے گی اس کو عبوری حکومت میں شامل نہیں کیا جائے گا۔

رد عمل

گاندھی جی نے 16 مئی کے بیان میں اس فارمولے کو فیصلہ کی بجائے ایک اپیل اور مشورہ قرار دیا۔ ان کے نزدیک چونکہ آئین ساز اسمبلی خود مختار ہو گی لہٰذا وہ اس کو تبدیل کرنے کی مجاز ہو گی۔ مثلاً" وہ مرکزی حکومت کے دائرہ کار میں توسیع کر سکے گی یا مسلمانوں اور غیر مسلموں کے امتیاز کو کالعدم قرار دے سکے گی۔ ان تعبیروں نے ساری سکیم کا حلیہ ہی بگاڑ کر رکھ دیا کہ ایسی اسمبلی جس میں مستقل ہندو اکثریت ہو اگر اس حد تک بااختیار مان لیا جائے تو مسلمانوں کو کونسا تحفظ دیا گیا۔ کانگرس نے گاندھی کی ہدایت کے مطابق قرار داد پاس کر دی اور مذکورہ بالا شرائط کے ساتھ کابینہ مشن کو قبول کرنے کا اعلان کر دیا۔

اب کابینہ مشن کو گاندھی جی کے عجیب و غریب شخصیت کا اندازہ ہونے لگا۔ لارڈ لارنس اور کریس نے اپنے الگ الگ بیانات میں گاندھی جی کی تاویلات کو غلط اور گمراہ کن قرار دیا اور کہا "یہ سکیم اپنے تمام اجزاء سمیت ایک وحدت ہے اور صرف اسی صورت میں کامیاب ہو سکتی ہے کہ اسے تعاون کے جذبے سے قبول کر کے بروئے کار لایا جائے۔" انہوں نے کانگرس کی تاویلات سے اختلاف کیا اور صوبوں کی گروہ بندی کے بارے میں کانگرس کی تعبیر کے بارے میں واضح کیا کہ یہ مشن کے مقصد اور غایت سے مطابقت نہیں رکھتے۔ "صوبوں کی گروبندی سکیم کا ایک لازمی حصہ ہے اور فریقین کی باہمی رضامندی سے ہی اس میں ترمیم کی جا سکتی ہے۔ اور موجودہ آئین عبوری دور میں جاری رہے گا لہٰذا عبوری حکومت کو قانونی طور پر مرکزی مجلس قانون ساز کے سامنے جواب دہ نہیں بنایا جا سکتا۔"

قائداعظمؒ نے اپنے بیان میں اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ پاکستان کے اصول کی نفی کر دی گئی ہے جو ہندوستان کے دستوری مسئلے کا واحد حل ہے اور افسوس ہے کہ مشن نے

اس کے خلاف دلیل بازی شروع کر دی ہے۔ مسلم لیگ کونسل نے کہا "یہ سکیم بالآخر آزاد اور خودمختار پاکستان کے قیام پر منتج ہو گی اور کابینہ مشن سکیم اپنی سب پیش رو سکیموں سے بہتر ہے۔" لہٰذا اسے منظور کرنے کا فیصلہ دے دیا۔ برطانوی پریس نے مسلم لیگ کے اس فیصلے کو دانشمندانہ اور مدبرانہ قرار دیا۔ جس پر ملک بھر میں اطمینان کا اظہار ہوا۔

قائد اعظمؒ نے وائسرائے کو لکھا چونکہ مسلم لیگ سکیم کو منظور کر چکی ہے لہٰذا عبوری حکومت میں جو وزراء کی نسبت دی گئی ہے اسے بدلی نہ کیا جائے۔ وائسرائے نے جب یہ فارمولا نہرو کے سامنے رکھا تو وہ بھڑ پڑا اور کہا کہ کل ارکان پندرہ ہونے چاہییں جن میں پانچ کانگرسی ہندو' چار مسلم لیگی' ایک غیر لیگی مسلم' ایک غیر کانگرسی ہندو' ایک غیر کانگرسی اچھوت' ایک عیسائی' ایک سکھ' اور ایک کانگرسی عورت۔ گویا کانگرس اپنے لئے عبوری حکومت میں زیادہ سے زیادہ نمائندگی مانگ رہی تھی۔ حالانکہ وہ اس سے پہلے اس حصے کو تسلیم کر چکی تھی۔

25 جون کو کانگرس ورکنگ کمیٹی نے عبوری حکومت کا فارمولا مسترد کر دیا لیکن دستور ساز اسمبلی میں شرکت کا فیصلہ کیا "تاکہ ایک آزاد' متحدہ اور جمہوری ریاست ہندوستان کے دستور کی تشکیل کی جاسکے۔" جس کا واضح مطلب یہ تھا کہ کانگرس نے عملاً "کابینہ مشن پلان کو مسترد کر دیا تھا قائد اعظمؒ نے اس پر مطالبہ کیا کہ وائسرائے حسب اعلان کانگرس کے بغیر عبوری حکومت تشکیل کرے لیکن لارڈ ویول نے یہ تسلیم نہ کیا۔ اس وعدہ خلافی پر قائد اعظمؒ نے شدید تنقید کی۔ ابھی یہ بحث جاری تھی کہ 29 جون 1946ء کو کابینہ مشن واپس چلا گیا۔

گاندھی جی کا منصوبہ تھا کہ عبوری حکومت کے تحت اختیارات حاصل کر لئے جائیں اس کے بعد مسلم لیگ سے براہ راست نمٹا جائے۔ ان کے سیکریٹری پیارے لال نے لکھا ہے:

"گاندھی مصر تھے کہ برطانیہ کے ہٹ جانے کے بعد انہیں مسلم لیگ سے براہ راست' بلا مداخلت غیرے نبٹنے دیا جائے خواہ اس کا مطلب خانہ جنگی ہی کیوں نہ ہو۔"

اہنسا اور عدم تشدد کے علمبردار گاندھی کا یہ پہلو کافی غور و خوض کا طالب ہے۔ یہ وہ شخص ہے جو ساری دنیا کو عدم تشدد کا درس دیا کرتا تھا اور اسے بلند ترین مذہبی اصول قرار دیا کرتا تھا۔ جس نے وزیر اعظم برطانیہ کو ہٹلر کا مقابلہ عدم تشدد سے کرنے کی ترغیب دی تھی۔ اب وہ خود حکومت کے حصول کے لئے اندرونی خانہ جنگی کی ترغیب دے رہے ہیں۔ صدر کانگرس جواہر

لعل نہرو نے 10 جولائی کو اعلان کیا کہ "کانگرس نے آئین ساز اسمبلی میں شرکت قبول کی ہے اور وہ معاہدوں کی زنجیروں سے بالکل آزاد ہو گی۔ جو بھی صورت حال ہو گی وہ اس سے نپٹنے کے لئے پوری طرح تیار ہے۔" یہ کابینہ مشن کی صریح خلاف ورزی تھی۔ لہٰذا مسلم لیگ کونسل کا جولائی کے آخری ہفتے میں اجلاس ہوا۔ جس میں کانگرس کے رویہ کا جائزہ لیا گیا اور قرارداد میں کہا گیا:

"دستور ساز اسمبلی میں مسلم لیگ کی شرکت خطرات سے خالی نہیں"۔ نیز کہا "مسلم لیگ کونسل کابینہ مشن کی تجاویز کی وہ منظوری منسوخ کرتی ہے جس کی اطلاع صدر مسلم لیگ نے 6 جون کو وزیر مملکت برائے ہند کو دی تھی۔"

اسی اجلاس میں ایک اور قرارداد منظور ہوئی جس میں راست اقدام کا فیصلہ کیا گیا اور کہا:

"برطانوی حکومت کے سرپر کانگرس کی تلوار لٹک رہی ہے اور اسے یہ ڈر ہے کہ اگر کانگرس کی پوری طرح دلجوئی نہ کی گئی تو وہ مہم شروع کر دے گی..... انگریزوں کے پاس مشین گنیں ہیں اور وہ اپنی بات کی جو چاہیں تاویل کر سکتے ہیں..... کانگرس ایک اور قسم کے ہتھیار سے لیس ہے...... اس لئے ہم بھی اب اپنے دفاع اور اپنے تحفظ کے لئے آئینی ذرائع کو خیرباد کہنے پر مجبور ہو گئے ہیں اور ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ راست اقدام کی تیاری کریں تاکہ جس طرح اور جب بھی وقت آئے اس پر عمل در آمد کر سکیں۔"

ظہور پاکستان صفحہ 72

"قائداعظمؒ نے اس قرارداد پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا" آج جو فیصلہ ہم نے کیا ہے وہ ہمارا اہم ترین تاریخی فیصلہ ہے کیونکہ آج تک ہم نے کبھی دستوری طریقوں سے ہٹنے کی کوشش نہیں کی ہے۔"

دستور پاکستان صفحہ 95

کانگرس نے اسے راست اقدام کی دھمکی اور اپنے خلاف اعلان جنگ قرار دیا اور پیشن گوئی کی کہ مسلم لیگ میں اتنی سکت نہیں کہ وہ اس طرح کے اقدامات کر سکے۔ سر آرتھر مور' مدیر سٹیٹس مین' نے صورت حال کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا:

18 جون کے بیان سے منحرف ہو کر ہم نے انہی کا ساتھ چھوڑ دیا ہے جنہوں نے ہم پر

اعتبار کیا تھا..... ہم نے ایسی صورت حال پیدا کردی ہے جس میں خانہ جنگی کا واضح امکان ہے۔
پاکستان ناگزیر تھا' صفحہ 431

لارڈ ویول نے تمام اصولوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے نہرو کو عبوری حکومت قائم کرنے کی دعوت دی' کانگرس نے اس دعوت کو قبول کر لیا۔ 24 اگست کو نہرو وزارت کے ارکان کے ناموں کا اعلان کر دیا گیا۔ یہ وزارت سازی برطانوی حکومت کی وعدہ خلافی اور کانگرس لیبرل پارٹی کی غیر حقیقت پسندی کا شاہکار ہے۔ اس صورت حال کے پیش نظر مسلم لیگ نے 16 اگست 1946ء کو یوم راست اقدام منایا کلکتہ میں ہندوؤں نے مسلمانوں کے گھروں پر حملہ کر دیا اور تین دن تک فرقہ وارانہ فسادات ہوتے رہے۔ فرانسس مکر کے مطابق:

"یہ تو بے لگام خون خاری تھی ..... صرف ایک رات میں تین انگریز رجمنٹوں نے گلی کوچوں سے ساڑھے چار سو نعشیں ہٹائیں۔"

لارڈ ویول خود کلکتہ گئے تاکہ وہاں ہونے والے فسادات کا خود جائزہ لیں کلکتے کی تباہ کاریوں کو دیکھ کر اسے یقین ہو گیا کہ اگر مسلم لیگ اور کانگرس کے درمیان سمجھوتہ نہیں ہوتا تو پورے ملک میں خانہ جنگی چھڑ جائے گی۔ خواجہ ناظم الدین نے ہندوؤں کی وحشت و بربریت کو وائسرائے اور برطانوی حکومت کی جانبدارانہ پالیسی کا ثمر قرار دیا اور مقتولین کے خون کی ذمہ داری برطانوی حکومت پر ڈالی۔

لارڈ ویول جب واپس لوٹا تو اس نے نہرو اور گاندھی سے ملاقات کی اور کلکتہ کے واقعات سنانے کے بعد ان پر واضح کر دیا جب تک مسلم لیگ اور کانگرس میں سمجھوتہ نہیں ہو جاتا وہ دستور ساز اسمبلی کا اجلاس نہیں بلائیں گے۔ یہ مسئلہ خود کانگرس کے لئے بھی درد سر بنا ہوا تھا کہ دستور ساز اسمبلی کی مسلم نشستوں پر سوائے دو کے سب پر مسلم لیگ کا قبضہ تھا اور اس کا بنایا ہوا قانون صرف ہندوؤں کے لئے ہی تھا۔

مہاتما گاندھی نے اسی دوران وزیر اعظم برطانیہ مسٹر اٹلی کو تار بھیجا کہ لارڈ ویول کے اعصاب کلکتہ کے سانحے سے متاثر ہو گئے ہیں ان کو کوئی مناسب مشیر مہیا کیا جائے۔ نہرو نے بھی اسی مضمون کا خط لکھا جس کے نتیجے میں اٹلی نے لارڈ ویول کو معزول کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

2 دسمبر 1946ء کو کانگرسی حکومت نے حلف اٹھایا' مسلم لیگ نے یوم سیاہ منایا۔ ادھر

چرچل نے جو حزب مخالف کے سربراہ تھے' سانحہ کلکتہ اور اس کے بعد ہونے والے فسادات کی ذمہ داری لیبر حکومت کی غیر منصفانہ اور جانبدارانہ پالیسیوں پر ڈالی۔ مسٹر اٹلی کے لئے جواب دینا مشکل ہو گیا۔ چنانچہ اس نے وائسرائے کو لکھا کہ مسلم لیگ کو عبوری حکومت میں شرکت پر آمادہ کیا جائے اور کانگرس کی زیادتیوں کا مداوہ کیا جائے۔ چنانچہ اس نے خود قائد اعظمؒ سے رابطہ کیا جسے قائد اعظمؒ نے منظور کر لیا۔ مسلم لیگ نے لیاقت علی خان (وزیر خزانہ)' آئی آئی چندریگر (تجارت)' عبدالرب نشتر (مواصلات)' راجہ غضنفر علی خان (صحت) اور جوگندر ناتھ منڈل (قانون) کو وزارت میں شمولیت کی اجازت دی جس کے دو فائدے ہوئے:

ایک تو لیگی وزراء کانگرسی وزیر اعظم کی ہدایت کے پابند نہ تھے۔ دوسرے جوگندر ناتھ منڈل کو مسلم لیگ کی وزارت دلوا کر کانگرس کے پورے ہند کا نمائندہ ہونے کے غبارے سے ہوا نکال دی۔ کیونکہ اس سے یہ واضح ہو گیا کہ پورے ہند کی نمائندگی تو کجا کانگرس پورے ہندوؤں کی بھی نمائندہ نہیں۔ اچھوتوں کا اسے اعتماد حاصل نہیں۔ اس پر نہرو اور گاندھی بہت تلملائے اور انہوں نے وائسرائے سے احتجاج بھی کیا لیکن بے سود رہا۔

عبوری حکومت کی کارکردگی

کانگرس نے ہمیشہ یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ وہ مسلمانوں کی ہمدرد اور خیر خواہ ہے لیکن درحقیقت مسلمانوں کی بدترین دشمن تھی۔ اسی لحاظ سے اس نے پراپیگنڈہ کر رکھا تھا کہ وہ مسلم لیگ کی عبوری حکومت میں شمولیت پر راضی ہے۔ لیکن جب مسلم لیگ فی الواقع عبوری حکومت میں شامل ہوگئی تو اس کے لیڈر سخت رنجیدہ ہوئے اور پنڈت نہرو نے اس رنج کا اظہار وائسرائے سے بھی کیا۔ دراصل کانگرس مسلم لیگ کو عبوری حکومت سے باہر رکھنا چاہتی تھی۔ جب محکموں کی تقسیم کا مرحلہ آیا تو کانگرس نے امور خارجہ' امور داخلہ اور دفاع ہر حال میں اپنے پاس رکھنے پر اصرار کیا۔ آخر اہم محکموں میں سے وزارت خزانہ مسلم لیگ کو دینے پر اس لئے راضی ہوگئی کہ اس کے خیال میں مسلم لیگ اس شعبے کو چلانے کی اہلیت ہی نہیں رکھتی تھی۔ خان لیاقت علی خان نے اس شعبے کو اس خوبصورت انداز میں چلایا کہ کانگرسی لیڈروں کی امیدوں پر پانی پھر گیا۔ اسی محکمے کی بنا پر کانگرس کو سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ جلد ہی کانگرسی لیڈروں کو یہ احساس ہونے لگا کہ یہ شعبہ تو درحقیقت ہر محکمے پر مسلط ہے اور اس کے ذریعے مسلم لیگ کانگرس کے پروگرام کو ناکام بنا سکتی ہے۔ کیونکہ اس کی منظوری کے بغیر کسی قسم کے اخراجات ممکن نہ تھے یہاں تک کہ ایک چپڑاسی بھی اس کی اجازت کے بغیر نہیں رکھا جا سکتا۔

یہ صورت حال اس وقت زیادہ خطرناک ہوگئی جب بجٹ پیش کرنے کا وقت آیا۔ پنڈت نہرو اور گاندھی جی غریبوں اور ناداروں کی علمبرداری کا دعویٰ کیا کرتے تھے نہرو تو سوشلسٹ مشہور تھے۔ لہٰذا جب مارچ 1947ء میں خان لیاقت علی خان نے اپنا سالانہ بجٹ پیش کیا تو

کانگرسی لیڈروں نے پہلے تو اس کی خوب تعریف کی اور منظور کر لیا۔ لیکن ہندو کارخانہ دار اور سرمایہ دار بھاگے ہوئے سردار پٹیل' راجندر پرشاد اور راجہ گوپال اچاریہ کے پاس پہنچے چونکہ انہیں کے ذریعے کانگرس کو سرمایہ ملتا تھا۔ انہوں نے اور ہندو پریس نے اس بجٹ کی مخالفت شروع کر دی یہ بڑا عجیب منظر تھا کل جو اخبارات اور دیگر ذرائع ابلاغ اس بجٹ کی تعریف کر رہے تھے اب وہی اس کے خلاف لکھ اور بول رہے تھے۔ جس سے عوام پر یہ عقدہ کھلا کہ کانگرس در حقیقت غرباء کش ہے۔ یہ بنیا ذہنیت کی مالک ہے' ان کے غریب پروری کے دعوے سراب کے سوا کچھ نہیں ہیں۔

ادھر مسلم لیگ دستور ساز اسمبلی کے اجلاس میں شریک ہونے کو تیار نہ تھی کیونکہ یہ آئین سازی میں شمولیت کو برصغیر کے مسلمانوں کے لئے حد درجہ خطرناک تصور کرتی تھی۔ اسے علم تھا کہ ہندو اکثریت ایسا آئین بنا سکتی ہے جو مسلمانوں کے لئے مہلک ثابت ہو سکتا ہے۔ لہٰذا وہ شمولیت سے پہلے یہ چاہتی تھی کہ کانگرس کابینہ مشن پلان کو صدق دل سے تسلیم کرے اور اپنی تاویلات کی نفی کرے یوں عبوری حکومت زبردست بحران کا شکار ہو گئی۔ لہٰذا اس مسئلے کو حل کرنے کے لئے برطانوی حکومت نے کانگرسی اور مسلم لیگی لیڈروں کو وائسرائے کے ساتھ لندن طلب کیا۔ جہاں دسمبر کے پہلے ہفتے میں ان کی کانفرنس منعقد ہوئی اور 6 دسمبر 1946ء کو ایک اعلان کے ذریعے تسلیم کیا گیا کہ کابینہ مشن پلان میں صوبوں کی گروپ بندی ایک لازمی شرط ہے۔ کانگرس نے حکومت کے اس اعلان پر زبردست برہمی کا اظہار کیا اور 22 دسمبر 1946ء کو اپنی ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں کابینہ مشن پلان میں شامل صوبوں کی گروپ بندی کے اصول کو حتمی طور پر مسترد کر دیا۔ اس پر مسلم لیگ نے مطالبہ کیا کہ دستور ساز اسمبلی کو توڑ دیا جائے کیونکہ کانگرس نے عملاً" وزارتی مشن پلان کو مسترد کر دیا ہے۔ اس پر نہرو اور پٹیل وائسرائے پر حملہ آور ہوئے کہ مسلم لیگ کو یا تو دستوریہ کے متعلق اپنا فیصلہ واپس لینے پر مجبور کیا جائے یا اسے عبوری حکومت سے نکال دیا جائے۔ اس پر لارڈ ویول نے لیاقت علی خان کو بلایا تو انہوں نے کہا کہ اگر حکومت دستوریہ کو 16 مئی اور 25 مئی 1946ء کے اعلانات کے مطابق کام کرنے پر مجبور کر سکتی ہے تو وہ دستوریہ کے اجلاس میں حصہ لیں گے ورنہ ہرگز نہیں۔ بلکہ مزید یہ بھی کہا کہ اگر آپ بھی یہ سمجھتے ہیں کہ کانگرس نے

مقررہ پابندیاں قبول نہیں کی ہیں تو نہ صرف مسلم لیگ دستوریہ کا بائیکاٹ کرنے میں حق بجانب ہے بلکہ بطور وزیر خزانہ میرا فرض ہے کہ ایسی دستوریہ کے لئے بجٹ فراہم نہ کروں۔ وائسرائے سخت مصیبت میں تھے۔ 20 فروری 1947ء کو وزیر اعظم برطانیہ مسٹر اٹیلی نے اعلان کیا کہ ہندوستانی دستور بنائیں یا نہ بنائیں برطانیہ جون 1948ء میں ہندوستان خالی کر دے گا' نیز لارڈ ویول کی جگہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو وائسرائے بنا کر ہندوستان بھیجا جا رہا ہے لارڈ ویول کے ساتھ کیا ہوا؟ اس کا اندازہ ابوالکلام آزاد کے ایک جملے سے ہو سکتا ہے کہ "نہرو اور اس کے رفقاء اس کے خلاف تھے اس کا جانشین اس عبرت اموز مثال کو کبھی نہیں بھولا۔" اس سے مراد یہ ہے کہ وہ کانگرس اور لیبر پارٹی کی حکومت کی باہمی سازش کا شکار ہو گیا۔

ماؤنٹ بیٹن مشن

سردار پٹیل وزارت خزانہ سے سخت نالاں تھا اس کی انا بری طرح کچلی جارہی تھی اس نے ایک پریس کانفرنس میں اعلانیہ مطالبہ کیا کہ اگر مسلم لیگ کے وزیروں کو فوری طور پر معطل نہ کیا گیا تو کانگرس حکومت سے نکل جائے گی۔ لیکن مسلم لیگ کو اب وزارت سے نکالنا کوئی آسان کام نہ تھا کیونکہ ایسا کرنے سے ملک میں امن عامہ کی حالت پہلے سے بھی بدتر ہونے کا خدشہ تھا۔ اس پر مزید ڈر یہ تھا کہ ایسی صورت میں فوج اور پولیس بھی اختلافات کا شکار ہو جائے گی۔ برطانوی حکومت ہر حال میں پورے ہندوستان کی حکومت کانگرس کو منتقل' اور مسلمانوں کو ان کے جائز حق پاکستان سے محروم رکھنا چاہتی تھی۔ انگریزوں کی اس خواہش کا اظہار ان ہدایات سے صاف طور پر ہو جاتا ہے جو ماؤنٹ بیٹن کو اس کی تقرری کے وقت برطانیہ کی حکومت نے دی تھیں۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن 22 مارچ 1947ء کو نئی دہلی پہنچا اسے ہدایت تھی کہ ہر حال میں تقسیم ہند کو روکا جائے اور کابینہ مشن پلان کے چوکھٹے میں ہندوستان کا اقتدار منتقل کرنے کی کوشش کی جائے۔ جب وہ یہاں پہنچا تو اس نے سیاسی لیڈروں سے بات چیت کا آغاز کیا تو اسے علم ہوا کہ برطانیہ والے جس چیز کو آسان تصور کرتے ہیں وہ نہایت مشکل ہے چونکہ جس کانگرس کو وہ اقتدار منتقل کرنا چاہتے تھے وہ ان کے کابینہ مشن پلان کے ہی خلاف تھے اور اس کی من مانی تاویلات کر رہے تھے اور ہر حال میں مسلمانوں کو غلام بنانا چاہتے تھے۔ ماؤنٹ بیٹن کے تعلقات پہلے ہی سے کانگرس کے ساتھ عموماً" اور نہرو خاندان کے ساتھ خصوصاً" بڑے گہرے تھے۔ یہاں تک کہ مشہور مورخ سٹینلے والپرٹ کے مطابق نہرو اور لیڈی ماؤنٹ بیٹن میں عشقیہ خط'

وکتابت اور تعلقات تھے اور اس عشقیہ خط وکتابت کا علم ماؤنٹ بیٹن کو بھی تھا۔ اس نے ان تعلقات کی بنا پر کانگرسی لیڈروں کو نوازنا شروع کر دیا۔ اب میکیاولی اور چانکیا کے شاگرد باہم مل بیٹھے تھے اور وہ اپنی تمام شاطرانہ چالوں کے ذریعے ایک مومن کو زیر دامن کرنا چاہتے تھے۔ لیکن وہ مومن ان کی لاکھ عیارانہ و مکارانہ حیلہ سازیوں اور چالوں کے باوجود پاکستان کے مطالبے پر ڈٹا رہا۔ ہندوؤں اور انگریزوں کی یہ مشترکہ کوشش تھی کہ کسی نہ کسی طریقے سے یا دھوکے سے' فریب سے' دباؤ سے' لالچ سے حصول پاکستان کی جدوجہد کے راستے سے قائد اعظمؒ کو ہٹایا جا سکے مگر وہ چٹان کی طرح اپنے نصب العین پر ڈٹے رہے۔ جب ہندوؤں اور انگریزوں کو علم ہو گیا کہ مسلمانوں میں حصول پاکستان کے لئے بے پناہ جوش و خروش موجود ہے اور وہ اس کی جدوجہد میں جان کا نذرانہ بھی پیش کرنے کو تیار ہیں' خرابی کی صورت میں تباہی اور بربادی ہے آج بھی مسلمانوں میں محمود غزنوی' شہاب الدین غوری' ظہیرالدین بابر اور احمد شاہ ابدالی پیدا ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا انہوں نے مجبوراً پاکستان کے مطالبہ کو تسلیم کر لیا لیکن درپردہ اس بات کی پوری پوری کوشش کی کہ جو پاکستان بنے وہ اتنا کمزور اور بے جان ہو کہ جلد ہی ختم ہو جائے اس مقصد کے حصول کے لئے انہوں نے بنگال اور پنجاب کی تقسیم کا بھی منصوبہ بنایا اور ان کی ایسی کانٹ چھانٹ کی جائے کہ پاکستان کی اقتصادی حالت بالکل تباہ ہو جائے اس کے ساتھ یہ بھی طے پایا کہ پاکستان بنتے ہی پورے ہندوستان میں مسلمانوں کا قتل عام شروع کر دیا جائے اور ایسی تباہ حالت میں پاکستان میں دھکیل دیا جائے کہ وہ اس نوزائیدہ ملک کے لئے بے شمار اقتصادی اور سماجی مسائل کا باعث بن جائیں۔ جب پاکستان پوری طرح ان مصیبتوں میں پھنس جائے تو کسی نہ کسی بہانے اس پر حملہ کر دیا جائے تاکہ رہی سہی کسر بھی پوری ہو جائے اور اس ملک کے لوگ تنگ ہو کر دوبارہ ہندوستان میں شامل ہو جائیں۔ یہ وہ سازش تھی جس کا مولانا ابوالکلام کو بھی علم نہ ہوا اور وہ حیران رہ گئے کہ کانگرسی لیڈروں کو آخر کیا ہو گیا ہے کہ وہ تقسیم ہند پر رضامند ہو گئے ہیں۔ چنانچہ 3 جون 1947ء کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اپنے منصوبے کا اعلان کیا جس میں کہا گیا:

1- برصغیر میں دو الگ الگ مملکتیں قائم کر دی جائیں گی جو ابتداء میں نو آبادیاتی حیثیت کی حامل ہوں گی۔

2- پنجاب اور بنگال کے مسلم اکثریت اور ہندو اکثریت کے اضلاع کے نمائندے الگ الگ اپنے اجلاس طلب کریں گے اور یہ فیصلہ دیں گے کہ وہ اپنے صوبوں کی تقسیم چاہتے ہیں کہ نہیں اگر ان دونوں میں سے ایک بھی تقسیم کا مطالبہ کرے گا تو تقسیم ہو جائے گی۔

3- آسام کے مسلم اکثریت کے اضلاع استصواب سے فیصلہ کریں گے کہ وہ پاکستان میں شامل ہونا چاہتے ہیں یا بھارت میں۔

4- سندھ اسمبلی کے ارکان کثرت رائے سے فیصلہ کریں گے کہ وہ پاکستان میں شامل ہونا چاہتے ہیں یا بھارت میں۔

5- بلوچستان کے شاہی جرگہ اور کوئٹہ میونسپل کمیٹی کو یہ فیصلہ کرنے کا حق دے دیا گیا کہ وہ کس ملک میں شامل ہونا چاہتے ہیں۔

6- صوبہ سرحد میں استصواب رائے کرایا جائے گا کہ عوام کس ملک میں شامل ہونا چاہتے ہیں۔

7- اگر صوبوں کی تقسیم کا فیصلہ ہوا تو وائسرائے فوراً" ایک کمیشن بٹھالیں گے جو تقسیم کی تفصیلات طے کرے گا۔

ان کے علاوہ منصوبہ میں یہ شقیں بھی رکھی گئیں۔

(الف) ملک تقسیم ہو یا متحدہ طور پر آزاد ہو 1935ء کے ایکٹ ہی کو مستقبل کے عارضی دستور کی حیثیت حاصل ہوگی البتہ اس میں ضروری ترامیم کردی جائیں گی۔

(ب) دونوں نو آبادیات کا گورنر جنرل مشترک ہو گا اور موجودہ گورنر جنرل کو دوبارہ گورنر جنرل مقرر کیا جائے گا۔

(ج) دونوں مرکزی حکومتوں کی سفارش پر صوبائی گورنروں کا تقرر کیا جائے گا۔

(د) جب دونوں نو آبادیات وجود میں آجائیں گی تو ہندوستان کی مسلح افواج کی تقسیم عمل میں آئے گی اس مقصد کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی جائے گی جس کا چیئرمین فیلڈ مارشل سر کلاڈ آکن لیک ہوں گے اور دونوں نو آبادیات کے چیف آف جنرل سٹاف اس کے رکن ہوں گے۔ اس کمیٹی کی نگرانی کے لئے ایک دوسری کمیٹی تشکیل دی جائے گی جس میں گورنر جنرل اور دونوں وزرائے دفاع شامل ہوں گے۔

کانگرس نے تو پہلے ہی اس کو تسلیم کر لیا تھا مگر قائد اعظمؒ نے لیگ کونسل سے مشورہ کئے بغیر رائے دینے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ طے ہوا کہ رات بارہ بجے تک اس کی قبولیت سے وائسرائے کو مطلع کر دیا جائے تاکہ برطانوی حکومت کو مطلع کیا جا سکے۔

استصواب رائے کے فیصلے

اس منصوبے میں پاکستان میں شمولیت کے بارے میں تقریباً" تمام مسلم صوبوں میں کوئی نہ کوئی رکاوٹ رکھ دی گئی تھی کہیں اسمبلی کو فیصلہ کرنا تھا کہیں عوام کو، کہیں جرگے اور میونسپل کمیٹی کے ارکان کو۔ اس استصواب رائے کے نتائج درج ذیل تھے۔

1- پنجاب اور بنگال کے ارکان اسمبلی نے تقسیم کا فیصلہ کیا اور تقسیم کے لئے ریڈ کلف کمیشن قائم کر دیا گیا۔

2- ضلع سلہٹ کے عوام نے ساڑھے آٹھ لاکھ کے مقابلے میں چوبیس لاکھ ووٹوں سے پاکستان میں شمولیت کا فیصلہ کیا۔

3- صوبہ سرحد میں سرحدی گاندھی غفار خان اور جمیعت العلماء نے پاکستان کے خلاف زبردست مہم چلائی اور استصواب کا بائیکاٹ کرنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن عوام نے نہ تو بائیکاٹ کیا اور نہ ہی ہندوستان کے حق میں ووٹ دیے۔ پاکستان کے حق میں 289244 ووٹ آئے جب کہ ہندوستان کے حق میں صرف 2873 ووٹ آئے اس طرح سرحد نے پاکستان کے حق میں ووٹ دے کر شمولیت کا فیصلہ دیا۔

4- صوبہ سندھ کی اسمبلی نے کثرت رائے سے پاکستان میں شمولیت کے حق میں رائے دی۔

5- بلوچستان کا فیصلہ بھی پاکستان کے حق میں ہوا۔

گورنر شپ کا مسئلہ

اکثر لوگ قائداعظمؒ کی سیاسی بصیرت اور ارفع واعلیٰ ذات کو بدنام کرنے کے لئے یہ کہتے ہیں کہ اگر آپ خود گورنر جنرل نہ بنتے اور ماؤنٹ بیٹن کو گورنر جنرل بنا لیتے تو پاکستان کو یہ نقصان نہ ہوتا۔ یہ مفروضہ لاعلمی اور تحریک سے عدم واقفیت کا نتیجہ ہے۔ اگر یہ لوگ 3 جون کے اعلان کا ہی مطالعہ کر لیتے تو ان پر واضح ہو جاتا کہ یہ ذات شریف پاکستان میں شامل ہونے والے علاقوں میں ہی استصواب رائے کیوں کرا رہا ہے؟ کیا اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ذرا سی خرابی بھی اگر پیدا ہو جاتی تو پاکستان کا وجود خطرے میں پڑ جاتا۔ صوبہ سرحد میں استصواب کو باچا خان (سرحدی گاندھی غفار خان) کو خوش کرنے کے لئے گاندھی جی کے ایما پر کرایا گیا۔ (بحوالہ آزادی ہند' از مولانا ابوالکلام آزاد' باب عبدالغفار خان) اس کی ہر ممکن کوشش تھی کہ پاکستان وجود میں نہ آئے اس کا اظہار اس نے فریڈم ایٹ مڈنائٹ میں کھل کر کیا ہے۔ اور یہاں تک کہہ دیا ہے کہ اگر مجھے علم ہوتا کہ مسٹر محمد علی جناح بیمار ہیں اور وہ اتنی جلدی مر جائیں گے تو میں تقسیم ہند کو اتنے عرصے تک کے لئے ٹالے رکھتا۔ اس کی دشمنی نہایت واضح تھی یہ چیز بھی تاریخ میں ریکارڈ ہے کہ جب بھارت نے کشمیر میں فوجیں داخل کر دیں تو یہاں کے انگریز چیف آف سٹاف جنرل گریسی کو قائداعظمؒ نے بلا کر کہا تھا کہ کشمیر پر حملہ کر دیا جائے تو اس نے انکار کر دیا تھا۔ ایسی صورت حال میں اندازہ کیجئے کہ اگر گورنر جنرل اور دفاعی کمیٹی کا چیرمین مشترکہ ہوتا تو پاکستان کس طرح زندہ رہتا وہ آسانی سے اپنے منصوبے کے تحت پاکستان کو ختم کر دیتے۔

1935ء کے گورنمنٹ انڈیا ایکٹ کے تحت گورنر جنرل ہی تمام قوت کا سرچشمہ ہے۔ اس کے سامنے وزیراعظم کی کوئی حیثیت ہی نہیں تھی تو ایسی صورت میں قائداعظمؒ اور پاکستانی قوم

کیا کر لیتی۔

قائد اعظمؒ نے ایک بار اس مسئلے پر بحث کرتے ہوئے کہا تھا کہ اگر پاکستان کے گورنر جنرل گورنر اور چیف آف سٹاف انگریز ہی رہتے تو ہم نے آزادی کس چیز کی حاصل کی تھی۔ عوام نفسیاتی طور پر اس کا کیا تاثر لیتے۔

ماؤنٹ بیٹن نے بار بار اس چیز کا اصرار کیا کہ اسے پاکستان کا گورنر جنرل بنایا جائے پہلے تو آپ اسے ٹالتے رہے لیکن اصرار بڑھا تو آپ نے جواب دیا کہ قوم کے مفاد کی خاطر میں نے خود گورنر جنرل بننے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ اطلاع اس کے لئے ایک برقی کرنٹ سے کم نہ تھی۔ لیکن اس نے امید نہ توڑی اور نواب آف بھوپال کو آپ کے پاس بھیجا وہ بھی اپنے مشن میں ناکام رہے یوں تو قائد اعظمؒ کے اس فیصلے سے اغیار کو دکھ ہوا ہی ہو گا لیکن مسٹر ایٹلی' نہرو اور مینن نے اس کو خصوصاً محسوس کیا۔ وہ اپنی مسلم دشمنی میں پہلے ہی نمایاں کردار ادا کر رہے تھے اب کھل کر سامنے آگئے۔ اس کے بعد ماؤنٹ بیٹن نے پاکستان کو نقصان پہنچانے کی مقدور بھر کوشش کی۔ لیکن اگر اسے گورنر جنرل بنا لیا جاتا تو پاکستان کو بہت ہی زیادہ نقصان ہوتا' بلکہ اس کا وجود ہی مٹا دیا جاتا۔

قانون آزادی ہند

4 جولائی کو قانون آزادی ہند کا مسودہ برطانوی پارلیمنٹ میں پیش کرنے سے قبل مسلم لیگ اور کانگریس سے اس کی منظوری لی گئی۔ 16 جولائی کو پارلیمنٹ نے اسے منظور کر لیا' 18 جولائی کو تاجدار نے اس پر دستخط کر دیئے اور ہند کی آزادی کے لئے 15 اگست کی حتمی تاریخ مقرر کر دی گئی۔ 20 جولائی کو پاکستان اور ہند کی آزاد عبوری حکومتیں قائم ہو گئیں۔ 7 اگست کو قائد اعظمؒ کراچی پہنچے اور 11 اگست کو پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کا پہلا اجلاس ہوا اس میں قائد اعظمؒ کو اس کا صدر منتخب کر لیا گیا اس قانون آزادی ہند میں مندرجہ ذیل ہدائت تھیں:

1- 15 اگست 1947ء سے ہند میں دو نو آبادیات قائم کر دی جائیں گی۔ ہندوستان اور پاکستان۔

2- برطانوی ہند میں شامل تمام علاقہ جات جو پاکستان میں شامل نہیں ہوں گے ہندوستان کا حصہ ہوں گے۔

3- پاکستان میں درج ذیل علاقے شامل ہوں گے:

(الف) مشرقی بنگال اور مغربی پنجاب میں شامل علاقے جو یوم آزادی سے پہلے یا بعد حد بندی کمیشن کے فیصلے کی رو سے ان دونوں میں شامل ہوں گے۔ جب تک حد بندی آخری شکل نہیں پاتی اس وقت تک مغربی پنجاب میں گوجرانوالہ' گورداسپور' لاہور' شیخوپورہ' سیالکوٹ' راولپنڈی' اٹک' گجرات' جہلم' میانوالی' شاہ پور' ڈیرہ غازی خان' جھنگ' لائل پور' منٹگمری' ملتان اور مظفر گڑھ کے اضلاع شامل ہوں گے۔ مشرقی بنگال میں چٹاگانگ' نواکھلی' پترا' باقر گنج' فرید پور' ڈھاکہ' میمن سنگھ' جیسور' مرشد آباد' ندیا' بوگرہ' دیناج پور' پنبہ' راج شاہی اور رنگ پور کے اضلاع شامل ہوں گے۔

(ب) شمال مغربی صوبہ کے علاقے بشرطیکہ وہاں کے عوام پاکستان کے حق میں استصواب کا فیصلہ کریں۔
(ج) صوبہ سندھ اور بلوچستان (جس علاقے کا ذمہ دار چیف کمشنر ہوتا ہے)۔
4- یوم آزادی کے بعد کوئی علاقہ کسی بھی ملک میں شامل ہونے کا مجاز ہو گا بشرطیکہ وہ ملک اس کو منظور کرے اور کسی بھی ملک سے علیحدہ ہونے کا مجاز ہو گا بشرطیکہ وہ ملک اس کی اجازت دے۔
5- برطانیہ کے زیر حفاظت ریاستوں کو حق حاصل ہو گا کہ وہ جس ملک کے ساتھ چاہیں شامل ہو جائیں۔
6- ضلع سلہٹ کے بالغ رائے دہندگان اگر کثرت رائے سے فیصلہ کریں تو اس ضلعے کو آسام سے کاٹ کر مشرقی بنگال کا حصہ بنا دیا جائے گا۔
7- جہاں کہیں صوبے کو تقسیم کرنے کا فیصلہ کیا گیا وہاں وائسرائے باؤنڈری کمیشن مقرر کرے گا جس کے چیرمین کی رپورٹ آنے پر آخری حد بندی کی جائے گی۔
8- نو تشکیل شدہ نو آبادیات کا ایک ایک گورنر جنرل ہو گا جو تاج برطانیہ کی طرف سے آئین کی منظوری کا حق رکھے گا۔ البتہ استرداد اور التوا کے وہ تمام حقوق وہ استعمال نہیں کر سکے گا جو تاج برطانیہ کو حاصل رہے ہیں نیز جب تک کہ دونوں ملکوں میں سے کسی کی مجلس دستور ساز اس کے خلاف فیصلہ نہ کرے دونوں نو آبادیات کا گورنر جنرل ایک ہی ہو گا۔
9- دونوں ملکوں کی مجالس قانون ساز کو اپنے اپنے ملک کے لئے قانون بنانے کا حق ہو گا موجودہ قوانین میں ترامیم و تنسیخ کا حق بھی انہیں ہو گا اور برطانوی پارلیمنٹ کا پاس کردہ کوئی قانون ان پر نافذ نہیں ہو گا بشرطیکہ وہ خود ہی اس کا فیصلہ کریں اسی طرح پریوی کونسل میں پاس کردہ احکام بھی ان ملکوں پر نافذ العمل نہیں ہوں گے۔
10- انتقال اقتدار 1935ء کے ایکٹ کی بنیاد پر ہو گا۔
11- گورنر جنرل مسلح افواج کو دونوں ملکوں میں تقسیم کرنے کے لئے اقدامات کریں گے اور تقسیم کی تکمیل تک افواج کی کمان ان کے پاس رہے گی۔
12- اس ملک (ہندوستان) میں رائج قوانین دونوں نو آبادیات میں نافذ رہیں گے۔ یہاں تک

کہ مجلس قانون ساز کسی قانون میں ترمیم یا اضافہ کرے یا کوئی بااختیار اتھارٹی اس طرح کا کوئی فیصلہ کرے۔

قیام پاکستان

13 اگست 1947ء کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن کراچی آیا تاکہ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کو اقتدار منتقل کرے اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے اس نے اکبر کی رواداری کی تلقین کی جس کے جواب میں قائداعظمؒ نے فرمایا:

"ہندوستان میں اکبر نے غیر مسلموں کے ساتھ رواداری اور خیرسگالی کا جو برتاؤ کیا وہ مسلمانوں کی تاریخ کا کوئی نیا' اچھوتا یا واحد واقعہ نہیں ہے بلکہ اس کی بنیاد آج سے تیرہ سو سال پہلے اس وقت رکھ دی گئی تھی جب ہمارے نبی کریمؐ نے یہودیوں اور عیسائیوں پر فتح پائی تھی۔ مسلمانوں کی ساری تاریخ اس قسم کی ہمدردی پر مبنی بلند اصولوں سے بھری پڑی ہے۔"

قیام پاکستان قائداعظمؒ کی تاریخ ساز شخصیت کا وہ کارنامہ ہے جس پر جس قدر فخر کیا جائے کم ہے۔ مسلمانان ہند پر یہ آپ کا ایک عظیم احسان ہے۔ یہ آپ کی پاکیزگی خیالات' صاف گوئی' راست بازی' مستقل مزاجی' اعلیٰ سیاسی بصیرت اور اصول پرستی کا ثمر ہے۔ جو سیاسی تاریخ کی وہ جدوجہد ہے جس کی تاریخ عالم میں کوئی نظیر نہیں۔

قائداعظمؒ زندہ باد ------- پاکستان پائندہ باد

تحریک پاکستان میں نوجوانوں کا کردار

تحریک پاکستان دنیا کی عظیم ترین تحریکات میں سے ایک ہے جو مسلمانوں کی امنگوں اور آرزوؤں کی مظہر ہے۔ اس تحریک میں قائد اعظمؒ کی قیادت میں پوری قوم نے ملی جذبہ سے سرشار ہو کر حصہ لیا قائد اعظمؒ نے ایسا ولولہ تازہ دلوں کو دیا کہ نہتی مسلمان قوم برطانوی سامراج سے ٹکرا گئی۔ تحریک پاکستان کا روشن ترین پہلو یہ ہے کہ اس میں نوجوان طلباء و طالبات اور دیگر لوگوں نے اہم کردار ادا کیا۔ انہوں نے خلوص و ایثار سے پاکستان کی مشعل کو روشن کیا۔ تحریک پاکستان کی تاریخ ان عظیم نوجوانوں کے کارناموں سے جگمگا رہی ہے۔ حکیم الامت علامہ اقبالؒ نے 1932ء میں لاہور میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا "آتش شباب (نوجوانوں) اور سوز یقین کو امتزاج ہونے دیجئے اسی سے ہماری قومی زندگی کا شعلہ فروزاں ہوگا اور ایک نئی دنیا تخلیق ہوگی"۔ یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ جب یہ آتش شباب تحریک میں داخل ہوا تو یہ شعلہ جوالہ بن گئی۔ تحریک آزادی کے ہر موقع پر مسلمان نوجوانوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا انہوں نے برطانوی سامراج کو دعوت مبارزت دی۔ تحریک خلافت ہو یا جنگ طرابلس، ہجرت کی تحریک ہو یا آزادی کشمیر، ہر جگہ ہر مقام پر یہ جواں خون ہراول دستہ رہا۔ وہ ہندوستان کے طول و عرض میں پھیل گئے ہر ایک دروازہ کھٹکھٹایا۔ دوست تو دوست، وہ دشمن سے بھی خندہ پیشانی سے ملے۔ انہوں نے دور دراز کے سفر کئے اور گھر گھر پاکستان کا پیغام پہنچایا۔ ان کی جدوجہد میں رکاوٹیں ڈالیں گئیں۔ مصائب کے پہاڑ کھڑے کئے گئے، مشکلات نے راستے روکے، مخالفتوں کی آندھیاں چلیں لیکن یہ جیالے نوجوان اپنی منزل کی طرف رواں دواں رہے۔ لیکن یہ سب کچھ ہمت مرداں کے لئے پرکاہ کی

حیثیت رکھتے تھے ہمارا جواں خون سیل رواں کی طرح ان سب کو بہا کرلے گیا۔ قائداعظمؒ نے اسی بنا پر فرمایا تھا:

"طلباء میرے جسم میں دل کی دھڑکن کی مانند ہیں"

یہ بات مسلمہ ہے کہ علی گڑھ کے طلباء تحریک پاکستان کا ہراول دستہ تھے لیکن پنجاب میں تحریک پاکستان کو مقبول بنانے میں یہاں کے نوجوان طلباء نے اہم کردار ادا کیا۔ اسلامیہ کالج لاہور تحریک کا مرکز تھا۔ ایم اے او کالج امرتسر' اسلامیہ کالج' جالندھر' کے نوجوانوں نے پورے جوش وجذبہ سے تحریک پاکستان کا ساتھ دیا۔ انہوں نے اپنا جیب خرچ مسلم لیگ کے فنڈ میں دیا۔ وہ میلوں پیدل چلتے اور دیہات میں لوگوں کو پاکستان کے بارے میں بتاتے۔ انہوں نے خیبر سے راج کماری تک تمام فضا کو بدل دیا اور مسلمانان ہند کے دلوں میں پاکستان کے لئے بے پناہ لگن اور جذبہ پیدا کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کا عظیم الشان معرکہ قائداعظمؒ کی قیادت میں نوجوان خون کی بے پناہ کارکردگی سے سرہوا۔ انہوں نے پاکستان کی منزل آسان کردی۔

1930ء میں علامہ اقبالؒ نے مسلمانوں کے لئے الگ وطن کا مطالبہ پیش کیا۔ جس کو مخالفین نے شاعر کا خواب قرار دیا۔ لیکن اسی زمانہ میں انگلستان میں ایک نوجوان زیر تعلیم تھا۔ اس نے اس نظریہ کی تشہیر کی ٹھانی۔ جب گول میز کانفرنسوں کا سلسلہ شروع ہوا تو اس نے ایک کتابچہ بعنوان "اب یا کبھی نہیں" شائع کیا۔ جس میں اس نے مسلمان علاقے کا نام "پاکستان" تجویز کیا۔ یہی پاکستان بعد میں سب مسلمانان ہند کے ارادوں اور مقاصد کے لئے نصب العین بن گیا یوں نوجوان خون کو یہ فخر حاصل ہے کہ پاکستان کا نام تجویز کرنے والا طالب علم تھا۔ یہ نوجوان طالب علم رحمت علی تھے جن کے موئدین میں خان محمد اسلم خان خٹک' صاحبزادہ شیخ محمد صادق اور خان عنایت اللہ خان جیسے لوگ شامل تھے۔

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے طلباء نے اپنی ایک الگ تنظیم قائم کی جس کا نام آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن رکھا۔ دسمبر 1937ء میں اس فیڈریشن کا پہلا اجلاس کلکتہ میں ہوا۔ جس کی صدارت حضرت قائداعظمؒ نے کی۔ اس فیڈریشن نے سب سے زیادہ کام بنگال میں کیا جو ہندوؤں کا گڑھ تھا اس کی ایک شاخ بنگال سٹوڈنٹس فیڈریشن تھی۔ اس فیڈریشن کے راہنماؤں میں تسنیم ظہیرالدین' اے ٹی ایم مصطفےٰ' فضل القادر چودھری' محمود علی اور عزیز

الرحمان شامل تھے جنہوں نے پاکستان کے لئے شب و روز محنت کی۔ یہ ان کی مساعی جمیلہ کا اثر ہے کہ بنگال کے مسلمان پاکستان کی حمایت پر اٹھ کھڑے ہوئے۔ ہندوؤں نے ان بنگالی نوجوانوں کو پھانسنے کے لئے مختلف فتنے پیدا کئے۔ بڑے بڑے دام پھیلائے۔ مگر انہوں نے ہندوؤں کے دجل و فریب کو بے نقاب کیا۔ ہمیں یہ علم ہے کہ بنگال کی سیاست بڑے نازک دور سے گزری ہے۔ بڑی بڑی قوتیں مطالبہ پاکستان کے خلاف صف آرا تھیں لیکن نوجوان خون عزم و ہمت کا پیکر بنا رہا۔ اس نے جہد مسلسل اور عزم صمیم سے طاغوتی طاقتوں کو شکست فاش دی۔ انہوں نے بنگال کے قریہ قریہ کا دورہ کیا اور اسلامی محبت و اخوت کے ایسے چراغ جلائے کہ جن کو کوئی بجھا نہ سکا۔

پنجاب میں ان دنوں ایک جماعت بعنوان "انٹر کالجیٹ مسلم برادر ھڈ" سرگرم عمل تھی لیکن اس کی سرگرمیوں کا دائرہ بہت محدود تھا۔ وہ سب لوگ حضرت علامہ اقبالؒ کے پاس گئے کہ رہنمائی حاصل کریں چنانچہ ان کے ارشاد پر مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کی بنیاد رکھی گئی۔ اس کے آئین میں "آزاد ملی ریاست کا حصول" شامل تھا۔ 1941ء میں اس فیڈریشن نے پاکستان کانفرنس کا انعقاد کیا۔ جس میں خاطر خواہ کامیابی ہوئی۔ اس موقع پر قائد اعظمؒ نے فرمایا تھا:

"طلباء میرے ساتھی ہیں ان کی ناقابل فراموش خدمات نے قوم کی تقدیر بدل ڈالی ہے۔" ان طلباء نے جاگیرداری' فسطائیت' ہندو پروری' نوکر شاہی اور ظلم و ستم کے اپنی شعلہ بیانی' حق گوئی اور بیباکی سے پرخچے اڑا دیئے۔

پنجاب میں جب خضر حیات کی وزارت کے خلاف علم بلند ہوا تو یہ نوجوان خون پیش پیش تھا۔ اسلامیہ کالج کے ایک نوجوان طالب علم عبدالمالک نے پاکستان کے لئے اپنی جان کا نذرانہ پیش کیا اس طرح مسلمان طلباء کو یہ فخر حاصل ہوا کہ پاکستان کا اولین شہید ایک نوجوان طالب علم ہے۔ حضرت قائد اعظمؒ نے 1946ء میں راست اقدام کا اعلان کیا کہ اگر مسلمانوں کو حقوق نہ دیئے گئے تو مسلمان کسی قربانی سے دریغ نہ کریں گے۔ راست اقدام کے دوران کلکتہ اور دیگر شہروں میں ہنگامے ہوئے جن میں کئی طلباء نے اپنی جانیں قربان کیں۔ ان عظیم قربانیوں اور واقعات کی سنگینی نے انگریزی حکومت کو ہلا کے رکھ دیا اور وہ حضرت قائد اعظمؒ کی طرف دست تعاون بڑھانے پر مجبور ہو گئے۔

1946ء کے انتخابات کی مہم کی کامیابی کا سہرا ان عظیم جیالوں کے سر ہے چونکہ انہوں نے ہندوستان کے کونے کونے میں آزادی کی آواز کو پہنچایا۔ آزادی کے پروانوں نے آزادی کا پرچم ہر جگہ بلند کیا۔ یہ مختلف گلیوں اور کوچوں میں پاکستان کا پرچم لہراتے رہے ان کے ہاتھوں میں آزادی کے بینرز تھے جن پہ نعرے رقم تھے:۔

پاکستان کا مطلب کیا ---------- لا الہ الا اللہ

لے کے رہیں گے پاکستان ---------- بن کے رہے گا پاکستان

ان نعروں نے خرمن باطل کو جلا کر خاکستر کر دیا۔ سامراجیت کے قدم ڈگمگا گئے' فسطائیت نے دم توڑ دیا' جاگیریت کے سائے سمٹنے لگے' ظلم و ستم کی آندھیاں چھٹ گئیں۔ غلامی کی زنجیریں ٹوٹ گئیں اور آخر کار 14 اگست 1947ء کو پاکستان معرض وجود میں آگیا۔

میرے عزیز دوستو! یہ پاکستان ہمارے عظیم بھائیوں کی عظیم کاوشوں کا ثمر ہے۔ وہ اپنا فرض احسن طریق سے ادا کر گئے ہمیں ایک مقدس ملک اور عظیم نعمت آزادی عطا کر گئے۔ آج ہم سب کا یہ فرض ہے کہ اس امانت کی حفاظت کریں۔ اس کی آزادی' بقاء اور سلامتی کے دفاع کے لئے برسر عمل رہیں۔ اس کی ترقی اور درخشاں مستقبل کے لئے ہر وقت کوشاں رہیں۔ پاکستان دشمن عناصر کا کبھی ساتھ نہ دیں۔ اور کسی غیر کے آلہ کار نہ بنیں۔ پاکستان کی عظمت ہماری عظمت' پاکستان کی عزت ہماری عزت ہے۔ ہماری زندگی کا نصب العین صرف اور صرف پاکستان کی خوشحالی' ترقی اور بقاء و سلامتی ہونا چاہیے۔

قیام پاکستان میں علماء کا کردار

یہ ایک رسم چل نکلی ہے کہ یہاں کا ہر چھوٹا بڑا دیہاتی ہو یا شہری ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا ہے کہ لوگوں کو یہ باور کرائے کہ اس کے آباؤ اجداد نے یا اس کے طبقے کے لوگوں نے قیام پاکستان میں بہت بڑا کردار ادا کیا ہے۔ حالانکہ تاریخی لحاظ سے ایسے لوگوں کی اکثریت ہندو کانگرس کے دامن عافیت میں بیٹھے مسلمانان ہند کو دھوکہ اور فریب دے رہے تھے۔ تقریباً" ہر یوم آزادی پر اخبارات میں مذکورہ بالا عنوان پر ایک مضمون ضرور ہوتا ہے۔ جس میں یہ باور کرانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ علماء نے اس تحریک آزادی میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ بے شک علماء کے ایک حصے نے نہایت اہم اور قابل فخر کام انجام دیا ہے۔ لیکن ان مضامین میں کئی ایک ایسے اسمائے گرامی بھی آتے ہیں جو پاکستان کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے اور کانگرس کی ہمنوائی میں مسلمانان ہند کو گمراہ کرنے' قائد اعظم" کے لئے مشکلات پیدا کرنے اور کانگرس کے متحدہ قومیت کے نظریئے کو تقویت پہنچانے میں لگے ہوئے تھے۔

میں یہ بات تو بلا خوف تردید تسلیم کرتا ہوں کہ علمائے کرام نے اسلام کو لوگوں تک پہنچانے کی سعی و کوشش کی اور اس ضمن میں کئی کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ اگر ہندوستان میں اسلام کی اشاعت و تبلیغ کا فریضہ اولیائے اللہ نے انجام دیا۔ تو ان اللہ کے بندوں نے مسلمانوں میں اسلام کو قائم رکھنے کی ضرور کوشش کی۔ اور تکالیف و مصائب بھی برداشت کیئے۔ حضرت شیخ احمد سرہندیؒ، حضرت شاہ ولی اللہؒ اور دیگر اکابرین کے اسمائے گرامی ہمیشہ سنہرے حروف سے لکھے جائیں گے۔ علماء کی یہ روش تحریک پاکستان اور بعد میں بھی چلتی رہی۔ ان کی اس روش سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہندو کانگرس نے دولت اور پراپیگنڈے سے

ان کو اپنے ساتھ گانٹھ لیا۔ تو ہمارے بہت سے بڑے بڑے علماء جو بعد میں نیشنسٹ علماء کے نام سے مشہور ہوئے انہوں نے اپنے مخصوص نظریات کے سبب حصول پاکستان کی جدوجہد میں مسلم لیگ اور قائداعظم کا ساتھ نہ دیا۔ علماء کے قائداعظم اور مسلم لیگ کی حمایت نہ کرنے کی بنیادی طور پر درج ذیل وجوہ تھیں:

1- مسلم لیگ کی قیادت قائداعظم کے ہاتھ میں تھی جو مغرب کے پروردہ تھے وہ مغربی سوٹ زیب تن کرتے' زیادہ تر انگریزی میں یا ٹوٹی پھوٹی اردو میں بات کرتے' ان کی داڑھی نہ تھی' نہ وہ کسی کو دھوکہ دینا چاہتے تھے۔ ان لوگوں میں سے اکثریت کے نزدیک ان کا مسلمان ہونا بھی مشتبہ تھا۔ اس پر متضاد یہ کہ حضرت قائداعظمؒ نے ایک پارسی لڑکی رتن بائی (جو مسلمان ہو گئی تھی) سے شادی کرلی تھی۔ اس پر ان لوگوں نے خوب شور مچایا یہاں تک کہ مسٹر مظہر علی اظہر نے بھرے جلسے میں یہ شعر پڑھا:

ایک کافرہ کے واسطے اسلام کو چھوڑا
یہ کافر اعظم ہے کہ ہے قائد اعظم

حالانکہ اس سے قبل مسٹر آصف علی' مسٹر ہمایوں کبیر اور ڈاکٹر خان صاحب وغیرہ نے ہندو عورتوں سے شادیاں کی تھیں لیکن ان علماء کے کانوں پر جوں بھی نہ رینگی تھی۔ چونکہ یہ کانگرس میں تھے اور ہندو مسلم اتحاد کے علمبردار تھے۔

2- ہمارے علماء کم علمی کی بنا پر قوم اور قومیت کے مسئلے میں الجھ کر رہ گئے تھے وہ وطن پرستی کو ہی قومیت کا نام دے رہے تھے حالانکہ مغربی نظریہ قومیت بہت اور ہے اور اسلامی نظریہ قومیت کچھ اور ہے۔ اور اس موضوع پر اقبال اور مولانا حسین احمد مدنی کے درمیان ایک بہت بڑا مکالمہ چل چکا تھا۔ لیکن انہوں نے راہ راست پر آنے کی زحمت گوارہ نہ کی۔

3- ہمارے علماء مولانا ابوالکلام آزاد کو امام الہند قرار دے چکے تھے اور وہ کانگرس کی گود میں عیش و عشرت کی زندگی بسر کر رہے تھے اور انہوں نے مسلمانوں کو دھوکہ دینے کے لئے 1946ء تک انہیں کانگرس کا صدر بنا رکھا تھا اور انہیں مسلمانوں کی تکلیف اور دکھ کا ذرا برابر احساس نہ تھا۔ یہاں تک کہ 1937ء تا 1939ء ہندوؤں نے جو مسلمانوں پر ظلم توڑے اس سے انگریز

جیسی متعصب قوم ٹھرا اٹھی، لیکن انہیں ذرا برابر احساس نہ ہوا۔ بلکہ انہوں نے اس کا انکار ہی کردیا۔ اس صورت حال نے علماء کو ایک کڑے امتحان میں ڈال دیا تھا۔

4- مسلم لیگ نے 23 مارچ 1940ء کو قرار داد پاکستان منظور کر کے اپنا نصب العین مقرر کر لیا تھا لیکن پھر مسلم لیگ 1942ء کی کرپس اور بعد میں کابینہ پلان کے تحت آئینی تحفظات کی بات کرتی رہی جس کی وجہ سے علماء بھی بے یقینی کا شکار رہے اور جب 1946ء کے انتخابات نے مسلمانوں کے مطالبہ پاکستان پر مہر تصدیق ثبت کردی تو ان کے عمل کا وقت گزر چکا تھا۔ اب اگر وہ مسلم لیگ میں آتے بھی تو وقت کے گزر جانے کی بنا پر ان کی قدر بھی زائل ہو چکی ہوتی۔

اس طرح ہندوستان کے بہت سے علماء اپنی کوتاہ اندیشی، کم علمی، مفاد پرستی اور تقلید کی بنا پر ایک بہت بڑی بازی ہار گئے۔ اسی چیز کا رونا روتے ہوئے مولانا مناظر احسن گیلانی (شیخ التفسیر جامعہ عثمانیہ) نے مولانا عبدالماجد دریا آبادی کے نام خط میں لکھتے ہیں:

"دیوبند ہی میں نہیں طبقہ علماء کا حال ہر جگہ قابل رحم حد تک پہنچ چکا ہے۔ اپنی فوج کو خود اپنے ہاتھوں انہوں نے ضائع کیا ہے۔ اب اگر مذہبی بیباکیوں کی طرف سے کوئی اقدام خدا نخواستہ پیش آیا تو ان مولویوں سے کوئی پوچھے کہ اپنی کس قوت کا دباؤ ڈال کر ان شرارتوں کا مقابلہ کریں گے۔ جمیعت العلمائے اسلام کلکتہ نے گو ایک محاذ مولویوں کے لئے قائم کر دیا ہے لیکن عوام ان کے ہاتھوں سے نکل چکے ہیں۔ اب ان پر قابو پانا آسان نہیں ہے۔ افسوس کہ خود اپنے ہاتھوں اپنے پیر پر کلہاڑی ان مولویوں نے چلائی۔ تاہم محمد رسول ^ کے دین کا محافظ وہی ہے۔ جس نے اس کی حفاظت کی ذمہ داری لی ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ علماء ہمارے ہاں کسی نسل کا نام نہیں مجھے تو کچھ ایسا نظر آتا ہے کہ تعلیم یافتوں کی تعلیم میں دین کا عنصر شریک کر کے علماء کی قیادت کی باگ قدرت اب تعلیم یافتوں کے سپرد کر دے گی۔ آئندہ عہد انشاء اللہ محمد علیوں اور اقبالوں کے ہاتھ میں رہے گا۔"

قائد اعظم اور ان کا عہد، صفحہ 395

مذکورہ بالا کیفیت کا اندازہ اس خط سے ہو سکتا ہے جو مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی نے مولانا شبیر احمد عثمانی کو اعلان حمایت کے رد عمل میں لکھا تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

"مجھ کو آپ کے اس لکھنے سے کہ جناح کو ہندوستان کا سیاسی قائد تسلیم کیا جائے' بڑا دکھ ہوا گویا کہ ہندوستان کے قرآن کے مفسر نے انگریزی دان طبقے کے سامنے اقرار کر لیا ہے کہ مولوی سیاست نہیں جانتا اور یہ بھی اقرار کر لیا ہے کہ وقت کی سیاست کو قرآن کا سب سے بڑا مفسر نہ چلا سکتا ہے اور نہ سمجھ سکتا ہے یہ علماء کے قتل کا فتویٰ نہیں تو اور کیا ہے۔"

مسلم لیگ اور قائداعظم کے کاز کی سب سے پہلے حضرت اشرف علی تھانوی' حضرت شبیر احمد عثمانی اور اس سلسلے کے علماء نے حمایت کی۔ ان کو بھی سخت تنقید کا سامنا کرنا پڑا لیکن انہوں نے ہمت نہ ہاری اور حضرت قائداعظم کی روحانی اور اسلامی تربیت بھی کرتے رہے۔ اسی زمانے میں قائداعظم نے اسلام کا گہری نظر سے مطالعہ بھی کیا۔ وہ علماء کی مسلمانوں پر گرفت اور قوت سے آگاہ تھے۔ چنانچہ انہوں 30 اگست 1946ء کو قیصر باغ' بمبئی میں جشن عید میلاد کے موقع پر علماء سے اپیل کی کہ وہ اس نازک وقت میں متحد ہو جائیں اور مسلم لیگ کی حمایت کریں۔ اس اپیل کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا اور بعض مقتدر علماء و صوفیاء نے حمایت کا اعلان کر دیا جن میں سید محی الدین لال بادشاہ' پیر مکھڈ شریف اور مولانا داؤد غزنوی شامل تھے۔ پیر مانکی شریف جو پہلے ہی مسلم لیگ میں شامل ہو چکے تھے انہوں نے 19 اکتوبر 1945ء کو علماء کنونشن سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

"اس وقت مسلمانوں کو باہمی اتحاد کی ضرورت ہے ہر مسلمان کو حصول پاکستان کے لئے پوری جدوجہد کرنی چاہیے۔ جہاں وہ عزت اور آزادی سے رہ سکیں۔ حصول پاکستان کا اس سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں ہو سکتا کہ ہر مسلمان مسلم لیگ میں شریک ہو کیونکہ صرف مسلم لیگ ہی ایک ایسی جماعت ہے جو صرف اسلام اور مسلمانوں کی سربلندی اور آزادی کے لئے کوشاں ہے۔"

انوار عثمانی' صفحہ 63-159

شیخ المشائخ حضرت دیوان سید آل رسول بیرہ و سجادہ نشین درگاہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری بیماری کی بنا پر علماء اسلام کانفرنس کلکتہ میں خود شریک نہ ہو سکے لیکن اپنا پیغام غازی محی الدین اجمیری کے ذریعے بھجوایا کہ:

"اس وقت ہندوستان میں سب سے زیادہ ضروری اور ہم سب کی توجہ کے قابل یہ مسئلہ

ہے کہ مسلم لیگ کی واحد نمائندگی کے دعوے میں ہم پورے اتر جائیں اور قائداعظم محمد علی جناح کی قیادت قائم و برقرار رہ جائے' اغیار اور معاندین اسلام ہماری واحد نمائندگی اور قیادت کی دھجیاں فضائے آسمانی میں اڑا دینا چاہتے ہیں۔ ہم کو بڑے استقلال اور بامردی کے ساتھ اس دعوے کو ثابت کرنا ہے اور اس قیادت کے قیام و بقا کے لئے کام کرنا ہے۔ میں اپنے اس سلسلے کی خانقاہوں کے سجادگان سے جدامجد حضرت خواجہ غریب نواز کے نام پر اپیل کرتا ہوں کہ وہ اپنی اپنی گدیوں کو چھوڑ کر اس نازک وقت میں اسلام کی خدمت کے لئے نکل پڑیں اور مسلم لیگ کے امیدواروں کو کامیاب بنانے کے لئے کمربستہ ہو کر میدان میں آجائیں۔"

خطبات قائداعظم صفحہ 79-478

شمس العلماء حضرت خواجہ حسن نظامی نے 21 نومبر 1945ء کو اعلان کیا کہ حضرت پیر مہر علی شاہ کے سجادہ نشین پیر غلام محی الدین نے اپنے مریدوں کو حکم دے دیا کہ وہ مسلم لیگ کا ساتھ دیں۔

9 جنوری 1946ء کو حضرت مولانا فضل شاہ سجادہ نشین جلال شریف نے اعلان کیا کہ تنظیم ملی کا تقاضا ہے کہ مسلمان مسلم لیگ کو ووٹ دیں۔

قائداعظم اور ان کا عہد' صفحہ 05-404

سجادہ نشین عبدالرشید نے پانی پت سے درج ذیل بیان دیا: "اس وقت مسلمانان ہند کی واحد نمائندہ جماعت مسلم لیگ ہے اور پاکستان مسلمانان ہند کا بہترین نصب العین ہے۔"

مولانا غلام مرشد نے اعلان کیا: "علماء پاکستان کے لئے اپنے خون کا آخری قطرہ بھی بہا دیں گے۔" انقلاب' 28 جنوری 1946ء

یہ اور اس طرح کے بہت سے بیانات و اعلانات جمع کئے جا سکتے ہیں جن سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ تحریک پاکستان میں بریلوی مکتب فکر کے علماء و مشائخ نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ جب کہ جمیعت العلمائے اسلام ہند' احرار تحرک' خاکسار تحریک نے اس کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ یہاں تک کہ خاکسار تحریک کے رفیق صابر نامی ایک شخص نے 26 جولائی 1943ء کو قائداعظم پر قاتلانہ حملہ بھی کر دیا۔ جس میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو بچالیا۔ یہ اور اس قسم کی حرکات انسان صرف اسی صورت کرتا ہے جب وہ یاس اور ناامیدی کا شکار ہو جاتا ہے۔

جب تحریک پاکستان اپنے مقاصد کے نزدیک پہنچ گئی تو یہ لوگ ناامیدی کا شکار ہو گئے۔ چونکہ مسلمانان ہند کے مقاصد سے غداری اور اپنی مفاد پرستی کی بنا پر وہ اس مقام پر پہنچ گئے تھے اور بقول مناظر احسن گیلانی "اپنے پاؤں پر کلہاڑی مار چکے تھے۔" میں نے یہ سب کچھ کسی عناد یا دشمنی کی بنا پر نہیں لکھا بلکہ حق و صداقت کی طرف قاری کی راہنمائی کرنے کی سعی و کوشش کی ہے۔

تقریر سرسید احمد خان 1883ء

12 جنوری 1883ء کو سرسید احمد خان نے وائسرائے لارڈ رپن کی کونسل میں جو تقریر کی تھی اس کا متن درج ذیل ہے:

انگلستان سے (انتظام و انصرام ملکی کے) نمائندہ اداروں کو مستعار لیتے وقت ان سماجی اور سیاسی حقیقتوں کو ذہن میں رکھنا مناسب ہوگا جو ہمارے ملک کو انگلستان سے جدا اور متفرق کرتی ہیں۔ ہندوستان اصل میں ایک ایسا براعظم ہے جہاں مختلف نسلوں سے تعلق رکھنے اور مختلف مذاہب کے ماننے والے لوگ بس رہے ہیں۔ مذہبی رسوم و رواج کی شدت نے پڑوسیوں تک کے درمیان فاصلہ اور بعد پیدا کر رکھا ہے۔ ہر طرف ذات پات کے امتیازات پروان چڑھ رہے ہیں۔ حتیٰ کہ ایک چھوٹے سے ضلع ہی میں آپ کو مختلف مذہبی اور نسلی گروہ مل جائیں گے ان میں سے کچھ خوش حال تاجر ہیں اور کچھ علم و فضل کے حامل باعزت لوگ ہیں ایک گروہ دوسرے سے تعداد میں زیادہ اور ترقی میں نمایاں بھی ہو سکتا ہے اور یوں بھی ہو سکتا ہے کہ ایک گروہ مقامی اور ضلعی انتظامی اداروں میں مناسب نمائندگی کا پورا احساس رکھتا ہو۔ اور دوسرا گروہ سرے سے اس سلسلے میں قطعی لاپرواہ ہو۔ بہرحال اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس ملک میں نمائندہ اداروں کی ترویج میں بہت سی پرخار مشکلات حائل ہونگی اور ان کی راہ میں سماجی اور سیاسی خطرات درپیش ہونے کا بھی احتمال رہے گا۔ انگلستان میں جہاں نسلی امتیازات ختم ہو چکے ہیں اور جہاں رواداری کے جذبے نے مذہبی خلافات بہت کم کر دیے ہیں ایسی مشکلات پیدا نہیں ہوتیں۔

مذہبی اور نسلی ہم آہنگی نے انگلستان کو ایک قوم واحد بنا دیا ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ تعلیم کے فروغ نے رفاہ بہبود عام سے متعلق جزوی اختلافات کو بھی بڑی حد تک ختم کر دیا ہے۔ اب صورت یہ ہے کہ عیسائی پارلیمان میں ایک یہودی کو بھی اپنا نمائندہ بنانے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے۔ مختصر یہ کہ سیاسی اور سماجی محور پر انگلستان کے لوگ ایک قوم ہیں لیکن ہندوستان جیسے ملک میں جہاں ذات پات کے اختلافات ابھی تک باقی ہیں اور جہاں مختلف نسلیں اب تک ایک دوسرے سے فاصلے پر ہیں، جہاں مذہبی اختلافات نہ صرف قائم ہیں بلکہ فروغ پا رہے ہیں، جہاں جدید نظریات کے مطابق تعلیم سب ٹولوں میں یکساں نہیں ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ایسے حالات میں مقامی اداروں اور ضلعی کونسلوں کی آئینی تشکیل کے لئے اس اصول انتخاب کی ترویج جو اپنی نوعیت میں بہت سادہ اور غیر مشروط ہے بجائے تمدنی ترقی کے بہت سی قباحتوں کا شاخسانہ بن جائے گی۔ جب تک ہندوستان میں نسلی اور مذہبی اختلافات سماجی زندگی کا نمایاں حصہ بنے رہیں گے اس وقت تک انتخابات کے یہ سادہ اصول ملک میں تسلی بخش طور پر کار آمد ثابت نہیں ہوں گے۔ بڑی قوم چھوٹی قوم پر پوری طرح حاوی ہو جائے گی اور عام جاہل لوگ حکومت کو مورد الزام ٹھہرائیں گے کیونکہ اسے اقدامات کو اپنانے سے مختلف قوموں میں اختلافات اور بڑھتے ہی چلے جائیں گے۔

شملہ وفد کا سپاسنامہ

یہ سپاسنامہ وائسرائے اور گورنر جنرل ہند لارڈ منٹو کو مسلمانان ہند کے ایک وفد کی جانب سے یکم اکتوبر 1904ء میں شملہ میں پیش کیا گیا۔

والاقدر!

ہمیں اپنی معروضات پیش کرنے کی جو اجازت مرحمت ہوئی اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہم زیر دستخطی عمائدین' جاگیرداروں' تعلقہ داران' وکلاء' زمیندار' سوداگران اور ملک کے مختلف گوشوں میں آباد ملک معظم کی مسلمان رعایا کے دیگر نمائندگان نہایت ادب و احترام سے حسب ذیل معروضات پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں اور ملتجی ہیں کہ ان پر ہمدردانہ غور فرمایا جائے:

ہمیں ان بے پایاں فوائد اور لاانتہا منفعتوں کا احساس ہے جو ملک ہند کے مختلف مذاہب اور نسلوں سے تعلق رکھنے والی کروڑوں رعایا کو برطانوی راج سے حاصل ہیں۔

عہد انگلشیہ میں ملک کو امن و آشتی' ذاتی آزادی اور دھرم اور دین کی جو آزادی میسر ہوئی ہے ہم اس کے لئے از حد شکر گزار ہیں۔ حکومت کی روشن خیالی کے باعث ہمیں پوری توقع ہے کہ جو مفاد ہمیں حاصل ہوئے ہیں ان میں برابر اضافہ ہوتا رہے گا اور ملک ہند مستقبل میں اقوام عالم کی صف میں ایک اہم حیثیت و وقار حاصل کرلے گا۔

ہندوستان میں برطانوی حکمت عملی کا نمایاں وصف یہ ہے کہ ملک کے مفادات سے متعلق

جو خواہشات اور آراء ملک کے عوام کی جانب سے پیش کی گئی ہیں ان پر خاطر خواہ توجہ دی گئی اور اس ضمن میں نسل اور مذاہب کے فرق کو بھی ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے۔ ہندوستان کی ترقی کے باب میں یہ اہم مرکزی نکتہ فراموش نہیں کیا گیا۔

مسلمانوں کے مطالبات:۔

رعایائے ہند کے مختلف اہم طبقات کے بااثر افراد سے خاموشی اور رازدارانہ طریق کے ساتھ مشاورت کر کے کام کی ابتدا کی گئی پھر اس اصول کو آگے بڑھایا گیا کہ ملک کی مسلمہ سیاسی جماعتوں یا کاروباری اداروں کو یہ حق دیا جائے کہ وہ حکام کے سامنے اپنے تاثرات پیش کریں۔ اگر اعتراضات و نکتہ چینی ہو تو اس پر غور کیا جائے اور عوامی اہمیت کے حامل اقدامات پر توجہ دی جائے۔ اور آخرالامر میونسپلٹیوں و ڈسٹرکٹ بورڈوں اور ملک کے قانون ساز اداروں میں عوام کے نمائندوں اور نامزدگی کے ذریعے قابل افراد کو یہ موقع دیا جائے کہ وہ حکومت تک اپنی آواز پہنچائیں۔ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ والا قدر نے جو کمیٹی قائم کی ہے وہ اس آخرالذکر معاملے پر غور کرے گی کہ اس کام کو مزید اور کیا توسیع دی جا سکتی ہے۔ اب جب کہ نمائندگی میں اضافے کی تحریک کی گئی ہے اس لئے خصوصی طور پر ہم اس ضمن میں کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں تاکہ نمائندگی میں ہمیں بھی مناسب حصہ مل سکے۔ نیز یہ امر بھی زیر نظر رہے کہ ہمارے طبقے کے مفاد پر جو چیزیں اثر انداز ہوتی ہیں۔ ان کو زیر غور لایا جائے اور ان امور کے پیش نظر ہی ہم اس موقع پر والا قدر کی خدمت میں یہ معروضات پیش کرتے ہیں۔

قدیم روایات:

1901ء میں جو مردم شماری ہوئی ہے اس کے مطابق ملک معظم کی رعایائے ہند میں مسلمانوں کی تعداد 4 کروڑ 20 لاکھ سے بھی زیادہ ہے۔ یوں سمجھے کہ یہ تعداد کل آبادی کے چوتھے اور پانچویں حصے کے درمیان درمیان ہے۔ رعایائے ہند میں ایسے عناصر بھی شامل ہیں جو بظاہر خلوت کو مانتے ہیں یا پھر چھوٹے چھوٹے مذاہب کے دائرے میں آتے ہیں اور انہیں بھی مردم شماری میں گنا گیا ہے۔ اور ایسے طبقے بھی شامل کئے گئے ہیں جو عام طور پر ہندو کہلاتے ہیں لیکن حقیقت میں وہ ہندو قطعی نہیں ہیں۔ اگر ان سب کو کل آبادی میں سے گھٹایا جائے تو

ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمانوں کا تناسب بڑھ جاتا ہے۔ لہٰذا اگر نمائندگی کے طریقے کو بڑھانا یا محدود کرنا مقصود ہو تو ایک ایسا طبقہ آبادی جو روس کو چھوڑ کر باقی ساری درجہ اول کی یورپین طاقتوں سے تعداد میں زیادہ ہے اس بات کا حق رکھتا ہے کہ اسے مملکت میں ایک اہم عنصر کے طور پر کافی نمائندگی حاصل ہو۔

ہم والا قدر کی اجازت سے اس ضمن میں مزید اضافے کے طور پر کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ نمائندگی کا جو بھی طریقہ ہو خواہ بالواسطہ یا بلاواسطہ اور ان کی حیثیت واثر پر جو امر بھی پرتو ڈالتا ہے۔ اس کے ضمن میں صرف گنتی ہی درخور اعتنا نہ ہو بلکہ یہ بھی دیکھا جائے کہ ان کی سیاسی اہمیت کیا ہے' مملکت کے دفاع میں ان کی قوت کیا ہے۔ اور صرف سو سال پہلے انہیں سرزمین ہند پر کتنی زبردست اہمیت حاصل تھی کیونکہ قدرتی طور پر یہ قدیم روایات ایسی نہیں ہیں کہ ان کے ذہنوں سے محو ہو گئی ہوں۔

ملک کے حکمرانوں کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں احساس عدل ہے اور وہ سب کے ساتھ یکساں سلوک کرتے ہیں۔ یہ باتیں ایسی ہیں کہ مسلمانان ہند ہمیشہ ان پر بھروسہ کرتے ہیں۔ اسی لئے انہوں نے اپنے مطالبات کے سلسلے میں کبھی ایسے ناروا طریقے استعمال نہیں کئے جو پریشان کن ہوں۔ بلکہ بصمیم قلب ہماری خواہش یہ ہے کہ مسلمانان ہند کو جو اعلیٰ اور تاریخی روایات ورثے میں ملی ہیں ان سے روگردانی نہ کریں مگر حال میں جو واقعات رونما ہوئے ہیں انہوں نے جذبات کو ابھارا ہے۔ بالخصوص نوجوان مسلمانوں میں جو کیفیت پیدا ہو رہی ہے ہو سکتا ہے وہ بعض مواقع پر اور بعض حالات میں ایسی حدود سے متجاوز کر جائے اور اس کا بھی امکان قوی ہے کہ صورت حال تحمل و بردباری اور شائستہ رہنمائی کی گرفت سے باہر ہو جائے۔

ان امور کے پیش نظر ہی ہم یہاں چند معروضات پیش کرتے ہیں وہ جناب والا کی توجہ خاص کی مستحق ٹھہریں گی۔ انہیں ہندوستان کے مسلمانوں کی نہایت کثیر آبادی کا نقطہ نظر سمجھنا چاہیے اور یہ ان ہی کے خیالات و احساسات ہیں جن پر کامل غور و خوض کرنے کے بعد یہاں پیش کرنے کی اجازت چاہتے ہیں۔

یورپی طرز نمائندگی

ہمیں توقع ہے کہ والا قدر معاف فرمائیں گے اگر ہم یہاں عرض کریں کہ یورپی طرز

نمائندگی ہند کے عوام الناس کے لئے ایک نئی بات ہے۔ ہندوستان میں جو سماجی' مذہبی اور سیاسی حالات موجود ہیں ان سے جب تک پوری طرح ہم آہنگ نہ ہوں اس وقت تک کار آمد نتائج بر آمد نہیں کرسکے گی۔ ہم مسلمانوں کے اہل فکرودانش درحقیقت یہ محسوس کرتے ہیں کہ اس کے لئے بڑی سوجھ بوجھ دوربینی اور احتیاط کی ضرورت ہوگی اور اگر یہ حزم واحتیاط اور توجہ صرف نہ کی گئی تو یہ اندیشہ محسوس کیا جاتا ہے کہ دوسری برائیوں کے علاوہ ہمارے قومی مفادات ایک غیر ہمدرد اکثریت کے رحم وکرم پر چھوڑ دیئے جائیں گے۔

ہمارے حکمرانوں نے اپنی عظیم روایات اور سیاسی جبلت اور تجربے سے یہ بات ضروری سمجھی ہے کہ انتظام انصرام ملک کے لئے عوام کے نمائندہ اداروں کو ملک کی حکومت میں زیادہ سے زیادہ اہمیت دی جائے۔ ہم مسلمانان ہند اگر اپنے قومی مفادات کے ساتھ عدل کرنا چاہتے ہیں تو اب زیادہ عرصے تک ان حالات سے الگ تھلگ نہیں رہ سکتے جو حکومت کی ان پالیسیوں کے باعث پیدا ہو چکے ہیں۔ ہم کو اس بات کا اعتراف ہے اور تسلیم کرنا بھی حق ہے کہ مسلمانوں کو جو نمائندگی ملی ہے وہ والا قدر کے احساس عدل و حسن عمل نیز آپ کے لائق ستائش پیشرو اور لوکل گور نمنٹوں کے سربراہوں کی بدولت تھی۔ کیونکہ قانون ساز ایوانوں کے لئے انہوں نے ہی بلا استثناء یہ نامزدگیاں کی تھیں مگر ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ اس طرح جو بھی نمائندگی دی گئی ہے وہ ہماری ضروریات کے لئے بہت ہی ناکافی رہی ہے اور جو نمائندے ان ایوانوں میں بھیجے گئے ان کو ہمیشہ اس نظر سے نہیں دیکھا گیا کہ یہ لوگ جن کی نمائندگی کرنے کے لئے منتخب کئے گئے تھے وہ لوگ بھی انہیں اپنا نمائندہ سمجھتے تھے' یا نہیں۔ شاید موجودہ حالات میں یہ صورت حال ناگزیر بھی تھی' کیونکہ وائسرائے اور لوکل گور نمنٹیں جتنی نامزدگیاں کرسکتی ہیں ان کی تعداد نہایت ہی محدود ہے۔ علاوہ ازیں عوامی انتخاب کا صحیح و قابل اعتماد رخ معلوم کرنے کے لئے کوئی وسیلہ موجود نہ ہونے کے باعث صحیح معنوں میں عوام کے نمائندے چننے کا مسئلہ اتنا آسان بھی نہ تھا۔

انتخاب کے نتائج

جہاں تک انتخاب کا تعلق ہے یہ امکان بڑا بعید ہے کہ اس وقت انتخابی ادارے جس

طرح تشکیل پذیر ہیں ان کی طرف سے کبھی بھی کسی مسلمان امیدوار کا نام حکومت کی منظوری کے لئے پیش کیا جائے گا۔ الا یہ کہ وہ شخص تمام اہم معاملات میں اکثریت کے ساتھ ہمدردی رکھتا ہو۔ ہم از روئے انصاف اس بات میں بھی کوئی تبع نہیں دیکھتے کہ ہمارے دیگر غیر مسلم افراد رعایا کو اپنی تعداد کا مفاد پہنچے۔ اور وہ اس طاقت سے بخوبی فائدہ اٹھائیں اور اپنی ہی قوم والوں کو رائے دیں یا ایسے حضرات کو جو ہندو نہ ہو۔ مگر توقع یہ ہو کہ وہ ہندو اکثریت کے ساتھ ووٹ دیں گے اور اپنے آئندہ انتخابات کے لئے انہیں ہندو اکثریت کی خوشدلی پر بھروسہ کرنا ہی ہو گا۔ یہ صحیح ہے کہ ہمارے بہت سے مفادات بالکل ویسے ہی ہیں جیسے ہندو ابنائے وطن کے اور ہمیں اس بات سے بھی یک گونہ طمانیت ہو گی کہ قانون ساز ایوانوں میں ایسے حضرات آئیں خواہ وہ کسی بھی قوم کے ہوں جو ایسے مفادات کا کماحقہ' تحفظ کر سکیں اور ان کے موئد ہوں۔

ایک علیحدہ قوم!

مگر پھر بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہم مسلمان ایک علیحدہ قوم ہیں۔ جن کے اپنے جداگانہ مفادات ہیں۔ جن میں دوسروں کے ساتھ کوئی شرکت نہیں اور ہمیں یہ شکایت ہے کہ ہماری مناسب و معقول نمائندگی کا حق ادا نہیں ہوا ہے۔ حتیٰ کہ جن صوبوں میں مسلمانوں کی تعداد بہ لحاظ آبادی اکثریت میں ہے۔ وہاں بھی ان کے ساتھ ایسا سلوک کیا جاتا ہے۔ گویا وہ ناقابل لحاظ سیاسی عنصر ہیں اور بے دریغ ان کو نظرانداز کیا جا سکتا ہے۔ یہ صورت حال کچھ حد تک پنجاب میں مگر بہت زیادہ حد تک سندھ اور بنگال میں رہی ہے۔ اس سے قبل کہ نمائندگان کے انتخاب کے سلسلے میں ہم اپنے خیالات پیش کریں ہم ادب کے ساتھ یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ کسی قوم کی سیاسی اہمیت بڑی حد تک بڑھ سکتی ہے' یا کمزور ہو جاتی ہے۔ اس امر سے کہ اس قوم کو مناسب سرکاری میں کس قدر مرتبہ حاصل ہے۔ اگر انہیں مناسب نمائندگی حاصل نہ ہو پھر جیسا کہ بدقسمتی سے مسلمانوں کے ساتھ معاملہ ہے۔ تو اس طرح ان کا اثر اور وقار بری طرح مجروح ہوتا ہے' حالانکہ انصاف کی وجہ سے یہ ان کا حق ہے۔

سرکاری ملازمتوں میں حصہ

ہم حکومت سے ملتجی ہیں کہ وہ ازراہ کرم اس بات کا اہتمام کرے کہ ہندوستان کے تمام صوبوں کی ملازمتوں میں خواہ وہ گز۔ٹڈ ہوں یا ماتحت ملازمتیں ہوں یا اہلکاران سرکاری درجوں کے ہوں، مسلمانوں کو مناسب حصہ دیا جائیگا۔ بعض صوبوں میں اس عنوان کے احکام کبھی کبھار جاری بھی ہوئے ہیں مگر افسوس یہ ہے کہ بیشتر حالتوں میں ان پر خاطر خواہ عمل نہیں ہوا۔ وجہ یہ بتائی گئی کہ مناسب تعلیم یافتہ مسلمان میسر نہیں آتے۔ کسی وقت میں یہ حیلہ شاید کچھ وقت رکھتا ہو مگر اب تو یہ قطعی در خود اعتنا نہیں ہے۔ والا قدر! ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ مناسب تعلیم یافتہ مسلمانوں کی تعداد ضرورت کے مطابق بہمہ وجوہ موجود ہے۔

مقابلے کا عنصر

ہر چند کہ تعلیم یافتہ مسلمانوں کی تعداد کہیں بڑھ چکی ہے۔ مگر ایسا رجحان برابر نظر آرہا ہے کہ انہیں یہ کہہ کر رد کر دیا جاتا ہے کہ ان سے بہتر تعلیمی قابلیت کے لوگ مل جاتے ہیں۔ اس لئے قابل ترجیح ہیں۔ اس بات نے گویا مقابلہ آرائی کو اپنی انتہائی زشت صورت پیش کر دیا ہے۔ اور ہمیں والا قدر یہ کہنے کی اجازت دیں کہ صرف ایک قوم کے ہاتھ میں سارا سرکاری اثر و رسوخ کھینچ کر آگیا ہے۔ اس ضمن میں یہ عرض کرنے کی بھی ضرورت ہے کہ تحریک تعلیم کے شروع ہی سے مسلمان ماہرین تعلیم نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ ہمارے نوجوانوں میں صحیح کردار کی تشکیل کا پہلو نمایاں رہے۔ اور ہم یہ سوچنے کی جسارت کرتے ہیں کہ یہ جوہر اس سے کہیں زیادہ بے بہا ہے کہ سرکاری نوکری میں محض دماغی تیز طراری کو ہی زیادہ اہمیت نہیں ہونی چاہیے۔

مسلمان اور حاکمان عدالت

ہمیں یہ عرض کرنے کی بھی اجازت دیجئے کہ ہندوستان کے تمام حصوں میں مسلمانوں کو اس بات کی بڑی شکایت ہے کہ عدالت ہائے عالیہ اور چیف کورٹوں میں مسلمان جج زیادہ تواتر کے ساتھ مقرر نہیں کئے جاتے۔ جب سے یہ عدالتیں وجود میں آئی ہیں ان پر ابھی تک صرف تین مسلمان قانون دانوں کو یہ شرف بخشا گیا ہے۔ مگر انہوں نے وکلاء کی صف سے نکل کر

کرسی عدل پر بیٹھ کر اپنی قابلیت کا سکہ منوا لیا ہے۔ مثلاً" اس وقت کیفیت یہ ہے کہ ان کورٹوں میں ایک جج بھی مسلمان نہیں ہے اور ادھر کلکتہ ہائی کورٹ میں تین جج ہندو ہیں۔ حالانکہ آبادی کا بیشتر حصہ مسلمان ہے۔ پنجاب میں بھی دو ہندو جج ان عہدوں پر فائز ہیں۔ گو کہ آبادی میں وہاں بھی مسلمان ہی کثرت سے ہیں۔ اس لئے اگر ہم یہ درخواست کریں تو کوئی بے جا بات نہ ہوگی کہ ہائی کورٹوں اور چیف کورٹوں میں سے ہر ایک میں ایک مسلمان جج ضرور مقرر کیا جائے۔ مسلمان قانون دانوں میں ایسے بہت سے افراد موجود ہیں جو اس منصب کا پورا حق ادا کر سکتے ہیں اور اگر کسی ایک صوبے میں نہ ہوں تو دوسرے صوبے میں ضرور مل جاتے ہیں۔ ہم مزید یہ کہنے کی اجازت چاہتے ہیں کہ اگر ان ججوں میں مسلمانوں کی نمائندگی موجود ہوئی ہے۔ جسے مسلم شریعت کے قوانین کا علم ہو گا تو وہ بھی عدل و قانون کے انصرام میں بڑا اہم عنصر ثابت ہو گا۔

میونسپلٹیوں میں نمائندگی

میونسپلٹیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کو اہم مقامی امور کا انصرام سپرد ہوتا ہے اور بڑی حد تک انہیں آبادی کے آرام، ان کی صحت اور تعلیمی ضروریات کے علاوہ بعض اوقات مذہبی امور کا بھی بندوبست کرنا پڑتا ہے۔ اس ضمن میں اہم امور مملکت پر توجہ دینے سے پہلے ہم ذرا سی توجہ ادھر بھی دلانا چاہتے ہیں۔ میونسپلٹیوں میں بھی مسلمانوں کی نمائندگی کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ یہ ادارے اس لئے تشکیل کئے گئے تھے کہ انہیں مقامی انتظام حکومت کی پہلی سیڑھی بنایا جائے گا۔ یہی وہ مرحلہ ہوتا ہے جہاں لوگوں کو مناسب نمائندگی کے اصول کا اولین و قریب ترین احساس ہوتا ہے۔ مگر مسلمانوں کو جو نمائندگی ان اداروں میں دی جاتی ہے اس کے لئے فی الوقت کوئی ایسا مثالی اصول معلوم نہیں ہوتا۔ جس کو علی العموم کام میں لایا جا سکے۔ اس لئے ہر علاقے میں ایک مختلف طریقہ جاری ہے۔ مثلاً" علی گڑھ میں میونسپلٹی کو لیجئے یہ چھ حلقوں میں منقسم ہے۔ ہر حلقہ سے ایک مسلمان اور ایک ہندو کمشنر آتا ہے اور ہمیں علم ہوا ہے کہ پنجاب اور دوسری جگہوں پر بھی اکثر یہی اصول کارفرما ہے مگر بیشتر مقامات پر مسلمان ٹیکس دہندگان کو مناسب نمائندگی کا حق نہیں ہے۔ اس لئے بہ صد ادب ہم ملتمس ہیں کہ ہر جگہ کے

مقامی حاکم کو اس بات کا پابند کیا جائے کہ وہ ہر میونسپلٹی اور ڈسٹرکٹ بورڈ بیٹھنے والے ہندو اور مسلمان افراد کی تعداد کا اعلان کریں' اور آبادی کے تناسب و سماجی حیثیت اور مقامی اثر و رسوخ اور ہر قوم کی جداگانہ ضرورتوں کا لحاظ رکھتے ہوئے نشستوں کا تعین کیا جائے اور حتماً" کیا جائے۔ ہم یہ تجویز کریں گے کہ جیسا پنجاب کے اکثر شہروں میں ہوتا ہے ہر قوم الگ الگ اپنے ہی نمائندہ بھیجا کرے۔

صوبائی مجالس کے لئے نامزدگیاں

اب ہم ملک کے قانون ساز ادارے میں نمائندگی کے مسئلے کی طرف آتے ہیں۔ سب سے پہلے صوبائی کونسلوں کو لیجئے ہم بہ صد ادب یہ تجویز پیش کریں گے کہ جس طرح میونسپلٹیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں میں نمائندگی کے تناسب کا اعلان کیا جائے اسی طرح صوبائی قانون ساز اداروں کے لئے بھی کیا جائے اور اس ضمن میں جن اہم نکات کی طرف ہم نے اس سپاسنامے کے پیرا نمبر 5 میں اشارہ کیا ہے ان کو زیر نظر رکھا جائے اور یہ کہ اہم مسلمان ذمہ دار' قانون دان حضرات و اہل مجالس اور اہم مسلمان مفادات کو نمائندگی دی جائے جن کو کچھ اہمیت مدت حاصل ہو مثلاً" پانچ سال۔ ان کا ایک انتخابی حلقہ قرار دیا جائے اور والا قدر کی حکومت اس ضمن میں ایسے ضابطہ کار کا اعلان کرے جس پر عمل کرتے ہوئے اراکین کی تعداد کا تعین کر دیا جائے۔

یونیورسٹیوں کے فیلو

ہماری یہ تجویز ہے کہ ہندوستانی یونیورسٹیوں کے سیناتوں اور سنڈیکیٹوں میں بھی اسی طریقے پر عمل کیا جائے یعنی یہ کہ جہاں تک ممکن ہو ان اداروں میں بھی مسلمانوں کی نیابت کا خیال رکھتے ہوئے مناسب تعداد کا حتمی و سرکاری تعین کیا جائے۔

وائسرائے کی کونسل

جہاں تک "امپیریل مجلس قانون ساز" کا تعلق ہے اس کے بارے میں یہ امر بدیہی ہے کہ اس کی اہمیت بہت ہی زیادہ ہے۔ اسی لئے موضوعاً" پیش ہے کہ:

1- مسلمانوں کے لئے نیابت کا حق اور نمائندگی' افرادی تعداد کے لحاظ سے نہیں کیا جائے اور جو بھی نمائندگی دی جائے وہ ایسی نہ ہو جو مسلمانوں کو ہی ایک غیر موثر اقلیت بنادے۔

2- جہاں تک ممکن ہو نامزدگی کی بجائے انتخاب کو قابل ترجیح سمجھا جائے۔

3- مسلمان اراکین کو منتخب کرتے وقت مسلمان زمینداروں' وکلاء اور اہل تجارت کے مفاد کا لحاظ رکھا جائے نیز دوسرے مفادات کا بھی جن کی حیثیت و اہمیت کا تعین اس طریق کار کے مطابق کیا جائے جو جناب والا کی حکومت اس ضمن میں طے کرے' ماسوائے صوبائی مجالس قانون ساز کے مسلمان اراکین و یونیورسٹیوں کے مسلمان فیلوز کو بھی انتخاب کرنے کا استحقاق دی جائے اور اس کے لئے ایسے قواعد و ضوابط عمل میں لائے جائیں جو جناب والا کی حکومت اس باب میں طے کرے۔

ایگزیکٹو کونسل

ادھر کچھ عرصے سے یہ خیال جڑ پکڑتا جارہا ہے کہ وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل میں ایک یا زیادہ ہندوستانی اراکان شامل کیے جائیں اگر اس قسم کی تقرری عمل میں آئے تو ہم یہ التماس کریں گے کہ مسلمانوں کی نمائندگی کو نظرانداز نہ کیا جائے۔ ہم یہ کہنے کی اجازت چاہتے ہیں کہ ایسے باوقار ایوان کے لئے ایک سے زیادہ نہایت لائق و وقیع مسلمان ارکان بخوبی مل سکتے ہیں۔ جو اپنے وجود کے باعث اس ایوان کی زینت ہوں گے۔

ایک مسلم یونیورسٹی

اب ہم جناب والا کی خدمت میں ایک ایسے امر کی طرف اشارہ کرتے ہیں جس کا ہماری قومی فلاح سے بہت ہی قریبی تعلق ہے۔ ہمیں اس بات کا گہرا احساس ہے کہ بطور ایک اہم قوم کے ہماری امنگوں اور مستقبل کی ترقی کے لئے یہ بڑا ضروری ہے کہ ہماری ایک اپنی مسلم یونیورسٹی قائم ہو جو ہماری دینی و ثقافتی زندگی کا مرکز ہو۔ اس لئے ہم جناب والا سے بہ صد ادب ملتمس ہیں کہ آپ مسلمانان ہند کی اس آرزو کی تکمیل کے باب میں ان کی مدد فرمائیں۔ کیونکہ اس تجویز کا ان کے مفاد ملت سے بہت ہی گہرا تعلق ہے۔

آخر میں ہم جناب والا کو یقین دلانا چاہتے ہیں کہ اس سپاسنامے میں ہماری جانب سے جن

امور و نقات کی طرف توجہ دلائی گئی ہے اگر والا قدر نے ملک معظم کی رعایا کے ایک طبقے یعنی مسلمانوں کو ان کی جدوجہد میں اعانت فرمائی تو وہ دراصل مصائب اور معاملات مملکت کے حل کی طرف ایک قدم ہو گا اور اس طرح ان کی غیر متزلزل وفا کیشی کو استحکام حاصل ہو گا جو انہیں تاج برطانیہ سے ہے اور اس طرح ان کی سیاسی ترقی اور قومی خوشحالی کو بھی مہمیز ملے گا اور آئندہ نسلوں کے دلوں میں آپ کا نام نامی ہمیشہ ہمیشہ ایک یادگار کی طرح ثبت رہے گا' ہمیں اس بات کا بھی یقین واثق ہے کہ جناب والا ہماری ان معروضات پر توجہ خاص صرف فرمائیں گے۔

قائداعظمؒ کے چودہ نکات 31 دسمبر 1928ء

ہر گاہ کہ آل پارٹیز کانفرنس طلب کرنے کا اساسی تصور اور ہفتہ کرسمس (1928ء) کے دوران کلکتہ میں کنونشن کے انعقاد کا مقصد یہ تھا کہ سیاسی اصلاحات کی ایک ایسی سکیم مرتب کی جائے جس پر سب اتفاق کریں اور پھر ان کی توثیق ملک کے ممتاز ترین سیاسی جماعت کی طرف سے ایک قومی میثاق کی شکل میں کی جائے۔ ہر گاہ کہ انڈین نیشنل کانگرس نے (نہرو) رپورٹ کو صرف آئینی طور پر ایک سال کے لئے منظور کیا جس کی مدت 31 دسمبر 1929ء کو ختم ہوئی ہے اور یہ کہ اگر اس مدت نے برطانوی پارلیمنٹ نے اسے منظور نہیں کیا تو کانگرس طے کر چکی ہے کہ کامل آزادی کے پروگرام اور پالیسی کو عملی جامہ پہنایا جائے۔ اور اس کے لئے وہ سول نافرمانی اور عدم ادائیگی محصولات کی پالیسی اور پروگرام پر عمل کرے گی۔ ادھر ہندو مہاسبھا نے کنونشن میں اپنے نمائندوں کے ذریعے شروع ہی سے ایسا رویہ اختیار کیا جسے الٹی میٹم سے کم کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اور وہ یہ تھا کہ اگر نہرو رپورٹ میں فرقہ وارانہ مسئلے کے حل کے سلسلے میں ایک لفظ کی بھی تبدیلی کی گئی تو وہ کنونشن سے اپنا پورا تعاون و تائید واپس لے لے گی۔ اور پھر یہ کہ نیشنل لبرل فیڈریشن کے مندوبین نے کنونشن میں جو روش اختیار کی اس کو مہر بسیانہ؟ لاتعلق کیا جا سکتا ہے اور پھر الہ آباد میں انہوں نے اپنے کھلے اجلاس میں ایک ایسی پالیسی طے کی جو انہیں کسی بات کی پابند نہیں کرتی اس لیے غیر برہمن اور پسماندہ طبقات اس کی قطعی خلاف کہیں اور یہ کنونشن میں آل انڈیا مسلم لیگ کی طرف سے جو اعتدال پسندانہ اور معقول تجاویز رکھی گئی تھیں انہیں بھی منظور نہیں کیا گیا اسلئے مسلم لیگ نہرو رپورٹ کو تسلیم کرنے سے قطعی قاصر ہے۔

لیگ نے اس مسئلے کو بڑی گہری توجہ دی ہے اور بڑے عزم و احتیاط سے اور سوچ بچار

کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ ہندوستان کی حکومت کا جو بھی آئندہ ڈھانچہ بنایا جائے اس میں ان نکات کے بنیادی اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کو شامل کیا جائے تاکہ مسلمانوں کے حقوق و مفادات کا تحفظ ہو سکے:

1- آئندہ جو آئین مملکت تیار کیا جائے اس کی ہیت وفاقی طرز حکومت کی ہو جس میں مابقیہ اختیارات صوبہ جات کو تفویض کر دیئے جائیں۔

2- تمام صوبوں کو یکساں خود اختیاری دی جائے۔

3- ملک کے تمام قانون ساز ایوانوں اور دوسرے منتخب اداروں کی تشکیل اس محکم اصول پر کی جائے کہ ہر صوبے میں اقلیتوں کو معقول اور موثر نمائندگی حاصل ہو اور یہ کہ کسی بھی صوبے میں اکثریت کو نا صرف یہ کہ اقلیت میں تبدیل نہیں کیا جائے گا بلکہ اسے حاوی درجہ پر بھی نہیں لایا جائے گا۔

4- مرکزی مجلس قانون ساز میں مسلمانوں کی نمائندگی ایک تہائی سے کم نہیں ہونی چاہیے۔

5- فرقہ وارانہ حلقوں کی نمائندگی بدستور جداگانہ انتخابات کے ذریعے ہوتی رہے گی بشرطیکہ ہر فرقے کے لئے کھلی آزادی ہو گی کہ اگر کسی وقت وہ چاہے تو جداگانہ انتخابات کا حق استعمال کرے۔

6- اگر کسی وقت بھی علاقائی تنظیم از سر نو کرنی ضروری ہو تو پنجاب' بنگال اور شمال مغربی سرحدی صوبے کی مسلم اکثریت کو متاثر نہیں ہونے دیا جائے گا۔

7- ہر ایک کو مذہبی آزادی ہو گی یعنی یہ کہ عقیدہ' عبادت و مسلک عمل کی بھی آزادی ہو گی۔ نشرو اشاعت' جماعت سازی اور تعلیم کے باب میں ہر فرقے کو آزادی ہو گی اور اس بات کی ضمانت ہر فرقے کو دی جائے گی۔

8- کسی مجلس قانون ساز یا کسی بھی منتخب ادارے میں کوئی ایسا مسودہ قانون یا تحریک یا انکا کوئی جزو منظور نہیں کیا جائے گا اگر اس مجلس کے کسی فرقے کے نمائندوں کی 4/3 تعداد اس مسودہ قانون یا تحریک کی مخالف ہو یا اس تحریک کی مخالف ہو یا ان کے کسی جزو کی بہ این وجہ مخالف ہو اس طرح ان کے فرقے کے مفاد پر ضرب پڑتی ہے۔ یا پھر یہ کیا جائے کہ اس قسم کا کوئی دوسرا طریقہ وضع کیا جائے۔ جس پر عمل ہو سکے اور ایسے حالات کا کوئی عملی حل نکالا جائے۔

9- سندھ کو بمبئی پریذیڈنسی سے علیحدہ کرایا جائے۔

10- دوسرے صوبوں کے مطابق شمال مغربی سرحدی صوبہ اور بلوچستان میں بھی آئینی اصلاحات رائج کی جائیں۔

11- ملک کی سرکاری ملازمتوں اور لوکل سیلف گورنمنٹ کے اداروں میں دیگر ہندوستانی باشندوں کے ساتھ مسلمانوں کو بھی کارگزاری ضروریات کا لحاظ رکھتے ہوئے کافی و مناسب حصہ دینے کے لئے آئین میں دفعات شامل کی جائیں۔

12- مسلمانوں کی ثقافت کی حفاظت کے لئے آئین میں مناسب و معقول تحفظات رکھے جائیں اور مسلمانوں کی زبان' مذہب' تعلیم' ذاتی قوانین' محمڈن لا کی ترقی و حفاظت کے لئے آئین میں دفعات رکھی جائیں اور مسلمانوں کے خراتی اوقاف و اداروں کو تحفظ دیا جائے اور جن امور کے لئے سرکاری خزانے سے امدادیں دی جائیں ان میں اور مقامی سرکاری اداروں سے جو امدادیں دی جائیں ان میں بھی مسلمانوں کا معقول و مناسب حصہ شامل رکھا جائے۔

13- کوئی کابینہ خواہ مرکزی یا صوبائی نہ بنائی جائے جب تک اس میں ایک تہائی مسلمانوں کی نشستیں متعین نہ کی جائیں۔

14- آئین مملکت میں اس وقت تک کوئی تبدیلی مرکزی مجلس قانون ساز نہیں کر سکے گی جب تک وفاق ہند میں شامل ریاستیں اس تبدیلی پر متحد نہ ہو جائیں۔

علامہ اقبالؒ خطبہ صدارت' اجلاس آل انڈیا مسلم لیگ

منعقدہ آلہ آباد' 5 دسمبر 1930ء

حضرات!

میں آپ کا بے حد ممنون ہوں کہ آپ نے ایک ایسے وقت میں مجھے آل انڈیا مسلم لیگ کی صدارت کا اعزاز بخشا ہے جب کہ مسلمانان ہندوستان کی سیاسی زندگی نے ایک نہایت ہی نازک صورت اختیار کرلی ہے' مجھے یقین ہے کہ اس عظیم الشان اجتماع میں ان حضرات کی کمی نہیں جن کا تجربہ مجھ سے کہیں زیادہ وسیع ہے اور جن کی معاملات فہمی کا میں دل سے قائل ہوں۔ لہٰذا یہ بڑی جسارت ہوگی کہ اگر میں ان مسائل میں جن کے فیصلے کے لئے یہ حضرات آج جمع ہوئے ہیں ان کی راہنمائی کا دعوی کروں۔ میں کسی جماعت کا رہنما نہیں اور نہ ہی کسی رہنما کا پیرو ہوں۔ میں نے اپنی زندگی کا زیادہ حصہ اسلام اور اسلامی فقہ و سیاست' تہذیب' تمدن اور ادبیات کے مطالعے میں صرف کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس مسلسل اور متواتر تعلق کی بدولت جو مجھے تعلیمات اسلامی کی روح سے جیسا کہ مختلف زبانوں میں اس کا اظہار ہوا ہے' رہا ہے۔ میں نے اسی امر کے متعلق ایک خاص بصیرت پیدا کرلی ہے کہ ایک عالمگیر حقیقت کے اعتبار سے اسلام کی حیثیت کیا ہے۔ لہٰذا یہ فرض کرتے ہوئے کہ مسلمانان ہندوستان بہرحال اپنی اسلامی روح کو برقرار رکھنے میں مصر ہیں میں کوشش کروں گا کہ آپ کے فیصلوں کی رہنمائی کی بجائے اسی بصیرت کی روشنی میں خواہ اس کی قدروقیمت کچھ بھی ہو آپ کے دل میں اس بنیادی اصول کا احساس پیدا کروں جس پر میری رائے میں ہمارے تمام فیصلوں کا عام انحصار ہونا چاہیے۔

اسلام اور قومیت

یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ بحیثیت ایک اخلاقی نصب العین اور نظام سیاست کے (اس آخری لفظ سے میرا مطلب ایک ایسی جماعت ہے جس کا نظم و انضباط کسی نظام قانون کے ماتحت عمل میں آتا ہو۔ لیکن جس کے اندر ایک مخصوص اخلاقی روح سرگرم کار ہو) اسلام ہی وہ سب سے بڑا جزو ترکیبی تھا جس سے مسلمانان ہند کی تاریخ حیات متاثر ہوئی۔ اسلام ہی کی بدولت مسلمانوں کے سینے ان جذبات اور عواطف سے معمور ہوئے جن پر جماعتوں کی زندگی کا دارومدار ہے۔ اور جن سے متفرق و منتشر افراد بتدریج متحد ہو کر ایک متمیز و معین قوم کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ اور ان کے اندر ایک مخصوص اخلاقی شعور پیدا ہو جاتا ہے۔ حقیقت میں یہ کہنا مبالغہ نہیں کہ دنیا بھر میں شاید ہندوستان ہی ایک ایسا ملک ہے جس میں اسلام کی وحدت خیز قوت کا بہترین اظہار ہوا ہے۔ دوسرے ممالک کی طرح ہندوستان میں بھی جماعت اسلامی کی ترکیب صرف اسلام ہی کی رہین منت ہے۔ کیونکہ اسلامی تمدن کے اندر ایک مخصوص اخلاقی روح کار فرما ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کے اندرونی اتحاد اور ان کی نمایاں یکسانیت ان قوانین کی شرمندہ احسان ہے۔ جو تہذیب اسلامی سے وابستہ ہیں۔ لیکن اس وقت مغرب کے سیاسی افکار نے نہایت تیزی کے ساتھ نہ صرف ہندوستان بلکہ ہندوستان سے باہر تمام دنیائے اسلام میں انقلاب پیدا کر رکھا ہے۔ نوجوان مسلمانوں کی یہ خواہش ہے کہ وہ ان افکار کو عملاً" اپنی زندگی کا جزو بنا لیں۔ انہوں نے اس امر پر مطلق غور نہیں کیا کہ وہ کون سے اسباب تھے جن کے تحت ان افکار نے مغرب میں نشوونما پائی۔ یاد رکھنا چاہئے کہ سرزمین مغرب میں مسیحیت کا وجود محض ایک رہبانی نظام کی حیثیت رکھتا ہے۔ رفتہ رفتہ اس سے کلیسا کی ایک وسیع حکومت قائم ہوئی۔ لوتھر کا احتجاج دراصل اسی کلیسائی حکومت کے خلاف تھا۔ اس کو کسی دنیوی نظام سیاست سے کوئی بحث نہیں تھی۔ کیوں کہ اس قسم کا کوئی نظام سیاست مسیحیت میں موجود نہیں تھا۔ غور سے دیکھا جائے تو لوتھر کی بغاوت ہر طرح سے حق بجانب تھی۔ اگرچہ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ خود لوتھر کو بھی اس امر کا احساس نہ تھا کہ جن مخصوص حالات کے تحت اس کی تحریک کا آغاز ہوا ہے اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ مسیح علیہ

السلام کے عالمگیر نظام اخلاق کی بجائے مغرب میں ہر طرف بے شمار ایسے اخلاقی نظام پیدا ہو جائیں گے جو خاص خاص قوموں سے متعلق ہوں گے۔ لہٰذا ان کا حلقہ اثر بالکل محدود رہ جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ جس ذہنی تحریک کا آغاز لوتھر اور روسو کی ذات سے ہوا اس نے مسیحی دنیا کی وحدت کو توڑ کر اسے ایک ایسی غیر مربوط اور منتشر کثرت میں تقسیم کر دیا جس سے اہل مغرب کی نگاہیں اس عالمگیر مطمع نظر سے ہٹ کر جو تمام نوع انسانی سے متعلق تھا اقوام و ملل کی تنگ حدود میں الجھ گئیں۔ اس نئے تخیل حیات کے لئے انہیں ایک کہیں زیادہ واقعی اور مری احساس مثلاً" تصور وطنیت کی ضرورت محسوس ہوئی۔ جس کا اظہار ان سیاسی نظامات کی شکل میں ہوا۔ جنہوں نے جذبہ قومیت کے ماتحت پرورش پائی۔ یعنی جن کی بنیاد اس عقیدے پر ہے کہ سیاسی اتحاد و اتفاق کا وجود عقیدہ وطنیت ہی کے ماتحت ممکن ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر مذہب کا تصور یہی ہے کہ اس کا تعلق صرف آخرت سے ہے، انسان کی دنیوی زندگی سے اسے کوئی سروکار نہیں تو جو انقلاب مسیحی دنیا میں رونما ہوا ہے وہ ایک طبعی امر ہے۔ مسیح علیہ السلام کا عالمگیر نظام اخلاق نیست و نابود ہو چکا ہے اور اس کی جگہ اخلاقیات و سیاسیات کے قومی نظامات نے لے لی ہے۔ اس سے اہل مغرب بجا طور پر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ مذہب کا معاملہ اہر فرد کی اپنی ذات تک محدود ہے۔ اسے دنیوی زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ لیکن اسلام کے نزدیک ذات انسانی بجائے خود ایک وحدت ہے وہ مادے اور روح کی کسی ناقابل اتحاد مثنویت کا قائل نہیں۔ مذہب اسلام کی رو سے خدا اور کائنات، کلیسا و ریاست اور روح و مادہ ایک ہی کل کے مختلف اجزا ہیں۔ انسان کسی ناپاک دنیا کا باشندہ نہیں۔ جس کو اسے ایک روحانی دنیا کی خاطر جو کسی دوسری جگہ واقع ہے ترک کر دینا چاہیے۔ اسلام کے نزدیک مادہ روح کی اس شکل کا نام ہے جس کا اظہار قید مکانی و زمانی میں ہوتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مغرب نے مادے اور روح کی مثنویت کا عقیدہ بلا کسی غور و فکر کے مانویت کے زیر اثر قبول کر لیا ہے۔ اگرچہ آج اس کے بہترین ارباب فکر اپنی اس ابتدائی غلطی کو محسوس کر رہے ہیں۔ مگر سیاستدانوں کا طبقہ ایک طرح سے اب بھی مصر ہے کہ دنیا اس اصول کو ایک ناقابل انکار حقیقت کے طور پر تسلیم کرے۔ دراصل یہ روحانی اور دنیوی زندگی کا غلط امتیاز ہے جس سے مغرب کے سیاسی اور مذہبی افکار بیشتر طور پر متاثر ہوئے ہیں اور جس سے مغرب کی مسیحی ریاستوں نے عملاً" مذہب

سے کلیتہ "علیحدگی اختیار کرلی ہے۔ اس سے چند متفرق اور بے ربط سلطنتیں قائم ہو گئی ہیں۔ جن پر کسی انسانی جذبے کی بجائے قومی اغراض کی حکمرانی ہے۔ مگر لطف یہ ہے کہ آج یہی سلطنتیں ہیں جو مسیحیت کے اخلاقی اور مذہبی عقائد کی پامالی کے بعد ایک متحد یورپ کا خواب دیکھ رہی ہیں۔ بالفاظ دیگر ان کو ایک ایسے اتحاد کی ضرورت کا احساس ہو چلا ہے جو کلیسا کے ماتحت انہیں حاصل تو تھا لیکن جس کو اخوت انسانی کے اس عالمگیر تصور کی روشنی میں تعمیر کرنے کی بجائے جو مسیح علیہ السلام کے دل میں موجود تھا' انہوں نے لوتھر کی تعلیمات کے زیر اثر تباہ برباد کر دیا۔ بہر حال دنیائے اسلامی میں کسی لوتھر کا ظہور ممکن نہیں اس لئے کہ اسلام میں کلیسا کا کوئی ایسا نظام موجود نہیں جو ازمنہ متوسط کے مسیحی نظام سے مشابہ ہو اور لہٰذا جس کے توڑنے کی ضرورت پیش آئے۔ دنیائے اسلام کے پیش نظر ایک ایسا عالمگیر نظام سیاست ہے جس کی اساس وحی و تنزیل پر ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ چونکہ ہمارے فقہاء کو ایک عرصہ دراز سے عملی زندگی سے کوئی تعلق نہیں رہا اور وہ عہد جدید کی واعیات سے بالکل بے گانہ ہیں۔ لہٰذا اس امر کی ضرورت ہے کہ ہم اس میں از سر نو قوت پیدا کرنے کے لئے ترکیب و تعمیر کی طرف متوجہ ہوں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ قومیت کا انجام ملت اسلامیہ میں کیا ہو گا؟ آیا اسلام اس تصور کو اپنے اندر جذب کر کے اس کو اسی طرح بدل دیگا جس طرح اس سے پیشتر اس نے اس سے بالکل مختلف تصورات کی ترکیب و نوعیت کو ہمہ تن بدل دیا تھا' یا یہ کہ اس سے خود اسلام کے اندر کوئی زبردست تغیر رونما ہو جائے گا۔ کچھ روز ہوئے پروفیسر ونسنک (Wensinck) نے مجھے لیڈن (ہالینڈ) سے اپنے خط میں لکھا تھا کہ اسلام نے اسی وقت اس نازک دور میں قدم رکھا ہے جس میں داخل ہوئے مسیحیت کو ایک صدی سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے۔ اس وقت سب سے بڑی دشواری یہ ہے کہ بہت سے قدیم تصورات کو ترک کر دینے کے باوجود مذہب کی بنیادوں کو تزلزل و انتشار سے محفوظ رکھنے کی صورت کیا ہے۔ پروفیسر موصوف کہتے ہیں کہ ابھی تو وہ اسی امر کا فیصلہ نہیں کر سکے کہ اس کا نتیجہ مسیحیت کے حق میں کیا ہو گا۔ اسلام کے متعلق پیشن گوئی کرنا اور بھی ناممکن ہے۔ اس وقت قوم و وطن کے تصور نے مسلمانوں کی نگاہوں کو نسل و خون کے امتیاز میں الجھا رکھا ہے اور اس طرح اسلام کے انسانیت پرور مقصد میں عملاً" حارج ہو رہا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ نسلی احساسات ترقی کرتے

کرتے ان اصول و قواعد کے محرک ہوں جو تعلیمات اسلامی کے مخالف ہی نہیں بلکہ ان سے بالکل متضاد ہوں۔ مجھے امید ہے کہ آپ حضرات اس خالص عملی بحث کے لئے مجھے معاف فرمائیں گے۔ لیکن آپ نے آل انڈیا مسلم لیگ کی صدارت کے لئے ایسے شخص کو منتخب کیا ہے جو اس امر سے مایوس نہیں ہو گیا ہے۔ اسلام اب بھی ایک زندہ قوت ہے جو ذہن انسانی کو نسل و وطن کی قیود سے آزاد کرا سکتی ہے۔ جس کا یہ عقیدہ ہے کہ مذہب کو فرد و ریاست دونوں کی زندگی میں غیر معمولی اصلیت حاصل ہے' جسے یقین ہے کہ اسلام کی تقدیر خود اس کے ہاتھ میں ہے۔ اسے کسی دوسری تقدیر کے حوالے نہیں کیا جا سکتا۔ ایسا شخص مجبور ہے کہ جس معاملہ پر غور کرے اپنے نقطہ نظر کے ماتحت کرے۔ آپ یہ خیال نہ فرمایئے گا کہ جس مسئلے کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے وہ محض نظری حیثیت رکھتا ہے۔ یہ ایک زندہ اور عملی سوال ہے جس سے بطور ایک دستور حیات اور نظام عمل کے اسلام کی ساری کائنات متاثر ہو سکتی ہے۔ صرف یہی ایک مسئلہ ہے جس کے صحیح حل پر اس امر کا دارومدار ہے کہ ہم لوگ آگے چل کر ہندوستان میں ایک ممتاز و متغیر تہذیب کے حامل بن سکیں۔ اسلام پر ابتلا و آزمائش کا کبھی ایسا سخت وقت نہیں آیا جیسا کہ آج درپیش ہے۔ ہر قوم کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے بنیادی اصولوں کی ترمیم و تاویل کرے۔ یا ان کو یک قلم منسوخ کر دے۔ لیکن اس قسم کا قدم اٹھانے سے پہلے یہ دیکھ لینا چاہئے کہ اس کے نتائج و عواقب کیا ہوں گے۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ جس انداز سے میں نے اس مسئلے پر نظر ڈالی ہے۔ اس سے کسی شخص کو یہ غلط فہمی ہو (جن حضرات کو میرے خیالات سے اتفاق نہیں ہے) کہ میں ان سے پیکار و مناقشت کا دروازہ کھولنا چاہتا ہوں۔ یہ اجتماع مسلمانوں کا ہے جن کے متعلق مجھے یقین ہے کہ وہ اسلام کے مقاصد اور اس کی تعلیمات پر قائم رہنے کے دل سے آرزومند ہیں۔ میرا مقصد صرف اس قدر ہے کہ موجودہ حالت کے متعلق جو میں نے رائے قائم کی ہے اس کا آزادی سے اظہار کر دوں۔ میرے نزدیک صرف یہی ایک صورت ہے اس امر کی کہ میں آپ کی سیاسی راہوں کو اپنے عقائد کی روشنی میں منور کر سکوں۔

قومیت ہند کا اتحاد

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آج جو مسئلہ ہمارے پیش نظر ہے۔ اس کی صحیح حیثیت کیا ہے؟

کیا واقعی مذہب ایک نجی معاملہ ہے اور آپ بھی یہ چاہتے ہیں کہ ایک اخلاقی اور سیاسی نصب العین کی حیثیت سے اسلام کا بھی وہی حشر ہو جو مغرب میں مسیحیت کا ہوا ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ہم اسلام کو بطور ایک اخلاقی تخیل کے تو برقرار رکھیں گے لیکن اس کے نظام سیاست کی بجائے ان قومی نظامات کو اختیار کر لیں۔ جن میں مذہب کی مداخلت کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا؟ ہندوستان میں یہ سوال اور بھی اہمیت رکھتا ہے کیونکہ باعتبار آبادی ہم لوگ اقلیت میں ہیں۔ یہ دعوی کہ مذہبی ارادت محض انفرادی اور ذاتی واردات نہیں۔ اہل مغرب کی زبان سے تو تعجب خیز معلوم نہیں ہوتا کیونکہ یورپ کے نزدیک مسیحیت کا تصور ہی یہی تھا کہ وہ ایک مشرب رہبانیت ہے۔ جس نے دنیائے مادیت سے منہ موڑ کر اپنی تمام تر توجہ عالم روحانیت پر جمالی ہے۔ اس قسم کے عقیدے سے لازماً" وہی نتیجہ مرتب ہو سکتا تھا۔ جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے واردات مذہب کی حیثیت جیسا کہ قرآن پاک میں ان کا اظہار ہوا ہے۔ اس سے قطعاً" مختلف ہے۔ یہ محض حیاتی نوع کے واردات نہیں ہیں کہ ان کا تعلق صرف صاحب واردات کے اندرون ذات سے ہو۔ لیکن اس سے باہر اس کے گردو پیش کی معاشرت پر ان کا کوئی اثر نہ پڑے۔ برعکس اس کے یہ وہ انفرادی واردات ہیں جس سے بڑے بڑے اجتماعی نظامات کی تخلیق ہوتی ہے اور جن کے اولین نتیجے سے ایک ایسے نظام سیاست کی تاسیس ہوئی جس کے اندر قانونی تصورات مضمر تھے۔ اور جن کی اہمیت کو محض اس لئے نظرانداز نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی بنیاد وحی الہام پر ہے۔ لہٰذا اسلام کے مذہبی نصب العین اس کے معاشرتی نظام سے جو خود اسی کا پیدا کردہ ہے۔ الگ نہیں دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔ اگر آپ نے ایک کو ترک کیا تو دوسرے کا ترک بھی لازم آئے گا۔ میں نہیں سمجھتا کہ کوئی مسلمان ایک لمحے کے لئے بھی کسی ایسے نظام سیاست پر غور کرنے کے لئے آمادہ ہو گا۔ جو کسی ایسے وطنی یا قومی اصول پر (جو اسلام کے اصول اتحاد کی نفی کرے) مبنی ہو۔ یہ وہ مسئلہ ہے جو آج مسلمانان ہندوستان کے سامنے ہے۔:

مشہور فرانسیسی عالم رینان (RENAN) کا قول ہے کہ انسان نہ نسل کی قید گوارہ کر سکتا ہے' نہ مذہب کی' نہ دریاؤں کا بہاؤ اس کی راہ میں حائل ہو سکتا ہے' نہ پہاڑوں کی سمتیں اس کے دائرے کو محدود کر سکتی ہیں۔ اگر صحیح الدماغ انسانوں کا ایک اجتماع موجود ہے اور ان کے

دلوں میں جذبات کی گرمی ہے۔ انہیں کے اندر وہ اخلاقی شعور پیدا ہو جائے گا جسے ہم لفظ "قوم" سے تعبیر کرتے ہیں۔ مجھے اس قسم کی ترکیب و اجتماع سے انکار نہیں۔ اگرچہ یہ ایک نہایت ہی طول اور صبر آزما عمل ہے۔ اس لئے کہ اس کا مطلب انسان کی زندگی کو عملاً" ایک نئے سانچے میں ڈھالنا ہے۔ اور اس کے جذبات و احساسات کو یکسر پلٹ دینا ہے۔ اگر اکبر کے دین الٰہی یا کبیر کی تعلیمات عوام الناس میں مقبول ہو جاتیں تو ممکن تھا کہ ہندوستان میں بھی اس قسم کی ایک نئی قوم پیدا ہو جاتی۔ لیکن تجربہ بتلاتا ہے کہ ہندوستان کے مختلف مذاہب اور متعدد جاتیوں میں اس قسم کا کوئی رجحان موجود نہیں کہ وہ اپنی انفرادی حیثیت کو ترک کر کے ایک وسیع جماعتوں کی صورت اختیار کر لیں۔ ہر گروہ اور ہر مجموعہ مضطرب ہے۔ کہ اس کی ہیئت اجتماعیہ قائم رہے لہٰذا اس قسم کا اخلاقی شعور جو رینان کے لئے کسی قوم کی تخلیق کے لئے ناگزیر ہے۔ ایک ایسی عظیم قربانی کا طالب ہے جس کے لئے ہندوستان کی کوئی جماعت تیار نہیں۔ قومیت ہند کا اتحاد ان تمام جماعتوں کی نفی میں نہیں بلکہ ان کے تعاون و اشتراک اور ہم آہنگی پر مبنی ہے۔ صحیح تدبر کا تقاضا ہے کہ ہم حقائق کا خواہ وہ کیسے بھی ناخوشگوار کیوں نہ ہوں اعتراف کریں۔ حصول مقاصد کی عملی راہ یہ نہیں ہے کہ ایک ایسی حالت کو فرض کر لیا جائے جو واقعتہ" موجود نہ ہو۔ ہمارا طریق کار یہ ہونا چاہیے کہ ہم باقیات کی تقریض کی بجائے ان سے جہاں تک ہو سکے فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں۔ میری رائے میں ہندوستان اور ایشیا کی قسمت صرف اس بات پر مبنی ہے کہ ہم قومیت ہند کا اتحاد اسی اصول پر قائم کریں اگر ہم ہندوستان کو چھوٹا سا ایشیا قرار دیں تو غیر مناسب نہ ہو گا اہل ہند کا ایک حصہ اپنی تہذیب و تمدن کے اعتبار سے مشرقی عوام سے مشابہہ ہے لیکن اس کا دوسرا حصہ ان قوموں سے ملتا جلتا ہے جو مغربی اور وسطی ایشیا میں آباد ہیں' اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر ہندوستان کے اندر اشتراک وتعاون کی کوئی موثر راہ نکل آئی تو اس سے نہ صرف اس قدیم ملک میں جو اپنے باشندوں کی کسی طبعی خرابی وجہ سے نہیں بلکہ محض اپنی جغرافیائی حیثیت کے باعث ایک عرصہ دراز سے مصائب و فتن کا تختہ مشق بن رہا ہے صلح و آشتی قائم ہو جائے گی۔ بلکہ اس کے ساتھ ہی تمام ایشیا کا سیاسی عقدہ بھی حل ہو جائے گا۔

باین ہمہ یہ امر کس قدر افسوسناک ہے کہ اب تک ہم نے باہمی تعاون و اشتراک کی کس

قدر کوشش کی ہے سب ناکام ثابت ہوئی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ہماری ناکامیوں کا باعث کیا ہے؟
اس کا جواب یہ ہے کہ شاید ہمیں ایک دوسرے کی نیتوں پر اعتماد نہیں اور باطناً" ہم تغلب و اقتدار کے خواہشمند ہیں۔ یا یہ ممکن ہے کہ ہم اتحاد و تعاون کے مقاصد عالیہ کے لئے اتنا ایثار بھی نہیں کر سکتے کہ اب تک جو اجارات ہمیں کسی نہ کسی طرح حاصل ہو گئے ہیں ان سے دستبردار ہو جائیں۔ ہم اپنی نفسانیت کو قومیت کے نقاب میں چھپاتے ہیں اور اگرچہ ظاہری طور پر ہمیں ایک ہی روادارانہ حب الوطنی کا ادعا ہے لیکن دلوں میں ذات پات کی تنگی اور فرقہ آرائی کی ہوس بدستور کام کر رہی ہے۔ ہم لوگ اس اصول کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں کہ ہر جماعت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے تہذیب و تمدن کی نشوونما میں آزادی کے ساتھ قدم بڑھائے۔ لیکن ہماری ناکامی کے اسباب کچھ اور بھی ہیں میرا دل اب بھی امید سے لبریز ہے۔ واقعات کا رجحان بہرکیف ہمارے داخلی اتحاد اور اندرونی ہم آہنگی ہی کی جانب نظر آتا ہے اور جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے مجھے یہ اعلان کرنے میں مطلق تامل نہیں اگر فرقہ وارانہ امور کی ایک مستقل اور پائیدار تصفیے کے لئے اس بنیادی اصول کو تسلیم کر لیا جائے کہ مسلمانان ہندوستان کو اپنی روایات اور تمدن کے ماتحت اس ملک میں آزادانہ نشوونما کا حق حاصل ہے۔ تو وہ اپنے وطن کی آزادی کے لئے بڑی سے بڑی قربانی سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔ یہ اصول کہ ہر فرد اور جماعت اس امر کی مجاز ہے کہ وہ اپنے عقائد کے مطابق آزادانہ ترقی کرے کسی تنگ نظر فرقہ داری پر مبنی نہیں۔ فرقہ داری کی بھی بہت سی صورتیں ہیں۔ وہ فرقہ داری جو دوسری قوموں سے نفرت اور ان کی بدخواہی کی تعلیم دیں اس کے ذلیل اور ادنی ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ میں دوسری قوموں کے رسوم و قوانین اور ان کے معاشرتی و مذہبی ادارت کی دل سے عزت کرتا ہوں' بلکہ بحیثیت مسلمان میرا یہ فرض ہے کہ اگر ضرورت پیش آئے تو احکام قرآنی کے حسب اقتضاء میں ان عبادت گاہوں کی حفاظت کروں بایں ہمہ مجھے اس جماعت سے دلی محبت ہے جو میرے اعضاء و اطوار اور میری زندگی کا سرچشمہ ہے اور جس نے اپنے دین اور اپنے ادب' اپنی حکمت اور اپنے تمدن سے بہرامند کر کے مجھے وہ کچھ عطا کیا جس سے میری موجودہ زندگی کی تشکیل ہوئی۔ یہ اسی کی برکت ہے کہ میرے ماضی نے از سرنو زندہ ہو کر مجھ میں یہ احساس پیدا کر دیا ہے کہ وہ اب بھی میری ذات میں سرگرم کار ہے۔

نہرو رپورٹ کے واضعین تک نے بھی فرقہ واری کے اس محمود پہلو کا اعتراف کیا ہے۔ علیحدگی سندھ کے مسئلے پر بحث کرتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے:

"یہ کہنا کہ قومیت کے وسیع نقطہ نگاہ کے ماتحت کسی فرقہ وارانہ صوبے کا قیام مناسب نہیں بالکل ایسا ہے' جیسے یہ دعوی کہ بین الاقوامی نصب العین کا تقاضا ہے کہ علیحدہ علیحدہ قوموں کا وجود قائم نہ رہے۔ ان دونوں بیانات میں ایک حد تک صداقت موجود ہے۔ لیکن بین الاقوامی نصب العین کے گرم سے گرم حامیوں کو بھی اس امر کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ قوموں کی پوری پوری آزادی کے بغیر کسی بین الاقوامی ریاست کا وجود قائم کرنا مشکل ہے۔ اسی طرح مکمل تمدنی آزادی کے بغیر (اور یاد رکھئے کہ اپنی ارفع و اعلیٰ صورت میں فرقہ واری سوائے تمدن کے اور کچھ نہیں) ایک ہم آہنگ اور متوازن قوم کا پیدا کرنا بھی ناممکن ہے۔"

ہندوستان کے اندر ایک اسلامی ریاست

لہٰذا ثابت ہوا کہ ہندوستان میں ایک متوازن اور ہم آہنگ قوم کے نشوونما کی خاطر مختلف ملتوں کا وجود ناگزیر ہے۔ مغربی ممالک کیطرح ہندوستان کی یہ حالت نہیں کہ اس میں ایک ہی قوم آباد ہو' وہ ایک ہی نسل سے تعلق رکھتی ہو اور اس کی زبان بھی ایک ہو۔ ان کے اعمال و افعال میں وہ احساس پیدا نہیں ہو سکتا جو ایک ہی نسل کے مختلف افراد میں موجود رہتا ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو ہندو بھی کوئی واحد الجنس قوم نہیں' پس یہ عمل کسی طرح بھی مناسب نہیں کہ مختلف ملتوں کے وجود کا خیال کئے بغیر ہندوستان کے اندر ایک اسلامی ہندوستان قائم کریں۔ میری رائے میں آل پارٹیز مسلم کانفرنس کی قراردادوں سے اسی بلند نصب العین کا اظہار ہوتا ہے جس کا تقاضا یہ ہے کہ مختلف ملتوں کے وجود کو فنا کئے بغیر ان سے ایک متوافق اور ہم آہنگ قوم تیار کی جائے تاکہ وہ آسانی کے ساتھ اپنے ان ممکنات کو جو ان تمام مطالبات کی جو اس قرارداد میں موجود ہیں نہایت شدومد سے تائید کرے۔ ذاتی طور پر تو میں ان مطالبات سے ایک قدم آگے بڑھنا چاہتا ہوں۔ میری خواہش ہے کہ پنجاب' سندھ' صوبہ سرحد اور بلوچستان کو ایک ہی ریاست میں ملا دیا جائے۔ خواہ یہ ریاست سلطنت برطانیہ کے اندر حکومت خود اختیاری حاصل کرے' خواہ اس کے باہر۔ مجھے تو ایسا نظر آتا ہے کہ اور

نہیں تو شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کو آخر ایک منظم اسلامی ریاست قائم کرنا پڑے گی۔ اس تجویز کو نہرو کمیٹی میں بھی پیش کیا گیا تھا۔ لیکن اراکین مجلس نے اسے اس بنا پر روک دیا کہ اگر اس قسم کی کوئی ریاست قائم ہوئی تو اس کا رقبہ اس قدر وسیع ہو گا کہ اس کا انتظام کرنا دشوار ہو جائے گا۔ بے شک اگر رقبے کا لحاظ کیا جائے تو اراکین مجلس کا یہ خیال صحیح ہے لیکن آبادی پر نظر کی جائے تو اس ریاست کے باشندوں کی تعداد اس وقت کے بعد صوبوں سے بھی کم ہو گی غالباً" قسمت انبالہ یا اس قسم کے دوسرے اضلاع کو الگ کر دینے سے جن میں ہندو آبادی کا غلبہ ہے اس کی وسعت اور انتظامی مشکلات میں اور بھی کمی ہو جائے گی۔ پھر ان اضلاع کی علیحدگی سے غیر مسلم اقلیتوں کے حقوق کہیں زیادہ محفوظ ہو جائیں گے۔ اس تجویز کو سن کر نہ انگریزوں کو پریشان ہونا چاہیے نہ ہندوؤں کو' ہندوستان دنیا میں سب سے بڑا اسلامی ملک ہے اور اگر ہم چاہتے ہیں کہ اس ملک میں اسلام بحیثیت ایک تمدنی قوت کے زندہ رہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ ایک مخصوص علاقے میں اپنی مرکزیت قائم کر سکے۔ ہندوستانی مسلمانوں کی اس زندہ اور جاندار طبقے کی مرکزیت کی بدولت جس نے دولت برطانیہ کی ناانصافیوں کے باوجود فوج اور پولیس میں شریک ہو کر انگریزوں کو اس قابل بنایا کہ وہ اس ملک پر اپنی حکومت قائم رکھیں' ہندوستان کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ بلکہ اس سے خود مسلمانوں کے احساسات ذمہ داری قوی ہو جائیں گے اور ان کا جذبہ حب الوطنی بڑھ جائے گا۔ اگر شمال مغربی ہندوستان (مسلمانوں کو اس امر کا موقع دیا گیا) کہ وہ ہندوستان کے جسد سیاسی کے اندر رہ کر اپنے نشوو ارتقاء میں آزادانہ قدم اٹھا سکیں تو وہ تمام بیرونی حملوں کے خلاف خواہ وہ حملہ بزور قوت ہو یا بزور خیالات ہندوستان کے بہترین محافظ ثابت ہوں گے۔ پنجاب میں مسلمانوں کی آبادی چھپن فیصد ہے لیکن ہندوستان کی پوری فوج میں ہمارا حصہ چون فیصد ہے اور اگر عساکر ہند کی کل تعداد میں سے ان انیس ہزار گورکھوں کو جو نیپال کی آزاد ریاست سے بھرتی کئے جاتے ہیں' نکال دیا جائے تو مسلمانوں کی تعداد باسٹھ فیصدی ہو جائے گی۔ حالانکہ اس اندازے میں وہ چھ ہزار جنگجو شامل نہیں جو بلوچستان اور صوبہ سرحد سے بھرتی کئے جاتے ہیں۔ اس سے ان تمام صلاحیتوں کا اندازہ کر سکیں گے جو شمال مغربی ہندوستان کی مسلم آبادی میں موجود ہیں اور جن کی بدولت وہ تمام ہندوستان کو غیر ملکی چیرہ دستیوں سے محفوظ و مامون رکھ

سکتی ہے۔ رائٹ آنریبل مسٹر سری نواس شاستری کا خیال ہے کہ مسلمانوں کا مطالبہ شمال مغربی سرحد کے ساتھ ساتھ خود مختار اسلامی ریاستیں قائم کی جائیں۔ ان کی اس خواہش کا اظہار کرنا ہے کہ اگر ضرورت پیش آئے تو حکومت ہند پر زور ڈالا جا سکے۔ میں یہ عرض کروں گا کہ مسلمانان ہند ہندوستان کے دل میں اس قسم کا کوئی جذبہ موجود نہیں۔ ان کا مدعا صرف اس قدر ہے کہ وہ اپنی ترقی کی راہ آزادی کے ساتھ قدم بڑھائیں۔ لیکن یہ مرکزی حکومت کے ماتحت ممکن نہ ہو گا۔ جسے قوم پسند ہندو ارباب سیاست محض اس لئے قائم کرنا چاہتے ہیں کہ ان کو دوسری ملتوں پر ہمیشہ کے لئے غلبہ ہو جائے۔

بہرحال ہندوؤں کے دل میں اس قسم کا خدشہ نہیں ہونا چاہئے کہ آزاد اسلامی ریاستوں کے قیام سے ایک طرح کی مذہبی حکومت قائم ہو جائے گی۔ میں ابھی عرض کر چکا ہوں کہ اسلام میں مذہب کا مفہوم کیا ہے؟ یاد رکھنا چاہیے کہ اسلام کوئی کلیسائی نظام نہیں، بلکہ یہ ایک ریاست ہے جس کا اظہار روسو سے بھی کہیں پیشتر ایک ایسے وجود میں آیا جو عقد اجتماعی کا پابند تھا۔ ریاست اسلامی کا انحصار ایک اخلاقی نصب العین پر ہے جس کا عقیدہ یہ ہے کہ انسان شجر وحجر کی طرح کسی خاص زمین سے وابستہ نہیں بلکہ وہ ایک روحانی ہستی ہے جو ایک اجتماعی ترکیب میں حصہ لیتا ہے اور اس کے ایک زندہ جزو کی حیثیت سے چند فرائض اور حقوق کا مالک ہے۔ اسلامی ریاست کی نوعیت کا اندازہ ٹائمز آف انڈیا کے اس افتتاحیہ سے کیا جا سکتا ہے جس میں لکھا ہے کہ قدیم ہندوستان میں ریاست کا یہ فرض تھا کہ سود کے متعلق قوانین بنائیں لیکن باوجود اس کے کہ اسلام میں سود لینا حرام ہے اسلامی حکومت نے شرح سود کوئی پابندیاں عائد نہیں کیں۔ میں صرف ہندوستان اور اسلام کی فلاح و بہبود کے خیال سے ایک منظم اسلامی ریاست کے قیام کا مطالبہ کر رہا ہوں۔ اس سے ہندوستان کے اندر توازن قوت کی بدولت امن وامان قائم ہو جائے گا اور اسلام کو اس امر کا موقع ملے گا کہ وہ ان اثرات سے آزاد ہو کر جو عربی شاہنشاہیت کی وجہ سے اب تک اس پر قائم ہیں اس جمود کو توڑ ڈالے۔ جو اس کی تہذیب وتمدن، شریعت اور تعلیم پر صدیوں سے طاری ہے۔ اس سے نہ صرف ان کے صحیح معنی کی تجدید ہو سکے گی بلکہ وہ زمانہ حال کی رو سے بھی قریب تر ہو جائیں گے۔

فیڈرل ریاستیں

میرے خیال میں اب یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو گئی ہے کہ اگر ہم ہندوستان کی آئندہ حکومت کے لئے کسی مستقل لسانی اور عقائد معاشرت کے اختلافات کو مد نظر رکھتے ہوئے ایسی آزاد ریاستیں قائم کر دیں جو زبان، نسل، تاریخ، مذہب اور اقتصادی مفاد کے اشتراک پر مبنی ہوں۔ سائمن رپورٹ کے اندر فیڈریشن کا جو تصور قائم کیا گیا ہے اس کے ماتحت بھی ضروری ہے کہ مرکزی مجلس وضع قوانین کا انتخاب عوام سے عمل میں نہ آئے۔ بلکہ وہ فیڈرل ریاستوں کے نمائندوں پر مشتمل ہو۔ سائمن رپورٹ کی رو سے تقریباً انہی اصولوں کی بنا پر جن کا اظہار میں نے کیا ہے صوبوں کی تقسیم بھی از سر نو ہو جانی چاہیے۔ میں ان دونوں تجویزوں کی دل سے تائید کرتا ہوں۔ بلکہ اس کے ساتھ ہی یہ بھی عرض کروں گا کہ صوبوں کی جدید تقسیم سے پیشتر دو شرطوں کا پورا ہو جانا ضروری ہے۔ اولاً یہ تقسیم نئے دستور کی اجراء سے پہلے مکمل ہو جانی چاہیے۔ ثانیاً اس کی نوعیت ایسی ہو کہ اس سے فرقہ وارانہ مسائل ہمیشہ کے لئے طے ہو جائیں۔ اگر صوبوں کی تقسیم کسی صحیح اصول کی بنا پر ہو گی تو اس سے مخلوط اور جداگانہ انتخابات کا مسئلہ ہمیشہ کے لئے حل ہو جائے گا۔ میری رائے میں اس سارے جھگڑے کی بنا صوبوں کی موجودہ تقسیم پر ہے۔ ہندوؤں کا خیال ہے جداگانہ انتخابات کا اصول قومیت کے منافی ہے۔ ان کا نزدیک لفظ قومیت کا مفہوم صرف اس قدر ہے کہ ہندوستان کے تمام باشندے باہم اس طرح خلط ملط ہو جائیں کہ ان کے اندر کسی مخصوص ملت کا انفرادی وجود باقی نہ رہے۔ لیکن ہندوستان کی یہ حالت نہیں۔ نہ ہم اس کے آرزومند ہیں۔ ہندوستان میں مختلف اقوام اور مختلف مذاہب موجود ہیں اس کے ساتھ ہی اگر مسلمانوں کی معاشی پستی ان بے حد مقروضیت (بالخصوص پنجاب میں) اور بعض صوبوں میں ان کی ناکافی اکثریت کا خیال کر لیا جائے تو آپ کی سمجھ میں آجائے گا کہ مسلمان جداگانہ انتخابات کے لئے کیوں مضطرب ہیں۔ ہندوستان جیسے ملک میں اور خاص طور سے ان حالات میں جو اس وقت یہاں ہیں اس امر کی توقع رکھنا کہ تمام اقلیتوں پر ہندوؤں کا تغلب قائم ہو جائے لیکن اگر صوبوں کی تقسیم کسی ایسے اصول کے ماتحت عمل میں آجائے کہ صوبے کے اندر تقریباً ایک ہی طرح کی ملتیں بستی ہوں اور ان کی نسل، ان کی زبان، ان کا مذہب اور ان کی تہذیب و تمدن ایک ہو تو مسلمانوں کو مخلوط انتخابات پر کوئی اعتراض نہیں۔

سائمن رپورٹ اور فیڈریشن

لیکن جہاں تک مرکزی فیڈرل ریاست کے اختیارات کا تعلق ہے انگریز اور ہندو پنڈتوں نے جو دستور حکومت تیار کیا ہے اس سے اس باریک اختلاف کا صاف پتہ چلتا ہے جو ان دونوں کے مقاصد میں موجود ہے۔ ہندوستان کے پنڈتوں کو یہ منظور نہیں کہ مرکزی حکومت کے موجودہ اختیارات میں سرمو بھی فرق آئے۔ ان کا مطالبہ صرف اس قدر ہے کہ ان اختیارات کو مرکزی مجلس وضع قوانین کی رضامندی پر چھوڑ دیا جائے۔ جس میں اس وقت بھی انہیں اکثریت ہے اور جب اراکین کی نامزدگی کا طریق ختم ہوا تو یہ کثرت اور بھی زیادہ ہو جائے گی اس کے برعکس ہندوستان کے پنڈتوں نے یہ محسوس کرتے ہوئے کہ اگر مرکزی حکومت میں اصول جمہوریت کا اطلاق ہو گیا تو اس کا نتیجہ ان کا مفاد کے خلاف ہو گا کیونکہ مزید اختیارات مل جانے پر تمام قوت ان کے ہاتھ سے نکل جائے گی یہ طے کیا کہ وہ اپنے اصول جمہوریت کا تجربہ حکومتوں میں کریں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انہوں نے فیڈریشن کے اصول پر عمل کرنے کا خیال ظاہر کیا ہے۔ بلکہ اس کے متعلق کچھ تجاویز بھی پیش کر دی ہیں۔ لیکن انہوں نے اس اصول پر جس پہلو سے غور کیا ہے وہ اس سے بالکل مختلف ہے جو مسلمانان ہند کے پیش نظر ہے۔ مسلمانوں نے فیڈریشن کے مطالبہ صرف اس لئے کیا ہے کہ فرقہ وارانہ مسئلے کے تصفیے کی صرف یہی ایک صورت ہے۔ برخلاف اس کے شاہی کمیشن کے ارکان کے ذہن میں فیڈریشن کا جو تصور ہو وہ اصولی طور سے کسی قدر بھی درست اور محکم کیوں نہ ہو اس سے فیڈرل ریاستوں میں کسی خود اختیاری حکومت کا قائم ہونا مشکل ہے۔ ان کی غرض صرف اس قدر ہے کہ اصول جمہوریت کے نفوذ سے ہندوستان میں جو صورت حالات پیدا ہو گئی ہے اس سے فرار کی کوئی راہ نکل آئے۔ فرقہ وارانہ مسئلے پر انہوں نے کوئی غور نہیں کیا بلکہ اسے ویسے ہی چھوڑ دیا ہے۔

اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جہاں تک حقیقی فیڈریشن کا تعلق ہے سائمن رپورٹ کی تجاویز نے اس کی پوری پوری نفی کر دی ہے۔ نہرو رپورٹ نے محض اس امر کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ مرکزی مجلس وضع قوانین میں ہندوؤں کی اکثریت ہے وحدتی نظام کی سفارش کی۔

کیونکہ اس سے تمام ہندوستان پر ہندوؤں کا تغلب قائم ہو جاتا ہے۔ سائمن رپورٹ نے محض ایک لفظی فیڈریشن کی سکیم پیش کی ہے۔ جس کی تہہ میں برطانیہ کا اقتدار بدستور قائم رہے گا اس کی وجہ کچھ تو یہ ہے کہ انگریز طبعاً" اس اقتدار سے دستبردار ہونا پسند نہیں کرتے جو اب تک انہیں حاصل ہے اور کچھ یہ کہ اگر فرقہ وارانہ مسئلے کا تصفیہ نہ ہو سکا ان کو ہندوستان پر مستقلاً" اپنا قبضہ رکھنے کے لئے ایک اچھا عذر مل جائے گا۔ میں تو اس امر کا تصور بھی نہیں کر سکتا کہ ہندوستان میں وحدتی حکومت قائم ہو۔ جن اختیارات کو فاضل (Residuary) کہا جاتا ہے وہ صرف آزاد ریاستوں کو ملنے چاہیں۔ مرکزی فیڈرل ریاست کے ذمے صرف ایسے اختیارات رہنے چاہیں جو تمام فیڈرل ریاستیں بطیب خاطر اس کے سپرد کر دیں۔ میں مسلمانان ہندوستان کو بھی یہ رائے نہیں دوں گا کہ وہ کسی ایسے نظام حکومت سے خواہ وہ برطانوی ہو یا ہندی اظہار اتفاق کریں جو حقیقی فیڈریشن کے اصول پر مبنی نہ ہو یا جس میں ان کے جداگانہ سیاسی وجود کو تسلیم نہ کیا جائے۔

فیڈرل اسکیم اور راؤنڈ ٹیبل کانفرنس

پیشتر اس کے کہ انگریز مرکزی حکومت میں اساسی تبدیلی کے لئے کوئی موثر ذریعہ پیدا کرتے اس امر کو محسوس کر لیا گیا تھا کہ اس میں تبدیلی کی ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آخرالامر راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں والیان ریاست کی شمولیت کو بھی ضروری قرار دیا گیا اس سے باشندگان ہندوستان اور بالخصوص اقلیتوں کو بجاطور پر تعجب ہوا کہ والیان ریاست نے کس قدر تیزی کے ساتھ اپنی رائے بدل لی اور ہندوستان کے فیڈریشن میں شامل ہونے کے لئے تیار ہو گئے۔ اس اعلان کے ساتھ ہی ہندوؤں نے بھی جو اب تک وحدتی حکومت کے طرفدار چلے آتے تھے بغیر کسی تکلف کے فیڈریشن کے اصول سے اتفاق کر لیا۔ ابھی تھوڑے ہی دن ہوئے جب شاستری نے سر جان سائمن کی فیڈریشن والی سکیم پر نہایت سختی سے نکتہ چینی کی تھی۔ لیکن وہ بھی دفعتاً" فیڈریشن پر راضی ہو گئے اور اپنی اس رضامندی کا اظہار کانفرنس کے ابتدائی اجلاس میں ہی کر دیا۔ جس سے وزیر اعظم انگلستان کو موقع ملا کہ وہ اپنی آخری تقریر میں چند نہایت ہی برجستہ اشارات کر سکیں۔ یہ سب کچھ خالی از علت نہیں۔ انگریزوں نے والیان

ریاست کو فیڈریشن میں شریک ہونے کی دعوت دی اور ہندو چپ چاپ اس پر رضامند ہو گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ والیان ریاست کی شرکت سے جن میں مسلمانوں کی تعداد نہایت کم ہے دو مقاصد حاصل ہوتے ہیں ایک طرف وہ ہندوستان پر برطانوی اقتدار کے تسلسل میں مدد دیں گے' دوسری طرف ہندوؤں کو فیڈرل اسمبلی میں ان کی بدولت اکثریت حاصل ہو جائے گی۔ میرا خیال ہے کہ مرکزی حکومت کی شکل کے متعلق ہندو اور مسلمانوں میں جو اختلاف موجود ہے انگریز مدبرین والیان ریاست کے ذریعے نہایت چالاکی کے ساتھ اس سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ خود والیان ریاست بھی یہ محسوس کرتے ہیں کہ اس سکیم کے ماتحت ان کی مستبدانہ حکومت اور بھی زیادہ مضبوط ہو جائے گی۔ اگر مسلمانوں نے اس اسکیم کو خاموشی کے ساتھ منظور کر لیا تو ان کا سیاسی وجود تھوڑے ہی عرصے میں کالعدم ہو جائے گا۔ کیونکہ اس قسم کی فیڈریشن میں ہندو والیان ریاست کی اکثریت ہو گی اور وہی حکومت کے سیاہ و سفید کے مالک ہوں گے۔ اگر دولت برطانیہ کے مفاد کا سوال درپیش ہو گا تو وہ حکومت انگلستان کا ساتھ دیں گے۔ لیکن جہاں تک ملک کے اندرونی نظم و نسق کا تعلق ہے وہ ہندوؤں کا تسلط اور اقتدار قائم رکھیں گے۔ بالفاظ دیگر یہ سکیم برطانوی حکومت اور ہندوؤں کے درمیان ایک قسم کی مفاہمت ہے۔ یعنی اگر تم میرا اقتدار ہندوستان پر قائم رکھو میں تمہیں ایک ایسی حکومت قائم کرنے میں مدد دوں گا جس میں تمہارا یعنی ہندوؤں کا غلبہ ہو گا۔ لہٰذا اگر برطانوی ہندوستان کے تمام صوبے حقیقتاً" خود مختار ریاستوں کی صورت اختیار نہ کر لیں تو پھر فیڈریشن میں والیان ریاست کی شرکت کا مقصد صرف اس قدر ہو سکتا ہے کہ انگریز مدبرین اپنے اختیارات سے دستبردار ہوئے بغیر نہایت چالاکی کے ساتھ تمام جماعتوں کو خوش کر دینا چاہتے ہیں۔ مسلمانوں کو لفظ فیڈریشن' ہندوؤں کو مرکز میں اکثریت اور انگریز حامیان سلطنت کو خواہ وہ ٹوری جماعت سے ہوں یا مزدور حقیقی اختیارات کی قوت ہے۔

ہندوستان میں ہندو ریاستوں کی تعداد اسلامی ریاستوں سے کہیں زیادہ ہے لہٰذا یہ دیکھنا باقی ہے کہ مسلمانوں کا یہ مطالبہ کہ انہیں مرکزی فیڈرل اسمبلی میں 33 فیصدی نشستیں حاصل ہوں۔ اسی ایک ایوان یا ایوانات میں کیونکر پورا کیا جائے گا۔ جو دیسی ریاستوں اور برطانوی ہندوستان دونوں کے نمائندوں پر مشتمل ہوں گے۔ میں سمجھتا ہوں کہ مسلمان مندوبین

فیڈرل حکومت کے اس مفہوم کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ جیسا کہ کانفرنس میں اس پر غوروخوض ہو رہا ہے۔ ابھی آل انڈیا فیڈریشن میں مسلمانوں کی نیابت کا مسئلہ پیش نہیں آیا البتہ رائٹر سے مختصراً" یہ اطلاع موصول ہوئی ہے کہ اس وقت جو رپورٹ پیش ہوئی ہے اس میں دو ایوانوں کی سفارش کی گئی ہے۔ جن میں برطانوی ہند اور دیسی ریاستوں کے نمائندے شریک ہوں گے۔ لیکن ان کی تعداد کے مسئلے پر اس وقت بحث ہوگی جب کمیٹی ان عنوانات پر غور کرے گی جن کو ابھی سب کمیٹی کے ذمے نہیں کیا گیا۔ میری رائے میں تناسب کا سوال نہایت اہم ہے اور بہتر ہوتا کہ اسمبلی کی ہیئت ترکیبی کے ساتھ اس پر بھی بحث ہو جاتی۔

میرے نزدیک سب سے بہتر صورت یہ تھی کہ ابتدا میں فیڈریشن صرف برطانوی علاقے تک محدود ہوتا۔ کسی ایسی فیڈرل اسکیم سے بھی جو استبداد اور جمہوریت کے ناپاک اتحاد پر مبنی ہو سوائے اس کے اور کوئی نتیجہ مرتب نہیں ہو سکتا کہ برطانوی ہندوستان بدستور وحدتی حکومت کا تختہ مشق بنا رہے۔ یہ وحدتی حکومت ممکن ہے کہ انگریزوں کے لئے مفید ہو اور والیان ریاست اور اکثریت کے لئے بھی۔ لیکن اس سے مسلمانوں کے لئے فائدے کی کوئی توقع رکھنا بے سود ہے۔ جب تک کہ انہیں ہندوستان کے گیارہ صوبوں میں سے پانچ میں پورے پورے فاضل اختیارات کے ساتھ اکثریت کے حقوق حاصل ہو جائیں اور مرکزی فیڈرل اسمبلی کی کل تعداد میں 33 فیصدی نشستیں نہ ملیں۔ جہاں تک کہ برطانوی ہند کے صوبوں کے لئے حاکمانہ اختیارات کا تعلق ہے۔ ہز ہائنس نواب بھوپال' سر اکبر حیدری اور مسٹر جناح کا رویہ سراسر حق بجانب ہے۔ چونکہ اب والیان ریاست بھی فیڈریشن میں شریک ہو رہے ہیں۔ لہٰذا مرکزی مجلس کے متعلق ہمیں اپنے مطالبے کو نئی شکل میں پیش کرنا چاہئے۔ اب یہ مسئلہ محض برطانوی ہند کی اسمبلی میں تناسب کا نہیں رہا۔ بلکہ اب سوال آل انڈیا فیڈریشن میں مسلمانوں کی نمائندگی کا ہے۔ ہمارا مطالبہ یہ ہونا چاہیے کہ ان اسلامی ریاستوں کے علاوہ جو فیڈریشن میں شریک ہمیں تمام فیڈریشن میں 1/3 نشستیں حاصل ہوں۔

مسئلہ دفاع

ہندوستان میں فیڈرل نظام قائم کرنے میں ایک بہت بڑی دقت دفاع و حفاظت کی ہے۔

شاہی کمیشن کے ارکان نے اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے تمام نقائص کو پیش نظر رکھا ہے۔ تاکہ جنگی نظم و نسق کی باگ ہمیشہ دولت برطانیہ کے ہاتھ میں رہے۔ انہوں نے لکھا ہے:۔

"ہندوستان اور برطانیہ کا تعلق کچھ ایسا ہے کہ ہندوستان کے مسئلہ دفاع کو اب نہ مستقل قریب میں محض ہندوستانی مسئلہ تصور کیا جا سکتا ہے۔ نہ دفاعی عساکر کا نظم و نسق ہمیشہ نائبین سلطنت کے ہاتھوں میں رہنا چاہیے۔"

کیا اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا چاہئے کہ جب تک برطانوی افواج اور برطانوی افسروں کی مدد کے بغیر ہندوستانی اپنی سرحدوں کی حفاظت کے قابل نہ ہو جائیں برطانوی ہندوستان میں ذمہ دارانہ حکومت قائم نہیں کی جا سکتی؟ موجودہ حالت میں اس امر سے انکار کرنا مشکل ہے کہ یہ واقعی ہندوستان کی آئینی ترقی کی راہ میں ایک رکاوٹ ہے۔ اگر نہرو رپورٹ کے اس اصول کو تسلیم کر لیا جائے کہ جب کبھی ہندوستان کو مزید اختیارات حاصل ہوں۔ ان کا مطلب یہ بھی ہو گا کہ فوجوں کا نظم و نسق ہندوستان کی منتخبہ مجلس وضع قوانین کے ماتحت ہو۔ تو وہ تمام امیدیں جو اس امر سے وابستہ ہیں کہ مرکزی حکومت بتدریج اس منزل کی طرف بڑھے۔ جس کا اعلان 20 اگست 1917ء میں ہوا تھا۔ معرض خطر میں آ جائے گی۔"

اس بیان کی مزید تائید کے لئے ارکان کمیشن نے آگے چل کر اس امر پر خاص زور دیا ہے۔ کہ ہندوستان میں مختلف مذاہب اور مختلف نسلوں کے درمیان جن کی صلاحیتں اور قوتیں ایک دوسرے سے بالکل جداگانہ ہیں۔ ایک تصادم رونما ہے۔ پھر یہ کہہ کر اس مسئلہ کو اور پیچیدہ بنانے کی کوشش کی ہے کہ:۔

"یہ حقیقت کہ ہمارے عام اور مروجہ الفاظ میں ہندوستانی ایک قوم نہیں ہیں اور یہ بھی عیاں ہو جاتی ہے۔ جب یہ دیکھتے ہیں کہ ہندوستان کی جنگجو قوموں اور دوسری نسلوں میں کس قدر فرق موجود ہے۔"

اس مسئلے کے ان پہلوؤں پر زور دینے کا مقصد یہ ہے کہ انگریز صرف بیرونی حملوں ہی سے ہندوستان کی حفاظت نہیں کر رہے ہیں۔ بلکہ وہ اس کے اندرونی امن و سکون کے بھی "غیر جانبدار محافظ" ہیں۔ بہر حال فیڈریشن میں جیسا کہ میں اس کا مطلب سمجھتا ہوں اس مسئلے کا صرف ایک پہلو باقی رہ جائیگا یعنی ہندوستان کے خارجی تحفظ کا صوبجاتی عساکر کے علاوہ جو

ہندوستان کے اندرونی امن وامان کے لئے ناگزیر ہیں۔ ہندوستان کی فیڈرل کانگرس صوبہ سرحدی میں ایک طاقتور سرحدی لشکر متعین کر سکتی ہے۔ جس میں ہر صوبے کے سپاہی شامل ہوں گے اور جن کی قیادت ہر ملت کے آزمودہ کار افسروں کے ہاتھ میں ہو گی۔ مجھے اس امر کا بخوبی احساس ہے کہ ہندوستان میں قابل فوجی افسر موجود نہیں۔ اور ایسی چیز ہے جس سے فائدہ اٹھا کر ارکان کمیشن یہ کہتے ہیں کہ افواج کا نظم ونسق دولت برطانیہ کے ہاتھوں میں ہونا چاہئے۔ لیکن میں اس کے متعلق انہی کی رپورٹ سے اقتباس پیش کروں گا۔ جس سے خود ان کا یہ اندازہ قابل اعتراض نظر آتا ہے:۔

"اس وقت کوئی ہندوستانی جسے ملک معظم کی طرف سے کمیشن ملا ہو کپتان سے اونچے عہدے پر فائز نہیں۔ ہندوستانی کپتانوں کی کل تعداد 39 ہے۔ جن میں سے 25 معمولی رجمنٹوں میں کام کرتے ہیں۔ ان میں سے بعض کی عمر اس قدر زیادہ ہے کہ اگر وہ ضروری امتحانات میں کامیاب بھی ہو جائیں جب بھی انہیں اس سے اونچا عہدہ حاصل نہیں ہو سکے گا۔ ان کا اکثر حصہ ہینڈ برسٹ نہیں کیا گیا۔ بلکہ انہیں جنگ عظیم میں کمیشن ملا تھا۔ اب یہ خواہش کہ صورت حالات میں تغیر پیدا ہو جائے۔ کس قدر سچی کیوں نہ ہو اور اس کے لئے کیسی بھی مخلصانہ کوشش کیوں نہ کی جائے۔ وہ شرائط جن کو اسکین کمیٹی نے (جس کے صدر اور فوجی سیکریٹری کے علاوہ تمام اراکین ہندوستانی تھے) نہایت موثر طریق پر لفظ "ترقی" میں جمع کر دیا ہے۔ اس امر پر منحصر ہیں کہ ہر مرحلے پر کامیابی حاصل ہو۔ اور جنگی قابلیت بدستور قائم رہے ظاہر ہے کہ اس سے ترقی کی رفتار ست رہے گی۔ موجودہ ہندوستانی افسر معمولی عہدوں پر کام کرتے ہیں۔ اور ان کا تجربہ محدود ہے۔ لٰہذا یہ ممکن نہیں کہ وہ ایک قلیل عرصے کے اندر اعلیٰ مراتب حاصل کر لیں۔ جب تک ہندوستانی امیدواروں کی قلیل جماعت میں اضافہ نہ ہو جائے۔ اور ہم اس اضافے کے دل سے خواہشمند ہیں۔ جب تک ہندوستانیوں کی ایک کافی تعداد اس قدر تجربہ اور مہارت حاصل نہ کر لے کہ جس سے سب نہیں تو کم از کم چھ رجمنٹوں کے تمام افسر ہندوستانی ہوں جب تک یہ رجمنٹیں عملاً" اس آزمائش میں کامیاب نہ ہوں جو ان کی قابلیت کا اندازہ کرنے کا ایک ہی ذریعہ ہے۔ جس وقت تک یہ ممکن نہ ہو گا کہ فوج کے نظم ونسق کو ہندوستانیوں کے ذمہ سپرد کر دیا جائے اور یہ عمل اس حد تک پہنچ جائے کہ ساری

فوج کلیتہ" ہندوستانی ہو جائے۔ اس حالت میں بھی اس کام کی تکمیل کے لئے ساٹھ سال کی ضرورت ہو گی۔"

اب میں یہ عرض کرنے کی جرات کروں گا کہ اس صورت حالات کا ذمہ دار کون ہے اس کی وجہ ہماری جنگجو قوموں کی کوئی فطری کمزوری ہے یا فوجی تعلیم کی ست رفتار؟ جنگجو قوموں کی حیثیت مسلمہ ہے البتہ یہ ممکن ہے کہ یہ نسبت تعلیم کے دوسرے شعبوں کے جنگی تعلیم کا عمل ست ہو میں عسکریات کا ماہر نہیں لیکن ایک عام آدمی کی حیثیت سے کہہ سکتا ہوں کہ اس دلیل کو جس انداز میں پیش کیا گیا ہے اس کا یہ مطلب ہے کہ یہ عمل ہمیشہ جاری رہے گا۔ گویا ہندوستان کی غلامی کبھی ختم نہیں ہو گی لہٰذا ضروری ہے کہ نہرو رپورٹ کی تجویز کے مطابق سرحدی افواج کا نظم و نسق ایک دفاعی کمیٹی کے ذمے کر دیا جائے اور اس کے ارکان کا فیصلہ باہمی تصفیے سے ہو۔

ایک عجیب بات یہ ہے۔ سائمن رپورٹ میں ہندوستان کی بری سرحدوں کو تو غیر معمولی اہمیت دی گئی ہے۔ لیکن اس کی بحری سرحدوں کے تحفظ کے متعلق سرسری اشارات کئے گئے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندوستان پر ہمیشہ خشکی کے راستے سے حملے ہوتے رہے ہیں۔ لیکن یہ امر بھی مسلم ہے کہ ہندوستان کے موجودہ حاکم اس کے غیر محفوظ سواحل کی وجہ سے اس پر قابض ہوئے تھے۔ ایک آزاد اور خود مختار ہندوستان کے لئے ازبس ضروری ہے۔ کہ وہ خشکی کی بجائے اپنی بحری سرحدوں کی زیادہ حفاظت کرے۔

مجھے یقین ہے کہ اگر فیڈرل ریاست قائم ہو گئی تو مسلم فیڈرل ریاستیں ہندوستان کے تحفظ کی خاطر ایک غیر جانبدار ہندوستانی فوج کے قیام کے لئے جو خشکی اور سمندر دونوں پر متعین ہو ہر قسم کی امداد دینے پر آمادہ ہو گیں۔ مغلوں کے زمانے میں اس قسم کے غیر جانبدارانہ عساکر واقعتاً" موجود تھے بلکہ اکبر کے زمانے میں تو ان تمام سرحدی فوج کے افسر ہندو ہی تھے۔ میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر فیڈرل نظام حکومت میں ایک غیر جانبدارانہ لشکر قائم ہوا تو اس سے مسلمانوں کے جذبات حب الوطنی اور زیادہ قوی ہو جائیں گے اور اس بدگمانی کا بھی ازالہ ہو جائے گا کہ اگر باہر سے کوئی حملہ ہوا تو مسلمانان ہندوستان اپنے ہم مذہبوں کے ساتھ مل جائیں گے۔

ایک متبادل تجویز

ہندوستان کے دو اہم آئینی مسئلوں کو میں نے جس طرح سمجھا ہے اسے مختصر آپ کے سامنے پیش کر دیا ہے تاکہ مسلمان اسے اس نقطہ نگاہ سے دیکھ سکیں۔ ہندوستان کے فرقہ وارانہ مسئلے کا مستقل حل اس طرح نکل سکتا ہے کہ برطانوی ہند کی دوبارہ تقسیم کی جائے اور یہی مسلمانوں کا سب سے بڑا مطالبہ ہے اگر فرقہ وارانہ مسئلے کے حل کے لئے علاقائی تقسیم کی تجویز کو نظرانداز کر دیا جائے تو میں پورے زور کے ساتھ مسلمانوں کے ان مطالبات کو دہراؤں گا جس پر آل انڈیا مسلم کانفرنس نے بار بار زور دیا ہے مسلمانان ہند دستور کی کسی ایسی تبدیلی پر راضی نہ ہوں گے جو ان کے اکثریتی حقوق پر اثر انداز ہوتی ہو یعنی پنجاب اور بنگال میں جداگانہ انتخابات کے ذریعے جن کا تحفظ کیا جائے یا پھر کسی مرکزی مقننہ میں ان کے 33 فیصد مطالبہ نیابت کو مجروح کرے مسلمانوں کے سیاسی لیڈروں نے اس سلسلے میں دو ٹھوکریں کھائیں۔ پہلا گڑھا جس میں گرے وہ مسترد شدہ میثاق لکھنؤ تھا جس کی بنیاد ہندوستانی قومیت کا غلط تصور تھا اور اس نے ہندوستان کے مسلمانوں کو کوئی بھی سیاسی اہمیت اختیار کرنے سے محروم کر دیا۔ دوسرا گڑھا جس میں وہ گرے تنگ نظری پر مبنی مسلم یک جہتی کا وہ تصور ہے جو بالکل غلط ہے اور کہا یہ جاتا ہے اس کا تعلق پنجاب کے دیہات کے مفاد کی خاطر ہے مگر اس نے جس تحریک کو جنم دیا وہ مسلمانان پنجاب کو عملاً" ایک اقلیت میں تبدیل کر دیتا ہے۔ لیگ کا یہ فرض ہے کہ وہ میثاق لکھنؤ کی مذمت کرے اور پنجاب کی اس تجویز کی بھی۔

پنجاب اور بنگال کے مسلمانوں کے لئے ایک آئینی اکثریت کی سفارش نہ کر کے سائمن رپورٹ نے بڑی سخت ناانصافی کی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یا تو مسلمان میثاق لکھنؤ کے پابند رہیں یا مخلوط انتخاب پر راضی ہو جائیں۔ سائمن رپورٹ پر حکومت ہند نے جو یادداشت روانہ کی ہے اس میں اعتراف کیا گیا ہے کہ رپورٹ نے جن دو متبادل تجویزوں کو پیش کیا ہے مسلمانوں نے ان میں سے کسی کو بھی منظور کرنے کا رجحان ظاہر نہیں کیا۔ یادداشت میں لکھا ہے کہ مسلمانوں کو یہ شکایت بجا ہے کہ بنگال و پنجاب میں ان کو اکثریت محض اس وجہ سے نہیں دی گئی کہ دوسرے صوبوں میں انہیں۔ پاسنگ۔ کا حق دے دیا گیا ہے۔ مگر حکومت ہند کی اس یادداشت سے بھی اس ناانصافی کی بھی تلافی نہیں ہوتی جو مسلمانوں کے ساتھ کی گئی ہے۔

جہاں تک پنجاب کا تعلق ہے یہ بڑا نازک نقطہ ہے حکومت ہند نے بھی اس پر صاد کیا ہے کہ اس نہایت غور و توجہ سے مرتب کردہ متوازن صوبے کو مان لیا جائے جس کی تیاری حکومت پنجاب کے سرکاری ارکان کے ہاتھوں عمل میں آئی تھی اور جس کے تحت مسلمانان پنجاب کو پوری اسمبلی میں صرف انچاس فیصدی نشستیں ملتی ہیں اور ہندوؤں سکھوں کی مشترکہ نشستوں میں انہیں صرف دو نشستوں کی اکثریت ملتی ہے یہ بات بالکل عیاں ہے کہ پنجاب کے مسلمان اس وقت تک مطمئن نہیں ہو سکتے جب تک انہیں اپنی مجلس قانون ساز میں کھلی ہوئی اکثریت حاصل ہو نہیں جاتی بہر طور لارڈ اربن نے اور ان کی حکومت کو اس بات سے اتفاق ہے کہ جب تک حق رائے دہی اس قدر وسیع نہ ہو جائے کہ ہر فرقے کا تناسب آبادی کھلے طور پر تعداد نمائندگان سے ظاہر ہو سکے اور جب تک میلمان کسی صوبائی اسمبلی میں اپنی 2/3 متفق علیہ آراء سے جداگانہ انتخاب سے دستبردار ہونے کو تیار نہ ہو۔ ہندوستان کی اقلیتیں اس کی مجاز ہوں گی کہ جداگانہ فرقہ وارانہ انتخاب کو حق بجانب سمجھیں۔ اب میری سمجھ میں نہیں آتا جب حکومت ہند مسلمانوں کی شکایت کو حق بجانب سمجھتی ہے تو اس میں اتنی جرات کیوں نہ ہو کہ وہ پنجاب و بنگال میں ان کی آئینی اکثریت کی سفارش کرتی۔ مسلمانان ہند کو کسی ایسی تجویز سے بھی اتفاق نہ ہو گا جس کے تحت سندھ کو ایک علیحدہ صوبہ نہ بنایا جائے اور شمال مغربی سرحدی صوبے کا سیاسی مرتبہ وہی پھر نہ ہو جائے جو ہندوستان کے دوسرے صوبوں کا ہے یعنی اس سے کم تر سیاسی درجے کا سلوک نہ کیا جائے مجھے اس کے خلاف کوئی دلیل دکھائی نہیں دیتی کہ سندھ کو بلوچستان میں شامل کر کے ایک علیحدہ صوبہ کیوں نہ بنا دیا جائے۔ احاطہ بمبئی میں کوئی چیز اس سے اشتراک نہیں رکھتی حیات و ثقافت کے باب میں شاید کمیشن کی بھی یہ رائے ہے کہ اس کی مشابہت ہندوستان سے اس قدر نہیں جس قدر عراق و عرب کے تمدنوں سے ہے۔ مسلمان جغرافیہ دان مسعودی نے آج سے بہت پہلے اس مشابہت کو دیکھ کر کہا تھا کہ سندھ وہ ملک ہے جو اسلامی مملکتوں سے قریب تر ہے۔ کہا جاتا ہے کہ پہلے اودی حکمرانوں نے مصر کی بابت کہا تھا کہ اس کی پشت افریقہ کی طرف ہے اور چہرہ عرب کی طرف چند ضروری تبدیلیوں کے ساتھ بالکل یہی بات سندھ کے محل وقوع کی بابت بھی کہی جا سکتی ہے۔ اس کی پشت سرزمین ہند کی طرف ہے تو چہرہ وسط ایشیا کی طرف۔ سندھ کے زرعی مسائل پر غور

کرتے ہوئے جن کے لئے حکومت بمبئی کے دل میں کوئی جذبہ ہمدردی پیدا نہیں ہو سکتا۔ اس کے لانہایت تجارتی امکانات کا خیال کرتے ہوئے کہ کراچی برابر ترقی کرے گا اور ایک دن سرزمین ہند کا دوسرا بڑا شہر بن جائیگا۔ صاف نظر آیا ہے کہ اس احاطہ بمبئی کے ساتھ منتھی رکھنا بالکل غیر دانشمندانہ ہے۔ گو اس وقت وہ کتنا ہی درست کیوں نہ نظر آئے مگر وہ دن دور نہیں کہ وہ اس کا حریف بن جائیگا۔ ہمیں بتایا جاتا ہے کہ اس علیحدگی کی راہ میں مالی مشکلات بہت ہیں مگر مجھے اس ضمن میں کسی بھی باضابطہ و مستند اعلان کا علم نہیں۔ لیکن خیر اگر ان مشکلات کے مفروضے کو مان لیا جائے تو کیا وجہ ہے کہ حکومت ہندوستان اپنے اس امید افزا صوبے کو آزاد ترقی کرنے میں عارضی مالی امداد نہ دے۔

جہاں تک شمال مغربی سرحدی صوبے کا تعلق ہے اراکین شاہی کمیشن نے یہاں کے لوگوں کو عملاً" اصلاح کے حق سے محروم کر دیا ہے ان کی سفارشات "برے کمیٹی" کی سفارشات سے بھی کم ہیں۔ انہوں نے جس کونسل کی سفارش کی ہے اسے تو بس چیف کمشنر کے مطلق انصافی کے لئے ایک آڑ سمجھیے۔ افغانوں کو انکے اس پیدائش حق سے محروم کر دیا گیا ہے کہ اپنی سگریٹ جلا سکیں۔ کیونکہ اتفاق سے وہ ایک بارود گھر میں بسے ہوئے ہیں۔ شاہی کمیشن کے اراکین نے جو تجویز پیش کی ہے لطف سے خالی نہیں۔ مگر دل کو نہیں لگتی۔ سیاسی اصلاحات روشنی ہوتی ہیں آگ نہیں اور ہر شخص تک روشنی پہنچانا فرض ہے۔ اس لئے ہر ایک کو روشنی حاصل کرنے کا بھی حق ہے۔ خواہ وہ اتفاقاً" بارود خانے میں رہتا ہو یا کوئلے کی کان میں۔ افغان بہادر ہیں' ذہین ہیں اور اپنے جائز حقوق حاصل کرنے کے لئے مصمم ارادہ کے حامل ہیں اس لئے وہ ان کی خاطر ہر قسم کی تکلیف اٹھانے کے لئے بھی تیار ہیں۔ وہ ایسی کوشش کی شدت سے مزاحمت کریں گے جو انہیں آزاد مکمل خود مختاری کے حق سے محروم کرتی ہو۔ اس قسم کے لوگوں کو ہر طرح مطمئن رکھنا انگلستان اور ہندوستان دونوں ہی کے مفاد میں ہے۔ اس بدنصیب صوبے میں پچھلے دنوں جو واقعات رونما ہوئے ہیں وہ فی الاصل نتیجہ ہیں اس سوتیلی ماں کے سے سلوک کا جو اس کے ساتھ کیا گیا یعنی باقی ہندوستان میں آئینی اصلاحات نافذ کرنے کے بعد یہاں کے لوگوں کے ساتھ جو کچھ کیا گیا ہے مجھے یہی امید رکھنی چاہیئے کہ انگریز مدبرین اپنی آنکھوں پر پردہ ڈال کر صحیح حالات سے نظریں چرا گئے۔ اور یہ

فرض کرنے کی غلطی نہ کریں گے کہ یہاں جو کچھ بے چینی ہوئی ہے وہ خارجی ذرائع کی پیدا کردہ تھی۔

حکومت ہند نے اپنی یادداشت کے لئے سرحدی صوبے میں جن اصلاحات کی سفارش کی ہے وہ ناکافی ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ سائمن رپورٹ سے یہ ذرا آگے ضرور ہیں کیونکہ تجویز ہوا ہے کہ یہاں ایک نمائندہ مجلس قائم کی جائے اور نیم نیابتی کابینہ بھی ہو۔ مگر اس نہایت اہم مسلم صوبے کے ساتھ ہندوستان کے دوسرے صوبوں کے برابر سلوک نہیں کیا گیا حالانکہ یہ واقعہ ہے کہ ہندوستان کے دوسرے لوگوں کی نسبت افغان جمہوری اداروں کے لئے زیادہ موزوں ہیں۔

گول میز کانفرنس

میرا خیال ہے کہ اب مجھے گول میز کانفرنس کے سلسلے میں کچھ اشارات کر دینے چائیں۔ میں اس کانفرنس کے نتائج کی بابت پر امید نہیں ہوں۔ توقع یہ تھی کہ فرقہ وارانہ تنازعات کی سرزمین سے دور ہونے کے باعث اور ایک مختلف فضا میں لوگ کچھ بہتر ہوش مندی سے کام لیں گے۔ اور دونوں بڑے فرقوں میں نااتفاقی دور ہو کر ہندوستان کی آزادی سامنے نظر آنے لگے گی۔ مگر حقیقت حال تو دوسری کہانی سناتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ لندن میں فرقہ وارانہ سوال پر جو بحث ہوئی اس نے ہمیں ہندوستان کی بنیادی اختلاف رائے ثقافت کو اور بھی عیاں کر کے دکھادیا مگر وزیر اعظم برطانیہ اس سے انکار ہی کرتے نظر آتے ہیں۔ کہ ہندوستان کا مسئلہ بین الاقوامی مسئلہ ہے، نہ قومی - مبینہ طور پر انہوں نے کہا ہے - انکی حکومت کے لئے پارلیمنٹ کے سامنے ایسی تجاویز رکھنا مشکل نظر آتا ہے جس میں جداگانہ انتخابات کو مانا گیا ہو۔ کیونکہ مخلوط انتخابات برطانوی جمہوری جذبات کے ساتھ زیادہ قریب و ہم آہنگ ہیں۔ مگر انہوں نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ ایسے ملک میں جہاں اتنی قومیں آباد ہوں۔ برطانوی طرز جمہوریت کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اور جداگانہ انتخابات تو مسئلے کے علاقائی فیصلے کا ایک نہایت معمولی سا مبدل ہیں۔ مجھے یہ امید بھی نہیں کہ اقلیتوں کی ذیلی کمیٹی بھی کسی قابل اطمینان نتیجے پر پہنچ سکے۔ اس لئے پورے مسئلے کو پارلیمان برطانیہ کے سامنے پیش ہونا چاہیے۔ اور مجھے یہ

امید رکھنی چاہئے کہ ہندوستان کے سیاست دانوں کی نسبت انگریز قوم کے زیرک نمائندے زیادہ وقت نظر سے کام لیتے ہوئے اس سطح کے نیچے تک دیکھیں گے جو یہاں پائی جاتی ہے۔ اور وہ محسوس کریں گے کہ ہندوستان جیسے ملک کے اندر امن وامان اور تحفظ کے لئے حقیقتی و اساسی اصول کیا ہونے چاہئیں۔ کسی دستور ملک کو اس بنیاد پر تیار کرنا کہ ہندوستان ایک ہموار و مربوط قوم کی سرزمین ہے' یا برطانوی احساسات سے پیدا ہونے والے اصولوں کو ہندوستان پر لاگو کیا جائے۔ تو میں سمجھتا ہوں یہ نادانستہ طور پر ملک کو خانہ جنگی کے لئے تیار کرنا ہے۔ جہاں تک میں اس بات کو دیکھ سکتا ہوں ملک میں کبھی امن وامان نہیں ہو سکتا۔ جب تک یہاں بسنے والوں کو آزاد خودمختاری حکومت کے مواقع نہیں دیئے جاتے۔ جو اپنے ماضی سے رشتے توڑے بغیر جدید خطوط پر استوار ہوں۔

مجھے یہ دیکھ کر مسرت ہوتی ہے کہ ہمارے مسلمان مندوبین نے یہ بات اچھی طرح محسوس کی ہے کہ میں جسے ہندوستان کا بین الاقوامی مسئلہ کہتا ہوں اس کا مناسب حل کن خطوط پر ہے۔ مرکزی حکومت کو ذمہ داریاں سونپنے کے سوال سے پہلے فرقہ وارانہ مسئلے کا حل ضروری ہے۔ اور جب وہ اس پر زور دیتے ہیں تو بالکل حق بجانب ہیں۔ پروپیگنڈے کی خاطر ایک لفظ "فرقہ وارانہ" گھڑا گیا ہے۔ کسی مسلمان اہل سیاست کو اس طعن آمیز لفظ سے قطعی متاثر نہیں ہونا چاہئے۔ یہ محض اس لئے گھڑا گیا ہے کہ ان جذبات سے کھیلا جائے۔ جسے برطانوی وزیر اعظم جمہوری احساسات کا لقب دیتے ہیں۔ یہ اس لئے بھی ہے کہ انگلستان کے لوگوں کو بہکا کر کسی ایسی صورت حال کے ماننے پر مجبور کیا جائے جو ہندوستان میں موجود ہی نہیں ہے۔ اس وقت بہت سے اہم مفادات خطرے میں ہیں۔ ہم مسلمان سات کروڑ ہیں اور ہندوستان کے دیگر باشندوں کے مقابلے پر کہیں زیادہ مربوط و مستحکم ہیں۔

"اگر ہندوستان کے کسی گروہ کو لفظ "قوم" کے جدید مفہوم سے صحیح طور پر تعبیر کیا جا سکتا ہے تو وہ صرف ہم مسلمان ہی ہیں۔ یوں ہندو ہر پہلو سے ہم سے آگے ہیں مگر ابھی تک ان میں وہ اتصالی رنگ پیدا نہیں ہوا جو کسی ملت کی بنا سکتا ہے۔ اور اسلام نے ہم مسلمانوں کو یہ نعمت از خود عطا کر رکھی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ ایک قوم بننے کے لئے سخت کوشاں ہیں۔ مگر قوموں کی ترکیب تو ایک نیا سفر حیات شروع کرنا ہے۔ اور جہاں تک ہندوؤں کا تعلق ہے ان

کے لئے یہ بڑا ضروری ہے کہ تمام نظام ہائے معاشرت کو یک قلم بدل دیں۔ اسی طرح مسلمان راہنماؤں کو اس نازک لبادے میں چھپی ہوئی مگر بالکل مغالطہ انگیز دلیل سے بھی متاثر نہیں ہونا چاہیے۔ کہ ترکی اور ایران اور دوسرے اسلامی اساسوں پر ترقی کر رہے ہیں۔ نہ کہ علاقائی بنیادوں پر۔ مگر ہندوستان کے مسلمانوں کا تو معاملہ ہی جدا ہے۔ ہندوستان کے باہر جو اسلامی ملک ہیں ان میں عملاً" صرف مسلمان ہی آباد ہیں اور وہاں جو اقلیتیں ہیں بھی تو انہیں قرآنی اصلاح میں "اہل کتاب" کہا جاتا ہے۔ مسلمانوں اور اہل کتاب میں کسی طرح کے معاشری حائلات نہیں ہوتے۔ کوئی یہودی یا عیسائی یا زرتشی کسی مسلمان کے کھانے کو چھولے تو وہ ناپاک نہیں ہو جاتا اور اسلامی شریعت "اہل کتاب" کے ساتھ باہمی سلسلہ مناکحت کی بھی اجازت دیتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام نے نوع بشر کو متحد کرنے کے لئے یہی پہلا قدم اٹھایا۔ اور جن کا اخلاقی سطح نظر یکساں تھا انہیں دعوت دی کہ وہ باہم آکر مل جائیں۔ قرآن پاک میں ارشاد ہے اهل الكتاب تعالو علی کلمته (یعنی توحید) صواء بیناو بینکم۔ یہ الگ بات ہے کہ مسلمان اور عیسائی اقوام باہم لڑتی رہیں اور پھر مغرب کی جارحیت نے دنیائے اسلام میں اس آیت کے لانہایت معانی کو از خود برومند ہونے کا موقع دیا۔ مگر اس وقت اس آیت کا مقصود آہستہ آہستہ بلاد اسلام میں اس شکل میں نمودار ضرور ہو رہا ہے جسے "مسلم قومیت" کہا جاتا ہے۔

مجھے یہ کہنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ ہمارے مندوبین کی کامیابی کا واحد اندازہ اس بات سے لگایا جا سکے گا کہ وہ کانفرنس کے غیر مسلم مندوبین میں سے کتنوں کو "قرارداد دہلی" کے مطالبات پر متفق کر سکتے ہیں۔ اگر ان مطالبات کو تسلیم نہیں کیا گیا تو ہمارے لئے بہت دور رس اہمیت کا حامل ایک سوال پیدا ہو جائے گا۔ اس حالت میں وہ لمحہ آجائے گا جب مسلمانان ہند ایک آزاد متفق علیہ سیاسی عمل کے لئے تیار ہو جائیں گے۔ اگر آپ اپنے سیاسی مطمح نظر اور امنگوں کے بارے میں واقعی سنجیدہ ہیں تو اس عمل کے لئے تیار رہنا چاہیے۔ ہمارے سربر آوردہ لوگوں نے یقیناً کافی سیاسی غور و خوض سے کام لیا ہے اور ان کے تصورات نے ہی ہمیں اس بات سے باخبر کیا ہے کہ اندرون ہند اور باہر کے لوگوں کی آئندہ قسمتوں کا کیا فیصلہ کیا جائے گا۔ لیکن میں یہ سوال کرتا ہوں کہ مستقبل قریب میں جو صورت حال ہمیں پیش آنے والی ہے

کیا اس غور و خوض نے اس کی بھی رہنمائی کی ہے کہ عمل کریں۔ تاکہ اس صورت حال سے نپٹا جا سکے۔ مجھے بلا تکلف یہ کہنے دیجئے کہ مسلمان اس وقت دو عوارض کا شکار ہیں پہلی عارضہ تو یہ ہے کہ ان کے ہاں شخصیتوں کا قحط ہے سر میکلم ہیلی اور لارڈ ارون نے جب یہ کہا کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بڑے قائد پیدا نہیں کر سکی۔ تو وہ بالکل صحیح تشخص تھی۔ قائدین سے میری مراد ایسی ہستیوں سے ہے جن کو فیضان ربی حاصل ہو یا اپنے وسیع تجربات کی بدولت ایک طرف تو یہ بصیرت حاص ہو کہ اسلامی تعلیمات کی روح و تقدیر کو جان لیں۔ اور دوسری طرف ان میں یہ صلاحیت بھی موجود ہو کہ تاریخ حاضرہ کے رجحانات کو اپنے تیز ادارک کے ذریعے سمجھ لیں۔ ایسی ہی ہستیاں کسی قوم کے لئے حرکی قوت ثابت ہو سکتی ہیں۔ مگر یہ عطیہ الٰہی ہوتے ہیں اور آرڈر پر تشکیل نہیں کئے جا سکتے۔ دوسرا عارضہ جس سے مسلمان دو چار ہیں وہ یہ ہے کہ ان میں وہ مادہ نہیں رہا جسے "گروہی جبلت" کہتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہم تتر بتر ہی ہیں۔ متعدد افراد جماعتیں اپنی اپنی راہوں کی طرف منہ اٹھائے ہوئے چلی جاری ہیں اور لوگ پورے گروہ اور ملت کے اجتماعی فائدے کے لئے ذہن و عمل کی صلاحیتوں کو کام میں نہیں لاتے ہم سیاست کے میدان میں بھی آج وہی کر رہے ہیں جو صدیوں سے دین کے معاملے میں کرتے رہے ہیں۔ لیکن مذہبی فرقوں کی تو تو' میں میں ہماری قومی یکجہتی کو اتنا نقصان نہیں پہنچاتی ان سے اور کچھ نہیں تو یہ تو ظاہر ہوتا ہے کہ ہمیں اپنی قوم کی ترکیت و ساخت کے اصول سے کتنا لگاؤ ہے علاوہ ازیں یہ اصول اس قدر وسیع تصویر پر محیط ہیں۔ اور کسی فرقے کے لئے یہ ناممکن ہے کہ وہ بغاوت کر کے پوری ملت اسلامیہ سے ہی نکل جائے اسکے برعکس سیاسی زندگی میں اختلاف و پراگندگی اور وہ بھی اس نازک مرحلے پر جب کہ بہترین مفاد ملت کے لئے اتحاد اور ارتکاز عمل انتہائی ضروری ہے مسلمانوں کے حیات ملی کے لئے بالکل مہلک ثابت ہو گی۔ تو اب سوال یہ ہے کہ ان دو عوارض کا علاج کیا ہے۔ پہلے عارضے کا علاج تو ہمارے ہاتھ میں نہیں البتہ دوسرے عارضے کے لئے علاج دریافت بالکل ممکن ہے۔ اس ضمن میں نئے نئے خاص رائے قائم کر کے لیکن میرا خیال ہے کہ جب تک وہ مخدوش حالات حقیقتاً" رونما نہ ہو جائیں اس وقت ان کا اظہار ملتوی کر دینا بہتر ہے۔ اگر ایسا خطرہ پیدا ہو گیا تو پھر تمام حلقہ ہائے فکر کے مسلمانوں کو ایک جگہ سر جوڑ کر بیٹھنا ہو گا' قرار دادیں پاس کرنے کے

لئے نہیں بلکہ یہ طے کرنے کے لئے کہ اب مسلمان کیا مسلک اختیار کریں گے اور اسے حاصل کرنے کے لئے کیا روش طے ہو گی۔ میں نے اس خطبے میں اس مابدل بات کا ذکر صرف اس لئے کیا ہے کہ آپ لوگ اس کو ذہن میں رکھیں اور اس دوران میں اس پر کچھ سنجیدگی کے ساتھ غور بھی کرتے رہے ہیں۔

خاتمہ سخن

حضرات میں جو کچھ کہنا چاہتا تھا وہ عرض کر دیا۔ آخر میں یہ پھر کہتا ہوں کہ مسلمانان ہند کی زندگی میں اس سے زیادہ نازک وقت نہیں آئے گا۔ اس لئے ہماری کامل تنظیم اور اتحاد' مقصد و عزم کی ضرورت عیاں ہے۔ اس میں آپ کا بھی مفاد ہے اور ملت اسلامیہ کا بھی بلکہ پوری ہندوستان کی بھلائی اسی میں ہے۔ ہندوستان کی غلامی پورے ایشیاء کی لاانتہا مسائل کے بھی باعث بنی ہوئی ہے۔ اس نے مشرق کی روح کو بالکل دبا دیا ہے اور جس اظہار ذات نے کسی وقت ایک عظیم و شاندار ثقافت کو جنم دیا تھا وہ مسرت ہم سے چھین لی گئی ہے۔ ایک فرض تو وہ ہے جو ہندوستان کی طرف سے ہم پر عائد ہوتا ہے وہ جگہ جہاں ہمیں جینا بھی ہے اور مرنا بھی اور دوسرا فرض وہ ہے جو ایشیاء کی جانب سے عائد ہوتا ہے۔ بالک اسلامی ایشیاء کی طرف سے۔ کیونکہ ایشیاء کے دوسرے اسلامی ملکوں کے مقابلے پر صرف اکیلے ہندوستان میں سات کروڑ مسلمان ہیں جو ان سب کی مسلمان آبادی سے زیادہ ہیں۔ اس لئے وہ اسلام کے لئے کہیں زیادہ بیش بہا سرمایا ہیں۔ لہٰذا ہمیں چاہئے کہ مسئلہ ہند کو صرف مسلمانوں کے نقطہ نظر سے ہی نہیں دیکھیں بلکہ ہندوستانی مسلمانوں کے اپنے وجود کے باعث بھی دیکھیں۔ جب تک ہم کسی معین و مخصوص مقصد پر مجتمانہ ہو جائیں اس وقت نہ ہم ایشیاء کا فرض پوری طرح ادا کر سکیں گے' نہ ہندوستان کا۔ دوسری ہندوستانی ملتوں کے ساتھ اگر آپ کو اپنا وجود بھی قائم رکھنا ہے تو آپ کے لئے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہے۔ ہماری حالت بڑی پراگندہ ہے اور اس نے ہماری قومی' سیاسی زندگی کے مسائل کو بہت الجھا رکھا ہے۔ میں سب ملتوں کے درمیان مفاہمت پیدا ہو جانے کی طرف سے مایوس تو نہیں ہوں مگر میں اس احساس کو بھی چھپا کر رکھنا نہیں چاہتا کہ میری قوم کو مستقبل قریب میں ایسے جادہ و عمل پر گامزن ہونے کی

ضرورت لاحق ہے۔ جس کے ذریعے وہ موجودہ بحران سے نپٹ سکے۔ کسی بحران کا مقابلہ کرنے کے کسی ملت کو قدم بڑھانے کے لئے اسی وقت تیار کیا جاسکتا ہے جب کہ لوگوں میں عزم راسخ پیدا ہو چکا ہو اور وہ اپنی ساری سوچ و عمل کو ایک مقصد واحد پر مرکز کردیں۔ کیا آپ نے بھی وہ عزم و ارادہ' وہ مشترک لگن پیدا ہو سکتی ہے جو لامیاتی صفت رکھتی ہو؟ کیوں نہیں اپنے اپنے گروپوں کے مفادات سے بلند ہو جائیں اپنے ذاتی مقاصد و عزائم کو چھوڑ دیں اور اپنے انفرادی اور اجتماعی ارادوں کو خواہ وہ مادی نوعیت کے نہ ہوں اس مجموعی نسب العین کی روشنی میں دیکھئے جو آپ سے منسوب کیا جاتا ہے۔ پھر مادیات سے گذر کر روحانیت کی طرف آجائیں' مادہ مختلف الاشکال ہوتا ہے اور روح نور ہے اور دائرہ حیات کا منبہ بھی ہے۔ مسلمانوں کی تاریخ سے میں نے ایک ہی سبق سیکھا ہے وہ یہ ہے کہ اسلام ہی تھا جس نے آڑے وقت میں مسلمانوں کو بچایا نہ کہ اس برعکس۔ اگر آپ آج بھی اپنے تصور کو اسلام پر مرکوز کردیں اور اس سے زندگی کی امنگ حاصل کریں تو آپ کی پراگندہ و منتشر قوتیں از سرنو حیات پا سکتی ہیں اور انشا سے جو کامل ہلاکت ہے' بچ کر آپ ایک عظیم و فال قوت بن سکتے ہیں۔ قرآن کریم کی ایک نہایت بلند آیت ہے جو ہمیں سمجھاتی ہے کہ پورے بنی نوع انسان کی حیات اور حیات نوع ایسی ہی ہے جیسی ایک فرد واحد کی حیات و حیات نوع' تو کیا یہ ممکن نہیں کہ آپ من حیث القوم خود اپنے وجود سے یہ ثابت کردیں کہ ہم اس عرفع تصور کا جیتا جاگتا پہلا عملی نمونہ ہیں۔ ایک نفس واحد کی طرح زندہ رہو' آگے بڑھو اور اس آیت کریمہ کے مصداق کے عظیم بن جاؤ۔ میں جب یہ کہتا ہوں کہ ہندوستان کے احوال وہ نہیں ہیں جو نظریہ نظر دکھائی دیتے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں لوگوں کو کسی حیرانی میں گم کردینا چاہتا ہوں مگر اس بات کے صحیح معنی آپ کے ذہنوں پر جب ہی طلوع ہوں کے جب آپ حقیقتاً اپنے اپنے ایک اجتماعی انا پیدا کرلیں۔ قرآن کے الفاظ میں:

علیکم انفسکم لا یضر کی من ضل اذا اهتدایتم

تمت بالخیر

1932ء میں مسلم کانفرنس سے خطاب

"پوری قوم کی ذہنیت میں سر سے پاؤں تک تنقیہ کرنے کی ضرورت ہے تاکہ وہ نئی

آرزوؤں اور تازہ مقاصد کا احساس کرنے کے قابل ہو۔ ہندوستان کا مسلمان مدت اپنے قلب کی گہرائیاں ٹٹولنے سے رک گیا اس لئے زندگی کی پوری آب و تاب میں رہ کر جینا چھوڑ چکا ہے۔ خوف یہ ہے کہ وہ ان قوتوں سے دب کر مصالحت کرے گا۔ جن کی نسبت اسے سمجھایا جارہا ہے کہ وہ انہیں اعلانیہ لڑ کر مغلوب نہیں کرسکتا۔ بے شبہ ناسازگار زمانے کو بدلنا چاہئے تو پہلے اسے اپنے اندرونی حال کو پوری طرح بدلنا ضروری ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتا جب تک کہ وہ کسی معین مقصد کی راہ سعی کی تازگی سے خود اپنی حالت بدلنے کا اقدام نہیں کرتی۔ کوئی مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔ گذشتہ تجربے نے آپ کو جو سبق دیا ہے اسے اچھی طرح خاطر نشین رکھنا چاہئے، کسی طرف مطلق کوئی امید نہ رکھئے اگر آپ چاہتے ہیں تو آپ کی آرزو بر آئے تو اپنے نفس کی ساری کوشش صرف اپنی ذات پر جمع کیجئے اور اپنی مٹی کو پکا کر کے واقعی مرد محکم بنائیے۔"

قرارداد پاکستان' 23 مارچ 1940ء

1- آئینی مسئلے پر آل انڈیا مسلم لیگ کونسل اور مجلس عاملہ کے اس اقدام کی توثیق کرتے ہوئے جو ان کی قرارداد مورخہ 27 اگست' مورخہ 17-18 ستمبر اور 22 اکتوبر 1939 اور 3 فروری 1940ء سے واضح ہوتا ہے آل انڈیا مسلم لیگ کا یہ اجلاس پر زور طور پر اس بات کا اعادہ کرتا ہے کہ وہ وفاقی منصوبہ جو گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935ء میں مندرج ہے اس ملک کے خصوصی حالات کی بنا پر قطعاً ناقابل عمل اور ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے ناقابل قبول ہے۔

2- نیز یہ اجلاس اس حتمی رائے کو ضبط تحریر میں لاتا ہے کہ اگرچہ ہر مجسٹی کی حکومت کی جانب سے وائسرائے ہند کا اعلان مورخہ 18 اکتوبر 1939ء اس حد تک اطمینان بخش ہے کہ اس پالیسی اور منصوبے پر نظر ثانی کی جائے کہ جس پر 1935ء کا گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ مبنی ہے۔ اور اس مسئلے میں ہندوستان کی مختلف جماعتوں اور فرقہ جات سے مشورہ کیا جائے گا۔ تاہم ہندوستان کے مسلمان اس وقت تک مطمئن نہ ہوں گے جب تک کہ پورے آئینی منصوبے پر نئے سرے سے مکرر غور نہ کیا جائے۔ نیز یہ کہ کوئی متبادل منصوبہ مسلمانوں کے لئے قابل قبول نہ ہوگا جب تک کہ وہ ان کی توثیق اور رضامندی سے تشکیل نہ دیا جائے۔

3- ہرگاہ آل انڈیا مسلم لیگ کے اس اجلاس کا یہ جانچا ہوا فیصلہ ہے کہ اس ملک میں ہر آئینی تجویز اس وقت تک ناقابل عمل اور مسلمانوں کے لئے ناقابل قبول ہوگی جب تک کہ اس کی تشکیل مندرجہ ذیل بنیادی اصولوں پر نہ ہو:

الف۔ جغرافیائی طور پر ملحق علاقائی ترمیمات کے ساتھ اس طرح تشکیل دیا جائے کہ جن رقبوں میں مسلمان عددی طور پر اکثریت میں ہیں۔ جیسے کہ ہندوستان کے شمال مغربی اور مشرقی علاقوں میں ان رقبوں کو ملا کر آزاد ریاستیں بنا دی جائیں۔ جن میں مشمولہ وحدتیں خود مختار اور مطلقاً آزاد ہوں۔

ب۔ اور یہ کہ آئین میں ان وحدتوں اور علاقوں کی اقلیتوں کے لئے ان کے مشورے سے ان کے مذہبی' تمدنی' اقتصادی' سیاسی' انتظامی اور دیگر حقوق اور مفادات کے موثر آئینی تحفظ کا صراحت کے ساتھ معقول انتظام کیا جائے۔ اور ہندوستان کے دوسرے حصوں میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں ان کے اور دیگر اقلیتوں کے لئے ان کے مشورے سے ان کے مذہبی' تمدنی' اقتصادی' سیاسی' انتظامی اور دیگر حقوق اور مفادات کے تحفظ کا صراحت کے ساتھ موثر آئینی انتظام کیا جائے۔

ج۔ اور یہ کہ اجلاس ہذا مجلس عاملہ کو اختیار دیتا ہے کہ مندرجہ بالا اصولوں کے مطابق ایسا آئینی منصوبہ تجویز کرے جس کی رو سے ہر خطے کو بالاخر کلی اختیارات مثلاً" دفاع' امور خارجہ' رسل و رسائل' محاصل' اور دیگر ضروری اختیارات حاصل ہو جائیں۔

قرارداد کو پاس کرنے والے حضرات:

1 چوہدری خلیق الزمان صاحب (یوپی)
2 مولانا ظفر علی خان (مرکزی ایم ایل اے)
3 سردار اورنگ زیب خان صاحب (سرحد)
4 حاجی سر عبداللہ ہارون صاحب (مرکزی ایم ایل اے)
5 کے بی نواب اسماعیل خان صاحب (بہار)
6 قاضی محمد عیسیٰ خان صاحب (بلوچستان)
7 عبدالحمید خان صاحب (مدراس)
8 آئی آئی چندریگر صاحب (بمبئی)

9	سید عبد الرؤف شاہ صاحب	(سی پی)
10	ڈاکٹر محمد عالم صاحب	(پنجاب)
11	سید ذاکر علی صاحب	(یوپی)
12	بیگم مولانا محمد علی جوہر صاحب	
13	مولانا عبد الحمید صاحب قادری	(یوپی)

حکومت برطانیہ کا فیصلہ (3 جون 1947)

20 فروری 1947ء کو ملک معظم کی حکومت نے اس ارادے کا اعلان کیا کہ وہ برطانوی ہند میں جون 1948ء تک حکومت کا نظم و نسق اہل ہند کے ہاتھوں میں منتقل کردے گی۔ ملک معظم کی حکومت کو یہ امید تھی کہ 16 مئی 1940ء کے کابینہ وفد کے منصوبے پر عمل کرنے کے لئے ملک کی بڑی بڑی سیاسی پارٹیاں آمادہ ہو جائیں گی اور ہندوستان کے لئے ایک ایسا آئین مملکت تیار ہو سکے گا جس پر جملہ فریقین کا اتفاق ہو گا اور وہ اسے بطیب خاطر قبول کریں گے مگر یہ امید پوری نہیں ہوئی۔

2- مدراس، بمبئی، یو پی، سی پی و برار آسام، اڑیسہ اور شمال مغربی سرحدی صوبے کے نمائندوں کی اکثریت نے نیز دہلی، اجمیر، مارواڑ اور کرگ کے نمائندوں نے ایک نیا آئین مرتب کرنے کے کام کو آگے بڑھایا۔ مگر دوسری طرف مسلم لیگ نے جس میں بنگال، پنجاب اور سندھ کے نمائندوں کی اکثریت ہے اور برطانوی بلوچستان کے نمائندے بھی شامل ہیں۔ یہ فیصلہ کیا کہ مجلس آئین ساز میں شرکت نہ کی جائے۔

3- ملک معظم کی حکومت کی ہمیشہ یہ خواہش رہی ہے کہ نظم و نسق اور اختیارات کی تفویض خود اہل ہند کی مرضی کے مطابق ہو۔ اگر ہندوستان کی سیاسی پارٹیوں کے درمیان باہمی اتفاق رائے ہو تا تو یہ امر بہت سہل ہو جاتا۔

مگر ایسے کسی تصفیے کی عدم موجودگی میں اب یہ کام ملک معظم کی حکومت کو خود کرنا پڑ رہا ہے یعنی اس پر یہ فرض عائد ہو جاتا ہے کہ وہ کوئی ایسا طریقہ وضع کرے۔ جس سے ہندوستان کے عوام کی رائے عامہ معلوم ہو سکے۔ ہندوستان کے لیڈروں سے اچھی طرح صلاح مشورہ

کرنے کے بعد ملک معظم کی حکومت نے اس فرض کے لئے جو منصوبہ منظور کیا ہے۔ اسے یہاں بیان کیا جاتا ہے ملک معظم کی حکومت یہ بات واضح کر دینا چاہتی ہے کہ اس کا یہ ارادہ قطعی نہیں ہے کہ ہندوستان کے لئے دستور بنانے کا کام وہ خود سنبھال لے۔ اصل میں یہ کام تو خود اہل ہند کا ہے اور اسی غرض سے منصوبہ ہذا میں ایسی بات نہیں رکھی گئی جو کہ مختلف فرقوں کو ایک متحدہ ہندوستان کے لیے باہم مفاہمت و گفت و شنید سے باز رکھ سکے۔

4- ملک معظم کی حکومت کا یہ بھی ارادہ نہیں ہے کہ موجودہ آئین ساز اسمبلی کے کام کو بیچ میں روک دے۔ اب جب کہ بعض صوبوں کے لئے جن کے نام ذیل میں دیئے گئے ہیں' آئینی بندوبست کر دیا گیا ہے اس لئے ملک معظم کی حکومت کو یقین ہے کہ اس اعلان کے لئے مسلم لیگ کے ارکان (جو ان صوبوں کے نمائندے ہیں اور جن کی اکثریت پہلے ہی اس کام میں حصہ لے رہی ہے) دستور سازی کی ان کوششوں میں شرکت کریں گے۔ ساتھ یہ بھی ہے کہ اس اسمبلی نے اگر کوئی دستور اساسی تیار کیا تو اس کا ملک کے ان حصوں پر اطلاق نہ ہو گا جو اس کو ماننے کے لئے تیار نہ ہوں۔ ملک معظم کی حکومت کو اس بات کا اطمینان ہے کہ اس نے ایسے صوبوں کی رائے معلوم کرنے کے لئے یہاں جو طریقہ تجویز کیا ہے' وہ بہترین عملی طریقہ ہے جو اختیار کیا جا سکتا ہے رائے عامہ جن امور پر معلوم کی جائے گی وہ یہ ہیں۔

الف۔ کیا دستور اساسی موجودہ اسمبلی میں بنانا چاہیے؟

ب۔ یا اس غرض کے لئے ایک نئی اور جدا دستور ساز اسمبلی بنائی جائے۔ جس میں ایسے اراکین شامل کئے جائیں جو ان صوبوں سے آئے ہیں۔ جو موجودہ اسمبلی میں شریک ہونے پر رضامند نہیں ہیں؟

اور جب یہ مرحلہ طے ہو جائے گا تو اس امر کا فیصلہ ہو گا کہ کس بااختیار جماعت یا جماعتوں کو حکومت منتقل کی جائے۔

بنگال اور پنجاب

5- بنگال اور پنجاب کی صوبائی اسمبلیوں میں سے ہر ایک سے کہا جائیگا کہ (اپنے یورپین ارکان کو چھوڑتے ہوئے) وہ دو حصوں میں مجتمع ہوں۔ ایک حصہ میں صوبے کے مسلم اکثریتی

اضلاع کے نمائندے ہوں گے اور دوسرے حصہ میں صوبے کے بقیہ (غیر مسلم اکثریتی علاقوں کے) نمائندے ہوں گے۔ اضلاع کی آبادی کا تعین کرنے کے لئے 1941ء کی مردم شماری کے اعداد کو مستند سمجھا جائے گا۔ اس اعلان کے آخر میں جو ضمیمہ دیا گیا ہے اس سے مسلمان اکثریتی اضلاع کی فہرست معلوم ہو سکتی ہے۔

6- صوبائی اسمبلیوں کے ہر دو حصے کے اراکین جو علیحدہ مجتمع ہوں گے اس بات کے مجاز ہوں گے کہ صوبے کو تقسیم کرنے یا نہ کرنے کے متعلق اپنی رائے کے اظہار میں ووٹ ڈالیں اگر دو حصوں میں سے کسی ایک حصے کی واضح اکثریت نے تقسیم کا فیصلہ کیا تو یہ تقسیم عمل میں آجائے گی اور اس کے مطابق انتظامات کر دیئے جائیں گے۔

7- اس سے پہلے کہ تقسیم کے مسئلے کا فیصلہ کیا جائے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسمبلی کے ہر حصے کے نمائندوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ اگر اسمبلی کے دونوں حصوں نے صوبے کو متحد رکھنے کا فیصلہ کیا تو ایسی صورت میں صوبہ بحیثیت مجموعی اس دستور ساز اسمبلی میں شریک ہونا پسند کرے گا لہٰذا اگر دونوں اسمبلیوں میں سے کسی اسمبلی کے رکن نے اس قسم کا مطالبہ کیا تو (یورپین اراکین اسمبلی کو چھوڑ کر) بقیہ تمام اراکین اسمبلی کا اجلاس طلب ہو گا۔ جس میں اس معاملے کا فیصلہ کیا جائے گا اگر مذکورہ اسمبلی کے دونوں حصوں نے صوبے کو متحد رکھنے کا فیصلہ کیا تو اس صورت میں صوبہ بحیثیت مجموعی اس دستور ساز اسمبلی میں شریک ہو گا۔

8- اگر تقسیم کا فیصلہ ہو گا تو قانون ساز اسمبلی ان اضلاع کی طرف سے جن کی نمائندگی اس میں ہو، تقسیم کی بابت یہ بھی فیصلہ کرے گی کہ پیرا نمبر چار میں جو متبادل تجویزیں رکھی گئی ہیں ان میں سے کسی تجویز کا انتخاب ہو گا۔

9- فوری فیصلے کی خاطر پنجاب اور بنگال کی اسمبلیوں کے ہر دو حصص کے اراکین دو حصوں میں مجتمع ہوں گے یعنی مسلم اکثریتی اضلاع کی نمائندگی کے مطابق اور غیر مسلم اراکین اپنے اکثریتی اضلاع کی نمائندگی کے مطابق (جیسے کہ ضمیمے میں معین کیا گیا ہے) یہ ایک ابتدائی اور بالکل عارضی اقدام ہے۔ کیونکہ صوبوں کی آخری تقسیم کا فیصلہ کرنے کے لئے اضلاع کی حد بندیوں کی چھان بین کی ضرورت ہے اور جونہی کسی صوبے کی تقسیم کا فیصلہ کیا گیا ایک "کمیشن حد بندی" مقرر کیا جائے گا جس کا تقرر گورنر جنرل کرے گا۔ تمام متعلقہ عناصر سے باہمی صلاح

مشورہ کرکے یہ طے کیا جائے گا کہ اس کمیشن کے اراکین کون ہوں۔ اور اس کمیشن کا دائرہ اختیار کیا ہوگا۔ پنجاب میں اس کمیشن کو یہ کام سپرد کیا جائے گا کہ پنجاب کے دو حصوں کی حد بندی مسلم اور غیر مسلم اکثریت علاقوں کی بنیاد پر کرے اس کمیشن کو یہ رعایت دی جائے گی کہ دوسرے عناصر کو بھی زیر غور رکھے۔ اس طرح بنگال کے حد بندی کمیشن کو ہدایت دی جائے گی کہ جب تک اس حد بندی کمیشن کی رپورٹ پر عمل شروع نہ ہو جائے ضمیمہ میں جو عارضی فہرست اضلاع دی گئی ہے اسے ہی استعمال کیا جائے۔

سندھ

10- سندھ کی مجلس قانون ساز کے اراکین (یورپین اراکین کو چھوڑ کر) ایک خاص اجلاس میں مجتمع ہو کر اوپر کے پیرا نمبر4 کے مطابق دی ہوئی مابدل تجاویز کی بابت اپنا فیصلہ کریں گے۔

شمال مغربی سرحدی صوبہ

11- شمال مغربی سرحدی صوبے کا معاملہ استثنائی ہے اس صوبے کے تین نمائندوں میں سے دو اراکین پہلے ہی موجودہ مجلس آئین ساز کے کام میں حصہ لے رہے ہیں۔ اس کے جغرافیائی محل وقوع اور دوسری باتوں کے پیش نظر ایسی حالت میں کہ پنجاب میں کاملاً" یا جزواً" مجلس آئین ساز میں شریک نہ ہونے کا فیصلہ کیا تو شمال مغربی سرحدی صوبے کو یہ موقع دیا جائے کہ وہ صورت حال پر مکرر غور کرے۔ لہٰذا شمال مغربی سرحدی صوبے کے اراکین کے رائے دہندگان سے یہ استصواب عامہ کیا جائے گا کہ اوپر کے پیرا نمبر4 کی مابدل تجاویز میں سے وہ کس کے حق میں رائے دیتے ہیں۔ یہ استصواب رائے گورنر جنرل صوبائی حکومت کے مشورے سے اپنی نگرانی میں کرائیں گے۔

برطانوی بلوچستان

12- برطانوی بلوچستان نے ایک رکن کا انتخاب تو کرلیا ہے مگر اس نے موجودہ آئین ساز اسمبلی میں اپنی نشست نہیں سنبھالی ہے اپنے جغرافیائی محل وقوع کے باعث اس صوبے کو یہ موقع دیا جائے گا کہ اپنی صورت حال پر غور کرے اور اوپر کے پیرا نمبر4 میں مابدل تجاویز دی گئی

ان میں سے کسی ایک کا انتخاب کریں۔ گورنر جنرل اس بات کی چھان بین کر رہے ہیں کہ اس بات پر موزونیت کے ساتھ کس طرح عمل کیا جائے۔

آسام

13- اگرچہ آسام کی غالب آبادی غیر مسلم ہے مگر ضلع سلہٹ کی آبادی کی اکثریت مسلمان ہے اور یہ علاقہ بنگال سے متصل ہے۔ یہ مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ بنگال کی تقسیم ہو جانے کی حالت میں اسے مسلم بنگال کے ساتھ ضم کر دینا چاہئے' لہٰذا فیصلہ کیا گیا ہے کہ بنگال کی تقسیم ہو جانے کی حالت میں ضلع سلہٹ میں گورنر جنرل کی نگرانی اور صوبائی حکومت آسام کے مشورے سے استصواب رائے کرایا جائے گا۔ کہ آیا یہ ضلع صوبہ آسام کا ہی حصہ رہے یا مشرقی بنگال کے نئے صوبے کے ساتھ اس کا الحاق کر دیا جائے۔ بشرطیکہ وہ صوبہ اس کے لئے تیار ہو۔ اگر استصواب رائے کا فیصلہ یہ ہوا کہ اسے مشرقی بنگال کے ساتھ ملحق کر دیا جائے تو پنجاب اور بنگال کی طرح یہاں بھی ایک حد بندی کمیشن مقرر کیا جائے اور اس کی شرائط و ضوابط کار بھی وہی ہوں گے۔ یہ کمیشن فیصلہ کرے گا کہ سلہٹ کے غالب مسلم آبادی کے علاقے کون سے ہیں اور نزدیکی اضلاع کے مسلم اکثریتی حصے کون سے ہیں انہیں بعد میں مشرقی بنگال کے ساتھ ملحق کر دیا جائے گا۔ صوبہ آسام کا بقیہ حصہ ہر طور موجودہ آئین ساز اسمبلی کے کام میں اپنی شرکت جاری رکھے گا۔

آئین ساز اسمبلی میں نمائندگی

14- اگر پنجاب اور بنگال نے یہ فیصلہ کیا کہ انہیں تقسیم کر دیا جائے تو کابینہ مشن کے منصوبے مورخہ 16 فروری 1940ء کے اصول کے مطابق یہاں یہ ضروری ہو جائے گا کہ نئے نمائندے ہر دس لاکھ آبادی پر ایک رکن کے تناسب سے منتخب کئے جائیں گے۔ اگر ضلع سلہٹ نے مشرقی بنگال کے ساتھ الحاق منظور کر لیا تو ایسا ہی الیکشن سلہٹ میں کرانا ضروری ہو گا۔ ہر علاقے کو کتنے نمائندے بھیجنے کا حق ہے اس کا حساب حسب ذیل فہرست کے مطابق ہو گا۔

صوبہ	عام نشستیں	مسلم	سکھ	میزان
ضلع سلہٹ	1	2	0	3
مغربی بنگال	15	4	0	19
مشرقی بنگال	12	29	0	41
مغربی پنجاب	3	12	2	17
مشرقی پنجاب	6	4	2	12

15- ہدایت مذکورہ کے مطابق جملہ علاقوں کے مختلف نمائندے یا تو موجودہ آئین ساز اسمبلی میں شریک ہوں گے یا نئی آئین ساز اسمبلی مرتب کریں گے۔

انتظامی امور

16- تقسیم کے فیصلے کی حالت میں بہت سے امور فیصلہ طلب ہوں گے ان کی بابت باہمی گفت و شنید کا ایک اہتمام ضروری ہے جو ممکنہ عجلت کے ساتھ کیا جائے گا۔

الف۔ اس وقت مرکزی حکومت جن محکموں کی نگران ہے (مع امور دفاع' مالیات و مواصلات) ان کی بابت جانشین بااختیار جماعت کے نمائندوں کے مابین بات چیت ضروری ہوگی۔

ب۔ اختیارات کی منتقلی کے نتیجے میں معاہدات سے متعلق جو امور پیدا ہوں گے ان پر ملک معظم کی حکومت اور مختلف جانشین بااختیار جماعتوں کے نمائندوں کے درمیان گفت و شنید ہو گی۔

ج۔ جن صوبوں کی تقسیم ہوگی ان کے صوبائی محکموں کے انتظام کی بابت گفت و شنید مثلاً" اثاثہ اور واجب الادا مطالبوں کی تقسیم' نیز پولیس اور دوسری ملازمتوں کی تقسیم' ہائی کورٹوں اور صوبائی ادارہ جات وغیرہ کی تقسیم۔

شمال مغرب کے قبائل

17- شمال مغربی سرحدی صوبہ ہندوستان کے اہل قبائل سے وہی بااختیار جماعت تصفیہ کرے

گی جسے حکومت منتقل کی جائے گی اور اس کی جانشین ہو گی۔

دیسی ریاستیں

18- ملک معظم کی حکومت یہاں یہ صاف طور پر واضح کر دینا چاہتی ہے کہ اوپر جن فیصلوں کا اعلان کیا گیا ان کا تعلق صرف برطانوی ہند سے ہے۔ ہندوستان کی دیسی ریاستوں کی پالیسی بالکل وہی رہے گی جو کابینہ مشن کی یادداشت مورخہ 12 مئی 1940ء میں درج ہے۔

تیز رفتاری کی ضرورت

19- اس وجہ سے کہ حکومت کے جانشین بننے والی جماعتوں کو اپنے اختیارات سنبھالنے کے لئے کافی وقت مل جائے گا۔ یہ بڑا ضروری ہے کہ اوپر جو طریقہ ہائے عمل بتائے گئے ہیں ان پر جس قدر جلد ممکن ہو عمل کیا جائے۔ تاخیر سے بچنے کے لئے مختلف صوبے یا ان کے حصے ان منصوبوں کے مطابق اپنے طور پر کام شروع کر دیں گے۔ جس قدر عملاً" ایسا کرنا ممکن ہے۔ موجودہ آئین ساز اسمبلی اور نئی آئین ساز اسمبلی (اگر وہ وجود میں آتی ہے) اپنے اپنے علاقے کے لئے آئین بنانے کا کام شروع کر دیں گی۔ انہیں بلاشک اپنے قواعد خود مرتب کرنے کی آزادی ہو گی۔

اختیارات کی فوری منتقلی

20- ہندوستان کی بڑی سیاسی جماعتوں کی طرف سے بار بار اصرار کیا گیا ہے کہ جس قدر جلد ممکن ہو حکومت کی منتقلی کا کام مکمل کر دینا چاہئے۔ ملک معظم کی حکومت کو اس خواہش سے بڑی ہمدردی ہے۔ اس لئے تخمینہ یہ ہے کہ جون 1948ء تک یا شاید اس سے قبل ہندوستان میں ایک آزاد حکومت یا حکومتیں قائم کر دی جائیں گی۔ اور انہیں اختیارات منتقل کر دیئے جائیں گے۔ لہٰذا ملک معظم کی حکومت اس خواہش کے مطابق کسی طریقہ تیز رفتار اور عملی سمجھتی ہے کہ صوبہ ہذا کے تحت کئے جانے والے فیصلوں کے نتیجے میں موجودہ اسمبلی جاری اجلاس ہی میں ایک مسودہ قانون پیش کر دے جو منتقلی اختیارات کا فیصلہ کرے اور جس کی بنیاد حکومت درجہ نو آبادیات کی ہو۔ مگر یہ ان اختیارات کو متاثر نہ کرے گا کہ اس دوران میں

ہندوستانی اسمبلی چاہے اپنے علاقے کی طرف سے یہ بھی فیصلہ کر سکتی ہے کہ اس کا حصہ ہند' برطانوی' دولت متحدہ میں شامل ہو گا یا نہیں۔

گورنر جنرل کی طرف سے مزید اعلانات

21- اوپر جو طریقہ عمل طے کئے گئے ہیں ان کو بروئے کار لانے یا کسی طریقے کی بابت اگر کوئی ضرورت لاحق ہوئی تو گورنر جنرل وقتاً فوقتاً مزید اعلانات کرتے رہیں گے۔

ضمیمہ ر

پنجاب اور بنگال کے وہ اضلاع جن میں 1941ء کی مردم شماری کے مطابق مسلمانوں کی آبادی اکثریت میں ہے۔

1- پنجاب

قسمت لاہور

گوجرانوالہ' گورداسپور' لاہور' شیخوپورہ' اور سیالکوٹ

قسمت راولپنڈی

کیمبل پور' گجرات' جہلم' میانوالی' راولپنڈی اور شاہ پور

قسمت ملتان

ڈیرہ غازی خان' جھنگ' لائلپور' منٹگمری' ملتان اور مظفر گڑھ

2- بنگال

قسمت چاٹگام

چاٹگام' نواکھلی اور ٹپرا

قسمت ڈھاکہ

باقر گنج' ڈھاکہ' فرید پور اور میمن سنگھ

قسمت پریذیڈنسی

جیسور' مرشد آباد اور ندیا

قسمت راجشاہی

بوگرہ' دیناج پور' مالدہ' پنبہ' راج شاہی اور رنگ پور

بک سینٹر 32 حیدر روڈ راولپنڈی، پاکستان

☎ : 5565234